مدارس اسلامیہ کے، تعلیمات وانتظامات سے متعلق، تجربات اکابر کا نچوڑ
منظم مدارس
عالمیت
نظام عالمیت اور کتب عالمیت کی تدریس سے متعلق ایک جامع کتاب
جلد سوم
مرتبین
مفتی ابوبکر جابر قاسمی
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی
Faisal International

مُنَظّمِ مدارس

جلد سوم

(عالمیت)

مُرتبین

مفتی ابوبکر جابر قاسمی ۞ مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

پہلا ایڈیشن: ۱۴۳۹ھ = ۲۰۱۸ء

نام کتاب : منظم مدارس (عالمیت)

ترتیب : مفتی ابوبکر جابر قاسمی، 09885052592

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی، 09550081116

صفحات : 480

گرافکس تزئین: مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری، قبا گرافکس، حیدرآباد
فون: 09704172672, 8801198133

ناشر : دارالدعوہ والارشاد، یوسف گوڑہ، حیدرآباد

- مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد، فون: 23836868 - 040
- دکن ٹریڈرس، پانی کی ٹانکی، مغلپورہ، حیدرآباد، فون: 66710230 - 040
- مکتبہ کلیمیہ، یوسفین ویڈنگ مال، نامپلی، حیدرآباد

اجمالی فہرست

منظم مدارس

جلد اول

تعلیمات 23 - 231

انتظامات (27-185)

مالیات (334-187)

اجمالی فہرست

منظم مدارس

جلد سوم

تفصیلی فہرست

منظم مدارس

جلد سوم

تقریر وتحریر کے اہم اور ضروری عناصر

چند مثبت اور منفی پہلو

عربی مضمون نگاری کیسے سیکھیں؟

پہلی بات

اس کتاب کا مقصد صرف دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم کے طریقۂ تدریس اور نظام تعلیم سے متعلق تمام جزئیات کی تفہیم وتشریح کی طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے، جو کچھ ہے وہ صرف تقریبا منقولات، اقتباسات اور ملفوظات ہیں، ہندو پاک کے معروف وغیر معروف اکابر کے کے طویل تجربات ہیں، عمل ورواج میں نہ ہونے کی وجہ سے بعض پہلو نادر یا نئے محسوس ہونے لگے، مگر اپنی ذہنی کاوش وذاتی رائے کو پیش کرنے سے مکمل احتراز کیا گیا، جتنا جب ہمارے اکابر (علیہم الرحمۃ والرضوان) نے کیا ہے، وہی ہم سے ہوجائے تو بہت ہے، عصری تقاضوں کی رعایت انہوں نے کی اور کررہے کی ہمارے رابطہ اور مطالعہ کی ہے، کبھی ہم اپنے لگے بندھے رسومات سے بالاتر ہوکر سوچنا نہیں چاہتے، دینیات سے لے کر عالمیت تک، نظام انجمن سے لے کر تبلیغ وتزکیہ تک کوئی ایسا پہلو نہیں ہے کہ اسے سرسری لیا جائے، یا اس کی واقعی مطلوبہ حیثیت سے گرا کر سوتیلا پن برتا جائے، وقت اور وسائل کی قلت کا شکوہ لے کر سالہا سال، نسل درنسل اسے سرد خانہ میں ڈالا جائے، فراغت کے بعد زمانہ طالب علمی کی کمی کی تلافی کا موقعہ کسے ملتا ہے، فتنوں کی رفتار ہماری تیاری کا انتظار نہیں کرتی ہے، خارجی داخلی سرگرمیاں، درسی وغیر تدرسی کام، فنِ خطابت وخوشخطی کا اہتمام، اپنے مقصد پر مکمل توجہ مرکوز کرتے ہوئے دیگر زبانوں کو سیکھنا جس قدر عصری اسکولوں میں بڑھتا جارہا ہے، اتنا ہی اربابِ مدارس کی اس باب میں سرد مہری پائی جارہی ہے، یہ موجودہ معیار کی ناقدری نہیں مطلوبہ معیار اور خود احتسابی کی دعوت ہے، درس نظامی کا مقصود اہل السنۃ والجماعت کے ترجمان پیدا کرنا ہے۔

ہمیں سوچنا چاہئے کہ جن اکابر کے ہم نام لیوا ہیں ہم ان کے مزاج ومنہاج، تعداد

اوراستعداد میں ان کے ذوق کی کیا ہم رعایت کررہے ہیں، یہ بدترین طلبہ کوتختہ مشق تونہیں بنایا جارہاہے،کم ازکم افتتاحِ تعلیمی سال کے موقعہ پرتدریب المعلمین کا تربیتی کیمپ رکھا جائے، ماہرین سے استفادہ کیا جائے ، مدرس کا علمی قناعت میں ملوث ہونا طلبہ کی پرواز کو روکتا ہے، مقاصد سے چشم پوشی کئے بغیر وسائل وطرق میں تنوع یا خوب سے خوب تر کی تلاش؛ کوئی بدعت یا شجر ممنوعہ نہیں ہے، ہمیشہ تمام اکابر اس کے قائل اور عامل رہے ہیں، بعض فنون کی تدریس یا کچھ نظاموں (نظام خارجی مطالعہ، نظام انجمن وغیرہ) سے متعلق جو کچھ ذکر کیا گیا، وہ متعدد اکابر کے تجربات اور بہت سی جگہوں کا طریقہ کار ہے، رابطہ مدارس دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والے تجاویز مختلف فنون کی تدریس سے متعلق فقہ اکیڈمی انڈیا کے جمع کئے ہوئے مقالات، بعض کہنہ مشق ، مبصّر، صاحب رائے اکابر کی تحریریں بھی شاملِ کتاب ہیں، یہ حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، البتہ ان گذرے ہوئے مراحل کو سامنے رکھ کر اپنے اعتبار سے یا اس سے بہتر کوئی نہج تخلیق کرسکتے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا دیگر تعلیمی نظاموں سے موازنہ وتقابل ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس جمع وترتیب کا محرک یہ ہی رہا کہ جامعیت واعتدال میں مثالی نمونہ ہمارے اکابر کی توکم ازکم مکمل اتباع کی جائے ، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے اساتذہ وانتظامیہ اس گئے گذرے زمانہ میں بے حد مشقت سے کام کر رہے ہیں، ان کے مسائل وقربانیوں کا عام دنیادار تصور نہیں کرسکتا، لیکن انہیں وفاشعار، جفاکش، دردمند مدرسین کو چاہئے کہ اپنی قربانی وصول کریں، زیادہ سے زیادہ بافیض پراثر، دوررس اور دیرپا بنانے کی فکر کریں۔

واضح رہے کہ تادیب کے اصول، تبلیغ کا نظام، دینیات وناظرہ اور حفظ وانتظامات ومالیات کے مسائل کا گذشتہ دوجلدوں میں احاطہ کیا گیا، یہ تیسری جلد پیش خدمت ہے، پرودگار عالم قبول فرماکر ذخیرۂ آخرت بنائیں۔

ابوبکر جابر قاسمی

دارالدعوہ والارشاد، یوسف گوڑہ، حیدرآباد

پیر ۵/مارچ ۸۱۰۲- ۱۶ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ

نظام عالمیت شروع کرنے سے پہلے

☆ کیا نظام عالمیت کے لوازم (حسبِ ضرورت اساتذہ، کتب خانہ، انجمن) کیا موجود ہیں؟

☆ ہم اس طالب علم کو کسی ایسے قریبی مدرسہ کی طرف ہم نہیں بھیج سکتے، جہاں کہنہ مشق اساتذہ اور قدیم متحرک نظام ہے؟

☆ کیا طالب علم کا واجبی حق ادا کر پائیں یا صرف مدرسہ کی تشہیری مہم میں ایک شعبہ کا اضافہ کام آئے گا؟

☆ درس کا اجتماعی ماحول کیا ہم دے پائیں گے؟

☆ اگر ان سوالوں کے جوابات مثبت میں ہیں تو ہمیں شروع کرنا چاہیئے، ورنہ خُدارا! طلبہ کی عمروں سے ہرگز کھیلا نہ جائے۔

حصول علم کے آداب قرآن وسنت کی روشنی میں

علم دین کیوں حاصل کرے؟

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے علم اس لئے تلاش کیا کہ وہ اس علم کے ذریعہ علماء کے ساتھ دوڑ لگائے یا اس کے ذریعے بے وقوفوں سے مناظرہ کرے، یا اس کے ذریعہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جہنم میں داخل کرے گا:

"لیجاری به العلماء أو لیماری به السفهاء أو یصرف به وجوه الناس إلیه، أدخله الله النار" (۱)

اس حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم دین حاصل کرنے والوں کو تین غلطیوں سے روکا ہے کہ وہ علم دین اس لئے حاصل نہ کریں کہ:

۱۔ میں بڑے بڑے علماء کے ساتھ ریس (Race) لگاؤں گا۔

۲۔ بیوقوفوں کے ساتھ مناظرہ کروں گا۔

۳۔ عام لوگوں کی نگاہوں میں بلند مقام حاصل کروں گا۔

اس سوال کا جواب اگرچہ اس حدیث میں نہیں دیا گیا لیکن قرآن مجید اور دوسری احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علم دین کا اصل مقصد صرف دو چیزیں ہونی چاہئے:

۱) دین کو سمجھنا کہ مجھے دین کے احکام، اس کی حدود اچھی طرح سمجھ میں آجائیں؛ تاکہ عمل کرنا آسان ہو۔

(۱) ترمذی، باب ما جاء فیمن یطلب بعلمه الدنیا، حدیث نمبر: ۲۶۵۴

۲) میرا پروردگار مجھ سے راضی ہوجائے، قرآن مجید میں اس مقصد کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ" (۱) تاکہ انہیں دین کی سمجھ حاصل ہوجائے۔

اور ایک حدیث شریف میں یہ مقصد ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

من تعلم علما مما يبتغى به وجه الله ..... الحديث

جس نے وہ علم سیکھا جس سے اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے۔

قرآن اور حدیث کے ان دو حوالوں سے معلوم ہوا کہ علم دین حاصل کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مجھے دین سمجھ میں آجائے؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوسکے۔

بلکہ کئی اکابر نے طالب علمی کے زمانہ میں اس مقصد کو بھی پسند نہیں کیا کہ میں یہ علم حاصل کر کے آگے لوگوں کو سکھاؤں گا، کیوں کہ اس نیت میں مخلوق بھی بطور مقصود شامل ہوجاتی ہے، جو کامل اخلاص کے منافی ہے، علم دین تو صرف اور صرف اس لئے حاصل کرنا چاہئے کہ مجھے دین کی سمجھ آجائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوجائے باقی رہی لوگوں کو تبلیغ وتعلیم، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت، وعظ ونصیحت کی خدمت تو یہ علم کا مقصود اصلی نہیں ہے، بلکہ علم دین حاصل ہوجانے کے بعد ثانوی احکام ہیں جو علم دین حاصل کرنے کے بعد بوقت ضرورت اور بوقت حاجت عالم کے ذمہ آجاتے ہیں اور علم دین حاصل کرنے کے بعد وہ عالم محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ان سب کاموں تعلیم وتبلیغ، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت اور وعظ ونصیحت کو اپنے وقت پر بجالاتا ہے، واضح رہے کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں، لیکن یہ طالب علم کے مقاصد میں سے نہیں ہیں؛ بلکہ حصول علم کے بعد کی ذمہ داری اور اس کے نتائج وثمرات میں سے ہیں؛ لہٰذا طالب علم کو علم دین حاصل کرتے وقت تو صرف یہ نیت کرنی چاہئے کہ مجھے دین سمجھ میں آجائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرسکوں۔

۱۔ لیجاری به العلماء (تاکہ علماء کے ساتھ دوڑ لگائے)

(۱) سورۂ توبہ: ۱۲۲

اگر کوئی طالب علم دین اس نیت سے علم حاصل کرے کہ یہ علم حاصل کر کے میں بڑے بڑے علماء کے ہم پلہ ہوجاؤں گا؛ بلکہ ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کروں گا، جس میدان میں وہ کام کررہے ہیں، اس میدان میں ان سے آگے بڑھ جاؤں گا تو یہ سب نیتیں علم دین کے اصل مقصد کے خلاف ہیں اور ایسے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔

واضح رہے کہ کسی بڑے عالم دین کی خدمات کی قدر کرنا اور اس کی اچھی باتوں کی پیروی کرنا کوئی بری بات نہیں؛ بلکہ اچھی بات ہے، لیکن علم دین کا مقصد اس کی ذات کو قرار دے کر دینی منصب میں اس کے برابری کی خواہش کرنا یا دینی خدمات میں ان سے آگے بڑھنے کی خواہش کو علم دین کا مقصد بنانا غلط ہے؛ لہٰذا کسی عالم یا قابل قدر علماء سے ریس، ان کے ساتھ برابری کی نیت اور پھر ان سے آگے بڑھنے کی نیت رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

۲۔ أو ليماري به السفهاء: (یا علم دین کے ذریعے بے وقوفوں سے مناظرہ (جھگڑا) کرے)

اس دوسرے جملہ کی تشریح یہ ہے کہ بعض اوقات طالب علم کی نیت میں مخلوق کا مقصد منفی طور پر داخل ہوجاتا ہے، یعنی وہ اہل باطل، بے علم اور بے وقوف لوگوں سے مناظرہ، ان کے ساتھ مسلسل مخاصمت کو اپنے علم دین اور اپنی زندگی کا مقصود بنالیتے ہیں، یہ مقصد بھی غلط ہے، واضح رہے کہ اگر مخلوق انسان کے علم کا مقصود ہو خواہ جلبا (جیسے پہلے جملہ میں تھا) اور خواہ سلبا (جیسے دوسرے جملہ میں ہے) دونوں طرح غلط ہے، مخلوق کو علم دین کا مقصود بنانا وہ بنیادی غلطی ہے جس سے بچنا طلبہ کے لئے لازم ہے۔

اب یہ ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں میں مختلف طرح کے اہل باطل کا زور ہوتا ہے، ان کی شرارتوں، ناجائز حرکات وسکنات، ان کی خلافِ دین باتوں کو دیکھ کر اور سن کر ایک دیندار شخص قدرتی طور پر متنفر ہوتا ہے، اور تنفر طبعی بات بھی ہے، اور شریعت کے عین مطابق بھی، یہ بغض فی اللہ میں داخل ہے، جو أحب الأعمال إلى الله میں سے ہے (مشکوۃ) لیکن اس

طبعی اور شرعی نفرت کا بھی ایک حد میں رہنا بہت ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ نفرت اور تنفر ہی آدمی کی زندگی کا مقصود بن کر رہ جائے۔

اب اگر کوئی شخص کسی باطل فرقہ، باطل طبقہ یا باطل لوگوں سے نفرت ہی کو اپنا مقصود بنا لے اور قرآن وحدیث، اجماع اور قیاس پر مبنی علم دین اس لئے حاصل کرے کہ میں ان باطل لوگوں سے مناظرہ کروں گا اور ان کی مخالفت میں اپنی زندگی وقف کردوں گا تو بدیہی طور پر یہ ایک غلط طرزِ عمل ہوگا۔

قرآن وحدیث کا علم تو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کیلئے ہے، اپنی دنیا وآخرت کو درست کرنے کے لئے ہے اور جنت میں پہنچنے کے لئے ہے، چنانچہ اس عظیم علم کا مقصد گھٹیا لوگوں کی مخالفت کو بنالینا خود اس علم کی توہین ہے، یہ ٹھیک ہے کہ باطل طبقات اور باطل نظریات کی تردید بھی علم دین کا ایک حصہ ہے، لیکن یاد رہے کہ وہ ایک حصہ ہے، مقصود اصلی نہیں ہے، اسے مقصود اصلی بنالینا غلط ہے۔

۳۔ أو یصرف به وجوه الناس إلیه: (یا اس علم کے ذریعہ لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف پھیر لے)

حدیث شریف میں تیسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ جو شخص علم دین اس لئے حاصل کرے گا کہ میں لوگوں کے چہرے اپنی طرف پھیر دوں تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل کرے گا۔

اس تیسرے جملہ کا حاصل بھی یہ ہے کہ علم دین تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے اور اپنی دنیا وآخرت درست کرنے کے لئے حاصل کرنا چاہئے اب اگر کوئی شخص یہ علم دین اس لئے حاصل کرے گا کہ اسے مخلوق میں توجہ حاصل ہوجائے، لوگ اس کی عزت کریں، اسے معاشرے میں بلند مقام حاصل ہوجائے، وہ جہاں جائے لوگ اس کا استقبال کریں، اسے عزت کے ساتھ اونچے مقام پر بٹھایا جائے، لوگ اس کی باتیں غور سے سنیں، راہ چلتے لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھیں، اس کے ہاتھ چومے جائیں، اس کے جوتے سیدھے کئے جائیں جو کام وہ کسی کو کہہ دے تو لوگ اس کی فرمائش فوراً بجالائیں اسے ہدیہ

دینے کو لوگ اپنی سعادت سمجھیں وغیرہ وغیرہ تو یہ سب کچھ مخلوق پرستی ہے، خدا پرستی نہیں ہے، یہ مخلوق کو راضی کرنا ہے، خدا کو راضی کرنا نہیں، علم دین کا یہ حصول مخلوق کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہے، لہٰذا ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کر دے گا (أعاذنا الله من ذلك) جتنی خواہشات اوپر ذکر کی گئی ہیں ان سب کا خلاصہ دو چیزیں ہیں: حب مال اور حب جاہ، اور کسی بھی دیندار شخص، عالم یا بزرگ کے دین کو خراب کرنے والی بنیادی طور پر یہی دو چیزیں ہیں کہ انسان کو مال کی اور شہرت کی ایسی محبت ہو کہ وہ دینداری یا علم دین کو نعوذ باللہ مال اور شہرت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے تو اس میں اس کے دین کی بڑی تباہی ہے۔(۱)

رسول اللہ ﷺ کا طریقۂ تعلیم

☆ رسول اللہ ﷺ اپنے ان تمام حاضرین مجلس کو اس طرح تعلیم دیتے تھے کہ عالم، جاہل، شہری، بدوی عربی، عجمی، بوڑھے، بچے جوان پوری طرح فیض اٹھاتے تھے، اور آپ کی بات ہر ایک کے دل میں اتر جاتی تھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

"إنه كان إذا تكلم بكلمة أعادها ثلاثا حتى تفهم عنه، وإذا أتى على قوم فسلم عليهم ثلاثا" (۲)

جب آپ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار کہتے تھے، تاکہ سمجھ لی جائے، اور جب کسی جماعت کے پاس جاتے تو تین بار سلام کرتے۔

سوال وجواب اور افہام وتفہیم

حاضرین مجلس رسول اللہ ﷺ سے دینی امور کے متعلق دریافت کرتے اور آپ ﷺ اس کا جواب مرحمت فرماتے، حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ

---

(۱) طالب علم کیا نیت رکھے، حدیث پاک کی روشنی میں ۱۹، مولانا محمود اشرف عثمانی، ادارہ اسلامیات کراچی لاہور

(۲) بخاری کتاب العلم، باب من أعاد الحديث ثلاثا

سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بات آپ سے سنی ہے حضور ﷺ نے جواب دیا، جس کے بارے میں شک ہے: "إذا شك أحدكم في الأمر فليسئلني عنه" جب تم میں سے کوئی کسی بات میں شک کرے تو مجھ سے پوچھ لے۔

شاگردوں سے محبت اور ان کے ساتھ حسن سلوک

وصیت نبوی ﷺ کے مطابق حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے حلقہ نشینوں اور شاگردوں کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت اور ایثار وخلوص کا معاملہ کیا، ان کی دلداری ودل جوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد حمید الطویل کا بیان ہے کہ ہمارے ساتھ ثابت بن اسلم بنانی بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مجلس میں جاتے تھے، راستہ میں جو مسجد آتی ثابت اس میں جا کر نماز پڑھتے، جب ہم لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ جاتے تو کہتے:

"أين ثابت، إن ثابتا دويبة أحبها" ثابت کہاں رہ گیا، ثابت ایسا ننھا کیڑا ہے جس کو میں محبوب رکھتا ہوں۔

خود ثابت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ ہم کو دیکھ کر کہنے لگے:

"والله لأنتم أحب إلي من عدتكم من ولد أنس إلا من على مثل ما أنتم عليه" (۱)

خدا کی قسم تم لوگ مجھے انس کی اولاد سے زیادہ محبوب ہو، البتہ ان میں سے جو تم لوگوں کے طریقہ پر ہو۔

ابو العالیہ ریاحی نے غلامی کی حالت میں قرآن پڑھا اور لکھنا پڑھنا سیکھا اور کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ مجھے اپنے تخت پر بٹھاتے تھے، حالانکہ قریش کے اعیان واشراف نیچے بیٹھتے تھے اور کہتے تھے کہ یوں ہی علم عزت وشرافت عطا کرتا ہے، اور عالم کو بادشاہ کی طرح تخت پر بٹھاتا ہے۔ (۲)

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۷/ ۲۳۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۵۸

ابوحمزۃ نصر بن عمران ضبعی کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنی مجلس میں مجھے تخت پر بٹھاتے تھے اور کہتے تھے: تم میرے یہاں رہو، میں تمہارے لئے اپنے مال سے ایک حصہ مقرر کرتا ہوں۔(۱)

طلبہ کا باہمی مذاکرہ

حضرات صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ سے اٹھنے کے بعد آپس میں اسباق کا دور اور مذاکرہ اور مراجعہ کیا کرتے تھے، اور آپ اس کی تاکید و تشجیع فرماتے تھے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں منتہائے مہاجرین کی جماعت میں تھا، ہم لوگوں کو ایک قاری قرآن سنا رہا تھا، اسی حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر پوچھا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ ہم نے کہا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنه كان قاريا لنا يقرء علينا فكنا نستمع إلى كتاب الله" یا رسول اللہ! ہمارا ایک قاری قرآن پڑھ رہا تھا اور ہم کتاب اللہ کو سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگوں کو پیدا کیا ہے جن کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد آپ ہماری جماعت میں بیٹھ گئے اور ہم کو جنت کی بشارت دی۔(۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: بسا اوقات ہم ساٹھ ساٹھ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رہا کرتے تھے، آپ ہم سے حدیث بیان کرتے تھے، آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ہم لوگ آپس میں ان حدیثوں کا مذاکرہ و مراجعہ کیا کرتے تھے اور اس حال میں مجلس مذاکرہ سے اٹھتے تھے کہ گویا وہ حدیثیں ہمارے دلوں میں پودے کی طرح جڑ پکڑ گئی ہیں۔

اس لئے طلبہ کو مذاکرہ کرنا چاہئے اس سے بات ذہن نشین ہوتی ہے۔(۳)

---

(۱) الفقیہ والمتفقہ: ۲/۱۹۲، خیر القرون کی درسگاہیں: ۱۳۲

(۲) ابوداؤد

(۳) خیر القرون کی درسگاہیں: ۳۷، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم، دیوبند

طلبہ کا امتحان اور سند

رسول اللہ ﷺ طالب علموں کا امتحان بھی لیا کرتے تھے، امام بخاری نے ”باب طرح الإمام المسئلة علی أصحابه ليختبر ما عندهم من العلم“ کے ذیل میں بعض واقعات بیان کئے ہیں، آموختہ سننے کا مقصد طلبہ کی ہمت افزائی اور بعض باتوں کی تصحیح تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو سونے کے وقت کی یہ دعا بتائی:

” اللهم أسلمت وجهي إليك، وفوضت أمري إليك، وألجأت ظهري إليك، رغبة ورهبة إليك، لا ملجأ، ولا منجأ منك إلا إليك، آمنت بكتاب الذي أنزلت، وبنبيك الذي أرسلت“

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے سامنے یہ دعا اسطرح پڑھی ”ورسولک“ کہا تو آپ نے میرے سینے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ ”وبنبیک“ یہ دعا پڑھ کر جو شخص سوئے گا، اگر اسی رات اس کی موت آئی تو فطرت کی موت ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک لفظ کی تصحیح فرمائی حالانکہ دونوں لفظ ہم معنی معلوم ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسنون دعاؤں کے الفاظ میں فرق سے قبولیت میں فرق آجاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سورہ یوسف کی تلاوت کی تو آپ ﷺ نے ان کو داد دی اور فرمایا: ”أحسنت“ آپ ﷺ نے ایک سریہ میں چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا اور سب سے قرآن پڑھوا کر سنا، ان میں ایک نوجوان کو پوری سورہ بقرہ زبانی یاد تھی، آپ ﷺ نے اسی کو امیر سریہ مقرر فرمایا: ”قال اذهب فأنت أميرهم“ رسول اللہ ﷺ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی قرآن پڑھوا کر سنا کرتے تھے، اسی طرح حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی خوش الحانی سے محظوظ ہوتے تھے، درسگاہ نبوت کے فضلاء اور فارغین کو زبان رسالت سے سند وشہادت دی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے

دینی وعلمی رسوخ کی شہادت دیکر امت کو ان سے علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد ابوبکر وعمر کی اقتدا کرو اور قرآن ان چار سے پڑھو، عبداللہ بن مسعود، سالم بن مولی ابی حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم میری امت میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم ہیں جس شخص کو تر وتازہ قرآن پڑھنا پسند ہو، عبداللہ بن مسعود سے پڑھے، زید بن ثابت میری امت میں فرائض کے سب سے بڑے عالم ہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ قرآن کے بہترین ترجمان ہیں، ابوموسی اشعری کو آل داؤد کی شہنائی دی گئی۔(۱)

طلب علم میں حسن نیت

علم دین رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے، اس کی طلب میں اخلاص اور حسن نیت مطلوب ہے، اس کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا تھا، اور مجلس میں ہوا پرستوں اور فتنہ پردازوں پر خاص نظر رکھی جاتی تھی؛ تاکہ ان کے اثراتِ بد سے حلقہ نشین محفوظ رہیں اور وہ شیوخ واساتذہ کی طرف غلط باتیں منسوب نہ کرسکیں، حسن بصری ایسے ہوا پرست اور دنیا دار لوگوں کے بارے میں بہت حساس تھے، وہ کہتے تھے:

"إنه ليجالسنا فى حلقتنا هذه قوم ما يريدون به إلا الدنيا رحم الله عبدا لم يتقول علينا ما لم نقل" (۲)

ہمارے اس حلقہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے ساتھ بیٹھتے ہیں جن کا مقصد علم سے صرف طلب دنیا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جو ہماری طرف غلط بات کی نسبت نہ کرے۔

راس الاعتزال واصل بن عطا اور راہب المعتزلہ عمرو بن عبید بصری قدری دونوں حسن بصری کی مجلس سے اٹھ کر اسلامی عقائد وتصورات میں رخنہ انداز ہوئے شاید حسن بصریؒ نے یہ جملہ ان ہی کے متعلق فرمایا ہو۔

---

(۱) حوالہ سابق: ۳/۷۳-۷۴-۷۵

(۲) طبقات ابن سعد: ۷/۱۶۹

بعض مرتبہ مجالس درس میں ان فتنوں سے علمی و دینی وقار مجروح ہوتا تھا، اشعث بن عبدالملک کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مجلس میں ہمارے ساتھ بتی، سوّار، داؤد، اور عوف وغیرہ شریک درس تھے، اسی درمیان میں داؤد اور عوف میں قدر کی بحث چھڑ گئی، عوف قدر کے قائل تھے، بات بڑھ گئی، اور دونوں نے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا، میں نے اٹھ کر داؤد کو پکڑا اور سوار نے عوف کو قابو میں کیا اور ہم نے دونوں کو چھڑایا (۱) اور اس دور میں بعض لوگ علم دین کو ذریعہ عز و شرف سمجھ کر یا ادب و تفریح کے طور پر حاصل کرتے تھے، ان میں کسی قسم کا انحراف اور زیغ نہیں تھا، بلکہ حسنِ نیت میں فتور تھا، بعض لوگ ان پر نکیر کرتے تھے، مگر اساتذہ و شیوخ ان کو بڑی محبت و شفقت سے تعلیم دیتے تھے اور کہتے تھے کہ نیت کچھ بھی ہو علم دین میں آخر میں للّٰہیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کی مثال میں اپنے کو پیش کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سفیان ثوری نے کہا کہ میرے نزدیک رضائے الٰہی کا سب سے بہتر ذریعہ علم دین کا حصول ہے، اس پر ایک شخص نے کہا کہ یہ لوگ جو حدیث لکھ رہے ہیں، ان کی نیت رضائے الٰہی نہیں ہے، سفیان ثوری نے کہا: ”طلبهم له نية“ یعنی ان کا علم طلب کرنا ہی نیت ہے۔ (۲)

سماک بن حرب کی مجلس جاری تھی، درمیان میں کچھ طلبہ آئے تو اہل مجلس نے کہا کہ آپ ان لوگوں کو حدیث نہ پڑھائیں، دین میں ان کو رغبت نہیں ہے، یہ سن کر سماک بن حرب نے ان سے کہا کہ اچھی بات کہو، میں نے زمانۂ طالب علمی میں رضائے خداوندی کی نیت نہیں کی تھی، مگر جب علم حاصل کر لیا تو اس نے مجھے مفید باتوں کی ہدایت کی اور مضر باتوں سے روکا۔

مجاہد بن جبر کہتے ہیں کہ ہم نے علم حاصل کیا تو اس میں کچھ زیادہ حسن نیت نہیں تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس میں حسن نیت پیدا کر دیا۔

سفیان بن عیینہ کی مجلس میں ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ میں اللہ کا واسطہ دے کر آپ

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۷/ ۶۷۲

(۲) المحدث الفاضل: ۱۸۳

سے پوچھتا ہوں کہ جس زمانہ میں آپ نے علم حاصل کیا، اللہ کے لئے حاصل کیا تھا؟ اس نے تین مرتبہ یہی سوال کیا، آخر میں سفیان بن عیینہ نے کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ ہم نے ادب وظرافت کے طور پر علم حاصل کیا تھا، مگر اللہ نے اس کو اپنے لئے بنا دیا۔

سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہؒ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم کو معلوم ہو جائے کہ کوئی طالب علم صحیح نیت سے علم حاصل کرتا ہے تو ہم اس کے گھر جا کر تعلیم دیں گے، ہشام دستوائی اپنے شاگردوں کے صدق طلب اور حسن نیت کو دیکھ کر کہتے تھے:

"وددت أن الحديث ماء فاسقيكموه" (۱)

میں چاہتا ہوں کہ حدیث پانی بن جائے اور میں تم لوگوں کو پلا دوں۔

عکرمہؒ اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ مفلس ہو گئے ہو، مجھ سے علمی سوالات کیوں نہیں کرتے ہو؟

نوجوانوں میں علم دین کا ذوق

نوخیز ونوجوان طلبہ نہایت ذوق وشوق اور حسن نیت سے حضرات تابعین کی مجالس میں شریک ہوتے تھے، اور وہ ان کو بڑی محبت وشفقت سے تعلیم دیتے، ان کی ہمت افزائی کرتے اوران کی ضروریات پوری کرتے تھے، عقبہ بن ابو حکیم ہمدانی کا بیان ہے کہ ہم چند لڑکے عطاء بن ابی رباح کی مجلس میں تھے، انہوں نے ہم سے کہا کہ آ ؤ مجھ سے حدیث لکھو، تم میں سے جو اچھی طرح نہیں لکھ سکتا ہم اس کے لئے لکھ دیں گے، اور جس کے پاس کاغذ نہیں ہوگا ہم اس کو کاغذ دیں گے۔ (۲)

سعید بن مسیبؒ مکتب کے بچوں کو دیکھ کر کہتے تھے "هؤلاء الناس بعدنا" یہ ہمارے بعد یہی بچے بڑے ہو کر عالم ہوں گے۔ (۳)

---

(۱) المحدث الفاضل ۱۸۳

(۲) طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۴۱

(۳) طبقات ابن سعد: ۵/ ۳۷۳

حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کہ نوجوانوں کو ہمارے سامنے رکھو، ان کے دل فارغ ہیں جو سنتے ہیں یاد کرلیتے ہیں، ان میں سے اللہ جس کو چاہے گا علم دین دے گا، ابوبکر بن عیاشؒ کی مجلس سے گذرتے ہوئے ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ یہ بچے یہاں کیوں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا:

"هؤلاء الذين يحفظون عليك دينك"

یہ لوگ تمہارے دین کی حفاظت کریں گے۔

یہی جواب حماد بن سلمہ نے ایک شخص کو دیا تھا۔

امام ربیعۃ الرائے مدینہ کے اجواد واسخیاء میں سے تھے، انہوں نے اپنے اصحاب واخوان پر چالیس ہزار درہم خرچ کئے، مشہور محدث وفقیہ عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار تھی اور وہ یہ تمام رقم اصحابِ حدیث پر خرچ کرتے تھے، اسماعیل بن عیاش حمصی کے متعلق ابوخاطی یحی کا بیان ہے کہ میں ان سے بڑا آدمی کسی کو نہیں دیکھا، جب ہم لوگ ان کے یہاں جاتے تھے تو وہ ہم پر غالہ اور حلوہ پیش کرتے تھے، عبدالرحمن بن ابو لیلیٰؒ کے مکان میں قراء جمع ہوتے تھے، اور بغیر کھانا کھائے نہیں لوٹتے تھے، خلیفہ ولید بن عبد الملک نے اہل علم وفضل اور طلبہ ومعلمین کے لئے وظیفے جاری کئے، ابن ابوعیلہ کا بیان ہے کہ خلیفہ ولید مجھ کو چاندی کے ٹکڑے دیا کرتا تھا جن کو میں بیت المقدس کی مسجد کے قراء اور طلبہ میں تقسیم کیا کرتا تھا۔(۱)

طلبۂ علم کے اوصاف وآداب

علم دین کی تحصیل کے لئے عمر کی قید نہیں ہے، بلکہ طالب علم میں عقل وشعور اور حفظ وضبط ضروری تھا، البتہ عہد تابعین میں عام طور پر سن بلوغ کے بعد حدیث کی تعلیم دلائی جاتی تھی۔

(۱) خیر القرون کی درسگاہیں: ۲۴۵

امام مالکؒ اپنے طالب علمی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ میں علم (حدیث) لکھنے جاؤں گا، انہوں نے کہا کہ آؤ میں تم کو ثیاب العلماء (علماء کے کپڑے) پہنا دوں، پھر جاؤ حدیث لکھو، اس کے بعد مجھے اٹنگے کپڑے پہنائے، سر پر طویلہ (سیاہ لمبی ٹوپی) رکھی اور اس کے اوپر عمامہ باندھ کر کہا کہ "اذہب الآن فاکتب" (اب جاؤ، حدیث لکھو) اور ایک روایت میں ہے کہ والدہ نے کہا کہ: "اذہب إلی ربیعة فتعلّم من أدبه قبل علمه" (۱) ربیعہ رائے کے پاس جاؤ اور ان کے علم سے پہلے ان کا ادب سیکھو۔

سفیان بن عیینہؒ اپنی مجلس درس میں اپنے بچپن میں طالب علمی کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں سناتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جس وقت میں ابن شہاب زہریؒ کی مجلس میں گیا، میرے کان میں بالیاں اور سر پر چوٹیاں تھیں، زہری نے مجھے آتا ہوا دیکھ کر کہا "واسنیه واسنیه"، یہاں بیٹھو، یہاں بیٹھو، میں نے اس سے چھوٹا طالب علم نہیں دیکھا۔

نضر ہلالیؒ بیان کرتے ہیں کہ میں سفیان بن عیینہ کی مجلس میں تھا، ایک بچہ مجلس میں آیا، جس کو اہل مجلس حقارت سے دیکھنے لگے، سفیان بن عیینہؒ نے ان سے کہا کہ پہلے تم لوگ بھی ایسے ہی تھے، اللہ تعالی نے تم پر احسان کیا، اس کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"یا نضر لو رأیتنی ولی عشر سنین، طولی خمسة أشبار، ووجهی کالدینار، وأنا کشعلة النار، ثیابی صغار، وأکمامی قصار، وذیلی بمقدار، ونعلی کآذان الفار، اختلف إلی علماء الأمصار، مثل الزهری، وعمرو بن دینار، اجلس بینهم کالمسمار، محبرتی الجوزة، ومقلمتی کالموزة، وقلمی کاللوزة، فإذا دخلتُ المجلس قالوا أوسعوا للشیخ الصغیر" (۲)

(۱) المحدث الفاصل: ۲۰۱

(۲) الکفایہ فی علم الروایۃ: ۶۰-۶۱

''اے نضر! تم اس وقت مجھے دیکھتے تو تعجب کرتے جب میری عمر دس سال تھی، میرا طول پانچ بالشت تھا، میرا چہرہ دینار کی طرح اور میں خود شعلہ نار کی طرح تھا، میرے کپڑے چھوٹے، میری آستین چھوٹی، میرا دامن مناسب مقدار میں، میرا جوتا چوہے کے کان کی طرح اور میں مختلف شہروں کے علماء جیسے زہری اور عمرو بن دینار کے یہاں آتا جاتا تھا، اوران کے حلقہ نشینوں میں کیل کی طرح بیٹھتا تھا، میری دوات اخروٹ کی طرح، میرا قلمدان موزہ کی طرح، میرا قلم پستہ کی طرح ہوتا تھا، جب میں مجلس میں داخل ہوتا تو اہل مجلس کہتے کہ چھوٹے شیخ کے لئے جگہ خالی کردو''

ابن عیینہؒ یہ واقعہ بیان کرکے مسکرائے اور ہنسنے لگے ۔

تابعین کے دور میں عام طور پر بلوغ کے بعد حدیث کے سماع وتحمل کا رواج تھا، اس سے پہلے حفظ قرآن اور عبادات کا اہتمام ہوتا تھا۔۔۔۔۔اس زمانہ میں طلبہ سے کہا جاتا تھا کہ علم حاصل کرو اور علم کے لئے سکینہ اور وقار اور حلم وبردباری سیکھو، جس سے علم حاصل کرو، اس کے لئے متواضع بنو اور چاہئے کہ پڑھانے والا تم لوگوں کے لئے متواضع بنے۔

مسعر بن کدام نے ایک باحیثیت شخص کو دیکھا جس کے بدن پر بہترین کپڑے تھے، اس سے پوچھا کہ تم حدیث کے طالب علم ہو؟ اس نے کہا کہ: ہاں تو مسعر بن کدام نے کہا:

'' لو كنت من أصحاب الحديث كنت مقنعا وكانت نعلك مخصوفة'' اگر تم حدیث کے طلبہ میں ہوتے تو چہرہ چھپائے ہوتے اور تمہارے جوتے سلے ٹکے ہوتے''۔

یعنی تم طلب حدیث میں محنت کرتے، اس کے لئے سفر کرتے، اور اس طرح پہننے اوڑھنے کا اہتمام نہ کرتے، حفص بن غیاث کہتے ہیں کہ میں نے اعمش کے پاس جا کر کہا کہ

آپ مجھ سے حدیث بیان کریں، انھوں نے کہا: کیا تم نے قرآن یاد کرلیا ہے؟ میں نے کہا کہ: نہیں، تو کہا جاؤ پہلے قرآن یاد کرو، پھر میرے پاس آؤ، میں تم کو حدیث کی تعلیم دوں گا، ان کی بات سن کر میں چلا گیا، اور قرآن یاد کر کے آیا تو انھوں نے مجھ سے قرآن پڑھوایا، میں نے پڑھا، پھر حدیث کا درس دیا۔(۱)

(۱) المحدث الفاصل: ۲۰۱، خیر القرون کی درسگاہیں: ۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸

استاذ کے حقوق

✿ استاذ کی قدرو تعظیم کرے اوران کا احترام اورادب بجالائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ"(۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر ﷺ کو بھیجا جوان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتے اوران کو پاک کرتے اوران کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اس سے پتہ چلا کہ جو کسی کو تعلیم دے تو اس پر اس کا انعام ہے؛ لہٰذا اس کی قدر وتعظیم بجالانا چاہئے۔

✿ علم کا ادب یہ ہے کہ شاگرد پڑھنے کیلئے خود استاذ کے پاس جائے، استاذ جس بات کے پوچھنے سے منع کریں رک جائے، اگر غلطی سے استاذ کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوجائے تو معذرت کرے۔

یہ تمام آداب واحکام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتے ہیں:

" قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ

(۱) ال عمران: ۱۶۴

رُشْدًا"۔(۱)

- استاذ کے یہاں بلا اجازت نہ جائے۔

چونکہ ارشادِ خداوندی ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ"۔(۲)

مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، اور جب ہوتے ہیں رسول ﷺ کے ساتھ کسی اجتماعی بات پر تو نہیں جاتے جب تک کہ آپ ﷺ سے اجازت نہ لے لیں۔

- استاذ، شاگرد کو کسی کتاب کے پڑھنے سے منع کرے تو شاگرد کو اس کے مطالعہ سے رک جانا چاہئے۔

چونکہ حضور اکرم ﷺ نے ایک امیرِ لشکر کو حکم نامہ لکھ کر دیا اور (ایک مصلحت کے سبب) یہ فرمایا کہ جب تک فلاں مقام پر نہ جاؤ اس کو مت پڑھنا، چنانچہ اسی کے موافق عمل کیا:

"فلمّا بلغ ذلك المكان قرأهٗ على النّاس وأخبرهم بأمر النبی صلی الله علیه وسلم"۔(۳)

- شاگرد کے بے جا اور بے ڈھنگے اور بے جوڑ سوالات پر استاذ کو غصہ آجائے تو شاگرد اس کا تحمل کرے۔

زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے لقطہ (گری ہوئی چیز کے پانے) کا مسئلہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا سر بند اور ظرف (تھیلی وغیرہ) پہچان لے اور سال بھر تک اس کی تعریف کر (اعلان کیا کر) اگر کوئی

---

(۱) الکہف:۶

(۲) النور:۶۲

(۳) بخاری: باب مایذکر فی المناولۃ، حدیث: ۶۴

مالک نہ ملے (اور تو محتاج ہو تو اس سے نفع اٹھا ورنہ صدقہ کردے) پھر اگر اس کا مالک آوے تو اس کو دیدے، اس سائل نے کہا: گمشدہ اونٹ کا حکم کیا ہے؟ اس سوال سے آپ ﷺ پر غصّہ کے آثار نمایاں ہوئے؛ یہاں تک کہ رخسارِ مبارک سرخ ہو گئے، "فغضب حتّی احمرّت وجنتاه" آپ ﷺ نے فرمایا: تجھے اس سے کیا کام ہے؟ اس کیلئے اس کا مشک ہے اور اس کے موزے، پانی پر جاکر پانی پیتا ہے اور درختوں سے چارہ کھاتا ہے؛ یہاں تک کہ اس کا مالک اسے حاصل کرلے گا" ترد الماء، وتأكل الشجر، دعها حتى يجدها ربها"(۱)

۞ جس قدر ممکن ہو سکے استاذ کے ساتھ رہنے کی کوشش کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے کہ وہ اپنے پیٹ بھر غذا ملنے تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہمیشہ رہتے تھے، اس قدر اور لوگ حاضر نہ رہ سکتے تھے اور احادیث اس قدر یاد کرتے تھے اور لوگ یاد نہ کر سکتے تھے "ویحفظ ما لا یحفظون"(۲)

۞ استاذ کی تقریر کے وقت شاگردوں کو بالکل خاموش رہنا چاہیئے۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں خطبہ کے وقت حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لوگوں کو چپ کرو "استنصت الناس"(۳)

۞ اگر استاذ کسی بات پر ناراض ہوں تو ان کو خوش کرنا چاہئے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک نسخہ توراۃ کا جنابِ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ نسخہ توراۃ کا ہے، یہ سن کر آپ ﷺ خاموش رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پڑھنا شروع کیا اور جناب رسول اللہ ﷺ

---

(۱) بخاری: باب من عرف اللقطة ولم يدفعها، حدیث: ۲۴۳۸

(۲) بخاری: باب حفظ العلم، حدیث: ۱۱۸

(۳) بخاری: باب الانصات للعلماء، حدیث: ۱۲۱

کا چہرہ متغیر ہوا "وجعل يقرأ ووجه رسول الله يتغير" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عمر! روئیں تجھ پر رونے والیاں، رسول اللہ ﷺ کے رُخِ انور کو دیکھنا چاہئے۔(۱)

۞ اہلِ علم اور استاذ کے ساتھ ادب وتواضع کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں سکھانے والے عالم کا یہ حق ہے کہ تم اس سے سوال زیادہ نہ کرو اور جواب دینے کی مشقت میں نہ ڈالو یعنی اسے مجبور نہ کرو اور جب وہ تم سے منہ دوسری طرف پھیرے تو پھر اس پر اصرار نہ کرو اور جب وہ تھک جائے تو اس کے کپڑے نہ پکڑو اور نہ ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کرو اور نہ آنکھوں سے اور اس کی مجلس کا کچھ نہ پوچھو اور اس کی لغزشیں تلاش نہ کرو اور اگر اس سے کوئی لغزش ہو جائے تو رجوع کرنے کا انتظار کرو، اور جب وہ رجوع کرلے تو تم اسے قبول کرو اور یہ بھی نہ کہو کہ فلاں نے آپ کی بات کے خلاف بات کہی ہے اور اس کے کسی راز کا افشاء نہ کرو اور اس کے پاس کسی کی غیبت نہ کرو، اس کے سامنے اور اس کے پیٹھ پیچھے دونوں حالتوں میں اس کے حق کا خیال کرو اور تمام لوگوں کو سلام کرو؛ لیکن اسے خاص طور پر سلام کرو، اور اس کے سامنے بیٹھو اگر اسے کوئی ضرورت ہو تو دوسروں سے آگے بڑھ کر اس کی خدمت کرو "وان كانت له حاجة سبقت القوم الى خدمته" اور اس کے پاس جتنا بھی وقت گذرے تنگ دل نہ ہو؛ کیونکہ یہ عالم کھجور کے درخت کی طرح ہے جس سے ہر وقت کسی نہ کسی فائدے کے حاصل ہونے کا انتظار رہتا ہے اور یہ عالم اس روزہ دار کے درجہ میں ہے جو اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہو، جب ایسا عالم مر جاتا ہے تو اسلام میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے جو قیامت تک پر نہیں ہوسکتا اور آسمان کے ستر ہزار مقرب فرشتے طالب علم کے ساتھ (اکرام کیلئے) چلتے ہیں۔(۲)

۞ اسلاف اپنے اساتذہ کے ساتھ عزت واحترام کا اور تواضع کا معاملہ کرتے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ام ولد باندی حضرت جمیلہ کہتی ہیں کہ: جب حضرت

---

(۱) سنن الدارمی: مسند عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حدیث: ۴۴۹

(۲) کنز العمال: آداب العلم متفرقة، حدیث: ۲۹۵۲۰

ثابت بنانیؒ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اے لونڈیا! ذرا خوشبو لانا کہ میں اپنے ہاتھوں کو لگا لوں، یہ ثابتؒ کی ماں کا بیٹا یعنی خود حضرت ثابتؒ، جب تک میرے دونوں ہاتھوں کو چوم نہیں لے گا، اس وقت تک راضی نہیں ہوگا "فانّ ابن امّ ثابت لا یرضی حتی یقبل یدی"۔(۱) علایہ ثابت بنانی بصریؒ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں، استاذ کے احترام میں ان کے ہاتھوں کو چوم لیتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا؛ لیکن ان کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے ان سے دو سال تک نہ پوچھ سکا، یہاں تک کہ کسی سفر یا حج یا سفرِ عمرہ میں وہ کسی ضرورت کیلئے مر الظہر ان کی وادی میں اراک مقام پر اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے اور مجھے تنہائی کا موقع مل گیا تو میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں آپ سے دو سال سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں؛ لیکن صرف آپ کی ہیبت کی وجہ سے نہ پوچھ سکا، "انّی أرید أن أسئلك عن حدیث منك منذ سنتین ما استطیع هیبة لك"، انہوں نے فرمایا: جس بات کا مجھ سے پوچھنے کا ارادہ ہو تو فوراً پوچھ لیا کرو، اگر مجھے وہ بات معلوم ہو تو میں تمہیں بتا دوں گا، ورنہ کہوں گا، مجھے معلوم نہیں، پھر تم اس آدمی سے پوچھ لینا جو اسے جانتا ہو، میں نے کہا: وہ دو عورتیں کون ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۃ تحریم میں) فرمایا ہے کہ: وہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مددگار بنی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں۔(۲)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنے استاذ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کے دریافت میں ان کی تعظیم واحترام اور ان کا اجلال کرنا۔

---

(۱) علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے ان کے احوال لکھے ہوں۔ مجمع الزوائد: باب أدب الطالب: حدیث: ۵۴۵،

(۲) بخاری: سورۃ الطلاق، حدیث: ۴۶۲۹

❁ حضرت سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا: میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؛ لیکن آپ سے ڈر بھی لگتا ہے "انّی أرید أن أسئلك شیئًا وانّی أھابك"، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے بھتیجے! مجھ سے نہ ڈرو، جب تمہیں معلوم ہو کہ وہ چیز مجھے معلوم ہے تو تم مجھ سے ضرور پوچھو، میں نے عرض کیا جب غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ گئے تو ان سے کیا فرمایا تھا حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اے علی! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لئے ایسے ہو جاؤ جیسے کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے تھے "اما ترضی ان تکون منی بمنزلة ھارون من موسی"(۱)

❁ ہارون رشید ایک دفعہ کسائیؒ کے پاس گئے، کسائیؒ ان کو دیکھ نہیں رہے تھے، یہ ہارون رشید کے دونوں لڑکوں امین اور مامون کے استاذ تھے، کسائیؒ اپنے کسی کام سے جوتے پہننے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے، تو دونوں شہزادے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، اوران دونوں نے کسائی کے جوتوں کو ان کے پیروں کے سامنے لا رکھا، کچھ دیر بعد ہارون رشید اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اے کسائی! سب سے زیادہ باعزت خادم کس کے ہیں؟ تو کسائی نے کہا: امیر المؤمنین کے ہیں، ہارون رشید نے کہا: نہیں بلکہ کسائی کے ہیں، کیوں کہ ان کی خدمت امین اور مامون شہزادے کرتے ہیں "بل الکسائی یخدمه الأمین والمأمون"(۲)

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ، باب فی ھیبة المتعلم للعالم: ۱/ ۱۱۲
(۲) قصص العرب: ۱/ ۸۵

شاگرد کے حقوق

❁ استاذ اپنے شاگرد کے ساتھ نرمی اور اس کی استعداد اور صلاحیت کی رعایت کرے۔
ارشادِ باری عز وجل ہے:

" اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" (۱)

بلاؤ خدا کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کرو اچھے اور نرم طریقہ سے۔

❁ لوگوں کو نفع پہنچانا (جن میں شاگرد بھی داخل ہیں) علماء پر واجب ہے، جس کو اس آیت میں صیغۂ امر کے ذریعہ تعبیر کیا گیا ہے۔
اس لئے ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا معاملہ کیا جائے، ارشادِ خداوندی ہے

" كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (۲)

تم بہترین امت ہو لوگوں کی ہدایت کے واسطے پیدا کئے گئے ہو، اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

❁ شاگرد کے ساتھ گھٹیا اور نچلے درجہ کا سلوک کرنا مناسب نہیں اور نہ اپنے تعلیمی نفع کے ذریعہ اس پر احسان جتانا چاہئے، جو کہ ان کی تحقیر اور اذیت کا سبب ہوتا ہے، چونکہ طالب علم اور شاگرد کی حیثیت سائل (سوال کرنے والے) کی ہوتی ہے،

---

(۱) النحل:۱۵۲   (۲) آل عمران:۱۱۰

اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ" (۱) سائل کو مت جھڑکئے۔

اور ارشادِ باری عزوجل ہے:

"ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًى وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ" (ومما رزقنهم ينفقون من أنواع المعرفة يفيضون كما نقله البيضاوى) (۲)

صدقہ دے کر احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں اور جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی ہم نے جو انوارِ معرفت ان کو عطا کئے ہیں لوگوں پر ان کا فیضان کرتے ہیں)۔

❁ استاذ طالبِ علم کے ساتھ بھلائی اور حسنِ سلوک کا معاملہ کرے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اور لوگ تمہارے تابع ہیں اور تمہارے پاس دور دراز ملکوں سے لوگ علمِ دین سیکھنے اور سمجھنے کو آئیں گے اور ان کے بارے میں میری وصیت کے موافق بھلائی سے پیش آؤ

"وان رجالاً يأتونكم من أقطار الأرض يتفقّهون فى الدين فاذا اتو كم فاصتوصوا بهم خيرًا" (۳)

❁ استاذ چونکہ باپ کا درجہ رکھتا ہے؛ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شاگردوں کو وہی پیار و محبت دے جو ایک باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔

---

(۱) الضحیٰ: ۱۰ (۲) البقرۃ: ۲۶۲

(۳) ترمذی: باب ماجاء فی الاستیصاء بمن، حدیث: ۲۶۵۰، امام ترمذیؒ اس روایت کے ایک راوی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: شعبہ ابو ہارون العبدی کو ضعیف قرار دیتے ہیں، اور یحییٰ بن سعید نے کہا کہ کہ: ابن عون نے ابو ہارون العبدی سے ان کی موت تک روایتیں نقل کی ہیں اور ابو ہارون ان کا نام: عمارۃ بن جوین ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے طلبہ کی نسبت فرماتے تھے کہ اگر ان پر ایک مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔(۱)

سلف صالحینؒ کو اپنے شاگردوں سے ایسی محبت تھی کہ ان کی نجی دشواریوں کو بھی حل کرتے تھے، امام شافعیؒ بڑے اعلیٰ درجہ کے فقیہ ومحدث ہیں، یہ حصولِ علم کیلئے مدینہ پہنچے، غریب آدمی تھے، امام مالکؒ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو خود اپنا مہمان بنایا اور جب تک مدینہ میں رہے ان کی کفالت کرتے رہے، پھر جب امامِ شافعیؒ نے مزید کسبِ علم کیلئے کوفہ کا سفر کیا تو سواری کا بھی نظم کیا، اور اخراجاتِ سفر بھی، اور شہر سے باہر آکر نہایت محبت سے آپ کو رخصت کیا، امام شافعیؒ کوفہ آئے تو امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ رشید امام محمدؒ نے امام شافعیؒ کی کفالت فرمائی، اور بھرپور تعاون فرمایا، امام شافعیؒ اس حال میں کوفہ پہنچے کہ نہایت ہی معمولی کپڑا آپ کے جسم پر تھا، امام محمدؒ نے اسی وقت ایک جوڑے کا انتظام فرمایا، جو ایک ہزار درہم قیمت کا تھا، پھر امامِ شافعیؒ کو رخصت کیا تو اپنی پوری نقدی جمع کرکے تین ہزار انہیں حوالہ کئے۔(۲)

❁ استاذ کسی مقام پر غلط تقریر یا کسی بات پر عدم واقفیت کے باوجود غلط مسئلہ نہ بتائے، بلکہ اپنی لاعلمی یا اس مقام کے مطالعہ کے بعد حل بتانے کو کہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹا ہے: ”من حدّث عنّی بحدیث یری أنّہ کذب فھو أحد الکاذبین“(۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی سائل کو کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتادیا تو اس کا وبال اس بتانے والے پر ہے اور جس شخص نے اپنے بھائی

(۱) تذکرۃ السامع: ۴۹

(۲) جامع بیان العلم لابن عبدالبر: ۲۶۸

(۳) مسلم: باب وجوب الروایۃ عن الثقات، حدیث: ۱

کو مشورہ دیا اور وہ جانتا ہے کہ وہ مشورہ ٹھیک نہیں ہے تو اس نے اس کی خیانت کی: "من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من أفتاہ" (۱)

❁ اگر کوئی بات نہ معلوم ہو تو کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں، اپنی طرف سے کچھ نہ کہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اے لوگو! جو شخص کسی بات کا علم رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ بتادے اور جو نہ جانتا ہو اس کو چاہئے کہ کہہ دے: اللہ جاننے والا ہے؛ کیونکہ یہ کہہ دینا بھی علم کی بات ہے: "یا أیّھا الناس! من علم منکم شیئًا فلیقل بہ و من لم یعلم فلیقل اللّٰہ أعلم فانّ من العلم أن یقول لما لا یعلم "اللّٰہ أعلم" (۲) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ" (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دو کہ میں تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ کہہ دوں۔

حضرت نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ لوگ یہ سمجھے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا سوال ہی نہیں سنا، اس لئے اس آدمی نے کہا: اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا آپ نے میرا سوال نہیں سنا، انہوں نے فرمایا: سنا ہے، لیکن شاید آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ لوگ ہم سے جو کچھ پوچھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سے اس کے بارے میں باز پرس نہیں کرے گا، اللہ تم پر رحم کرے، ہمیں ذرا مہلت دو؛ تاکہ ہم تمہارے سوال کے بارے میں سوچ لیں، اگر ہمیں اس کا جواب سمجھ میں آئے تو بتادیں گے اور اگر نہ آیا تو تمہیں بتادیں گے کہ ہمیں نہیں معلوم:

" اترکنا -یرحمك الله- حتی نتفھّم فی مسألتك، فان کان

---

(۱) ابوداؤد: باب التوقی فی الفتیا، حدیث: ۳۶۵۷، حاکم نے اس کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے اور علامہ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

(۲) صحیح مسلم: باب الدخان، حدیث: ۲۷۹۸

لها جواب عندنا والاّ أعلمناك أنّه لا علم لنا بها "(۱)

حضرت یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی عالم "میں نہیں جانتا" کہنا چھوڑ دیتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ اپنی ہلاکت کی جگہ پہنچ گیا "اذا ترك العالم "لا أعلم" فقد أصيبت مقالته "(۲)

❁ درس وتقریر میں طلباء کے نشاط وشوق کی بھی رعایت کی جائے۔

حضرت شقیقؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے، کسی شخص نے عرض کیا کہ: حضرت روزانہ وعظ کیجئے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے روزانہ وعظ کہنے سے یہ چیز مانع بن رہی ہے کہ میں تم کو اکتاہٹ میں ڈالنا نہیں چاہتا "أنّه يمنعني من ذلك أنّي أكره أن أملّكم "اور میں تمہاری خبر گیری اورنگہداشت ایسی ہی کرتا ہوں جیسی رسول اللہ ﷺ ہماری خبر گیری فرمایا کرتے تھے کہ ہم ملول نہ ہوں۔(۳)

❁ جو اساتذہ طلبہ کو حد سے زیادہ پڑھاتے ہیں یا زیادہ کتابیں پڑھاتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم طلبہ پر خوب محنت کر رہے ہیں، ان کی محنت رائیگاں جانے کی مثال یوں ہے:

"اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا "(۴)

یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کرائی محنت سب کی سب گئی گذری ہوئی اور (وہ بوجہِ جہل) اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

اس لئے ہفتہ میں کم از کم ایک روز کی تعطیل ہونی چاہیے۔

❁ نا اہلوں کو دینی خدمات اور درس وتدریس کی ذمہ داری سونپنا قیامت کی علامت

---

(۱) الطبقات الکبریٰ لابن سعد: عبد الله بن عمر بن الخطاب: ۹۱۶۸/۴

(۲) حلية الأولياء: سفيان بن عيينة: ۲۷۴/۷

(۳) بخاری: باب من جعل لأهل العلم، حدیث: ۷۰

(۴) الكهف: ۱۰۴

ہے (جس میں متعلقہ مضمون کے بارے میں استاذ کی استعداد اور صلاحیت کا لحاظ کرنا بھی داخل ہے)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دینی خدمات نالائق اور نااہلوں کے سپرد ہو جائیں تو قیامت کا انتظار کرو "اذا وسّد الأمر الی غیر أھلہ فانتظروا الساعة" (۱)

❁ شاگرد کے اخلاقی احوال کی خبر گیری بھی استاذ کی ذمہ داری ہے، صرف علم کا پہنچانا ہی کافی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کسی سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے، آپ ﷺ ہم سے ایسے وقت آ کر ملے کہ نماز کا وقت آ گیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے، جلدی کی وجہ سے ہم نے پاؤں دھونے میں جلدی کی، جس کی وجہ سے کچھ حصہ سوکھا رہ گیا، آپ ﷺ نے دیکھ کر دو تین بار بآوازِ بلند فرمایا: خبردار ہو جاؤ، عذابِ دوزخ ان ایڑیوں کیلئے ہے جو سوکھی رہ جاویں "ویل للاعقاب من النار" آپ ﷺ نے یہ بات دو یا تین بار کہی۔ (۲)

❁ اس روایت سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگر یہ امکان ہو کہ اگر بآواز بلند تقریر نہ کی جائے تو استاذ کی آواز شاگردوں کے پاس نہ پہنچے گی تو بلند آواز میں تقریر کرنا بھی شاگرد کا حق ہے۔

❁ اور یہ بھی پتہ چلا کہ ایک بار تقریر کرنے سے طلباء نے نہ سمجھا ہو تو دوسری، تیسری بار بھی تقریر کر دینا مناسب ہے، جس طرح حضور ﷺ نے دو تین بار فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ کوئی مہتم بالشان بات فرماتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے؛ تاکہ لوگ خوب سمجھ لیں۔ (۳)

---

(۱) بخاری: باب من سئل علما وھو مشتغل فی حدیثہ، فاتم الحدیث ثمّ أجاب السائل، حدیث:۵۹

(۲) بخاری: باب من رفع صوتہ بالعلم، حدیث:۶۰

(۳) بخاری: باب من أعاد الحدیث: حدیث:۹۵

❁ استاذ کبھی کبھی شاگردوں کا امتحان لے۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: ایک ایسا درخت ہے کہ وہ پت جھڑ نہیں ہوتا اور مثلِ مسلم کے ہے، بتاؤ وہ کیا ہے؟، سب لوگ جنگل کے درختوں کو سوچنے لگے کہ کون سا درخت اس شان کا ہے، میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے، مگر چونکہ میں چھوٹا تھا؛ اس لئے میں نے حیاء کی اور چپ رہا، پھر لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد فرمایئے کہ کون سا درخت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کھجور کا درخت "فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ھی النخلة" (۲)

❁ کوئی فن یا کوئی کتاب کسی خاص طالبِ علم کیلئے مضر اور نقصان دہ ہو تو اسے اس سے روکنا چاہئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: جو شخص میرے خدا سے اس حال میں ملے، اور وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ سمجھتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں؟ فرمایا کہ: مت سناؤ، کیونکہ میں خوف کرتا ہوں کہ اس پر تکیہ کرلیں گے "لا، انّی أخاف أن یتّکلوا" (۲)

❁ شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہئے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دینی امور میں لوگوں پر آسانی کرو، تکلیف میں مت ڈالو، خوش خبری سناؤ، دین سے نفرت مت دلاؤ، "یسّروا ولا تعسّروا وبشّروا ولا تنفّروا" (۳)

آپریشن تھیٹر میں جانے والا ڈاکٹر اگر غصہ میں ہو تو اس کا آپریشن ناکام ہوتا ہے،

---

(۱) بخاری: باب الفھم فی العلم، حدیث: ۷۲

(۲) بخاری: باب من خص بالعلم قوما، حدیث: ۱۲۹

(۳) بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "یسروا ولا تعسروا" حدیث: ۵۷۷۴

اسی طریقہ سے درسگاہ میں جانے والا استاذ اگر غصہ میں ہو تو وہ ناکام استاذ ہوتا ہے۔

❁ شاگرد کیلئے اللہ عزوجل سے علمِ نافع کی دعا بھی کرنا چاہئے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینہ سے لگایا اور یوں فرمایا کہ: یا اللہ! اس کو قرآن کا علم عطا فرمادے "اللھمّ علمہ الکتاب"۔(۱)

❁ اگر کوئی بات شاگرد کیلئے غصہ کی صورت میں کہنا بہتر ہو تو اس طرح کہے۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فلاں شخص کے نماز کو طویل کرنے کی وجہ سے قریب ہے کہ میں نہ پاسکوں (یعنی بددل ہوکر جماعت چھوڑ دوں) تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غصہ ہوگئے کہ ایسا کبھی غصہ ہوتے ہوئے میں نے آپ کو نہیں دیکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام سے فرمایا کہ: تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو، جو آدمی نماز میں امامت کرے اس کو چاہئے کہ (قراءت) میں تخفیف کرے؛ کیونکہ مریض اور ضعیف اور حاجت مند سب قسم کے لوگ نماز میں ہوتے ہیں "فمن صلی بالنّاس فلیُخفّف فانّ فیھم المریض والضعیف وذا الحاجۃ"۔(۲)

❁ اگر مناسب سمجھے تو تقسیمِ اوقات اور جماعت بندی کی جاسکتی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عورتوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم پر مرد غالب آگئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ سننے کا موقع ہم کو نہیں ملتا، ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے وعظ و نصیحت اور احکامِ الٰہی سنانے کا ایک دن مقرر فرمایا: "فوعدھنّ یومًا ولقیھنّ فیہ فوعظھنّ وأمرھنّ"۔(۳)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ اگر کسی طالبِ علم پر کسی بے جا سوال پر غصہ آجائے اور اس کے بعد پھر وہ کوئی معقول سوال کرے تو اس کے جواب میں پہلے غصہ کا اثر نہ آنا چاہئے۔

---

(۱) بخاری: باب الاعتصام بالکتاب، حدیث: ۶۸۴۲

(۲) بخاری: باب تخفیف الامام فی القیام واتمام الرکوع والسجود، حدیث: ۶۷۰

(۳) بخاری: باب ھل یجعل للنساء یوم علی حدہ فی العلم، حدیث: ۱۰۱

❁ اگر طالب علم کو واقعتا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا استاذ کی تقریر میں کوئی شبہ رہ جائے تو اس کے دوبارہ پوچھنے پر ناراض نہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں سنتی تھیں کہ جوان کو معلوم نہ ہوں تو برابر جنابِ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کرتی تھیں، یہاں تک کہ سمجھ لیتی تھیں، ایک مرتبہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص حساب میں گرفتار ہوا وہ عذاب میں مبتلا ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ: اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ: حساب آسان کیا جائے گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: یہ پیشی ہے، ورنہ جس سے مناقشہ کیا گیا حساب میں تو وہ ہلاک ہوگیا "ولکن من نوقش الحساب یھلك"۔ (۱)

❁ اگر طالبِ علم تواضع کے ساتھ واقعتاً استاذ کی تقریر کا باحوالہ رد کرے تو اسے قبول کر لینا چاہئے:

حضرت عبد اللہ بن مصعبؒ کہتے ہیں کہ: ایک دفعہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ (ایک اوقیہ چالیس درھم کا ہوتا ہے) سے زیادہ مقرر نہ کرو، چاہے ذی الغصہ قیس بن حسین حارثی (جیسے سردار) کی بیٹی کیوں نہ ہو جو اس سے زیادہ مہر مقرر کرے گا میں وہ زائد رقم لے کر بیت المال میں جمع کر دوں گا، اس پر عورتوں کی صف میں سے ایک عورت کھڑی ہوئی جس کا قد لمبا تھا اور ناک چپکی ہوئی تھی اور اس نے کہا: آپ کو ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیوں؟ عورت نے کہا: کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " وَاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـئًا "۔ (۲) اور تم اس کو انبار کا انبار دے چکے ہو تو تب بھی تم اس میں سے کچھ بھی مت لو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: عورت نے ٹھیک کہا، مرد نے غلطی کی "امرأة اصابت ورجل اخطأ"۔ (۳)

---

(۱) بخاری: باب من سمع شیئا راجعه، حدیث: ۱۰۳

(۲) النساء: ۲۰

(۳) کنز العمال: الصداق، حدیث: ۴۵۸۰۰۰

۞ استاد کو چاہئے کہ جس چیز کی عملی تعلیم دینا چاہتا ہو بذاتِ خود اس پر عمل پیرا ہو کر عملی انداز میں تعلیم دے، جب حضور ﷺ کسی چیز کا حکم فرماتے تو پہلے خود آپ ﷺ اس پر عمل پیرا ہوتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو عملی شکل میں وہ عمل اس طرح سمجھاتے کہ ان کے ذہن نشین ہو جاتا۔

حضرت شعیب رضی اللہ عنہ کے بیٹے عمرو رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا، اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! وضو کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ایک برتن میں پانی منگوایا، پہلے آپ ﷺ نے تین مرتبہ ہاتھ دھویا، پھر تین مرتبہ چہرہ دھویا، پھر تین مرتبہ کہنیوں تک ہاتھ دھوئے، اس کے بعد سر کا مسح کیا اور دونوں ہاتھوں کی شہادت والی انگلیوں کو کانوں کے سوراخ میں ڈالا اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے کانوں کے اوپری حصہ پر مسح کیا اور شہادت والی انگلیوں سے کان کے اندرونی حصہ پر مسح کیا، پھر تین مرتبہ دونوں پاؤں دھوئے اور فرمایا یہ مکمل وضو ہے "ثم قال ھکذا الوضوء" پس جو کوئی اس پر زیادتی کرے گا تو یقیناً اس نے برا کیا اور اپنے اوپر ظلم کیا یا (یہ فرمایا کہ) اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور برا کیا۔(۱)

حضرت عبادہ بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ہم حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، وہ اپنی مسجد میں تھے، انہوں نے کہا کہ: رسول اللہ ﷺ ہماری اس مسجد میں تشریف لائے اس حال میں کہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ابن طاب نامی کھجور کی ایک شاخ تھی آپ ﷺ نے مسجد میں قبلہ کی طرف بلغم لگا ہوا دیکھا، آپ ﷺ ادھر گئے اور اس کو کھجور کی شاخ سے کھرچ دیا "فحکھا بالعرجون" اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم میں سے کون یہ بات پسند کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے منہ پھیر لے؟ پھر فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ اس کے سامنے ہوتا ہے؛ اس لیے سامنے کی طرف

---

(۱) ابوداؤد: باب الوضوء ثلاثا ثلاثا، حدیث: ۱۳۵، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ: اس کی سند حسن درجہ کی ہے: خلاصۃ الاحکام: فصل فی ضعیفہ، حدیث: ۲۰۹، موسسۃ الرسالۃ، لبنان

نہ تھوکے اور نہ داہنی طرف تھوکے؛ بلکہ بائیں جانب بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے، اگر جلدی ہوتو اپنے کپڑے میں لے کر یوں مسل دے، پھر آپ ﷺ نے کپڑے کو منہ پر رکھا اور اس کو مل دیا، اس کے بعد فرمایا: عبیر قبیلہ کا ایک جوان اٹھا اور دوڑتا ہوا اپنے گھر گیا اور اپنی ہتھیلی میں خوشبو لے کر آیا، آپ ﷺ نے وہ خوشبو اس سے لے کر کھجور کی لکڑی کے سرے پر لگائی اور جہاں بلغم لگا تھا وہاں مل دیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: اسی بنا پر تم اپنی مسجدوں میں خوشبو لگایا کرتے ہو۔(۱)

- استاذ کو چاہئے کہ تعلیم دینے میں تدریجی نہج اختیار کرے، ترتیب قائم رکھے، تھوڑا تھوڑا سبق آگے بڑھائے، حضور اکرم ﷺ کا معمول بھی اس حوالہ سے یہی تھا۔

ایک صحابی ﷺ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ سے دس دس آیات پڑھتے تھے اور اگلی دس آیات اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے جب تک کہ پہلی دس آیات میں علم وعمل سے متعلق چیزیں اچھی طرح سیکھ نہ لیتے یوں ہم نے علم وعمل کو حاصل کیا ہے، "ما فی ہذہ من العلم والعمل"(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے جب انہیں یمن کی طرف بھیجنے لگے، ان سے فرمایا کہ: تم ایسی قوم کے پاس چلے جاتے ہو، جو اہل کتاب ہیں جب ان کے پاس پہنچو تو انہیں دعوت دو کہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اگر وہ مان لیں تو انہیں یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور وہ ان کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی، اگر وہ اس کو بھی منظور کر لیں تو ان کے اچھے مال لینے سے بچو اور مظلوموں کی بددعا سے بچو؛ اس لیے کہ مظلوم کی

(۱) مسلم: باب حدیث جابر الطویل وقصة أبی الیسیر، حدیث: ۷۷۰۵

(۲) مسند احمد: حدیث رجل من أصحاب النبیصلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۲۳۵۲۹، محقق شعیب الارناؤوط کہتے ہیں کہ: اس کی سند عطا کی وجہ سے حسن درجہ کی ہے۔

بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے "اتق دعوة المظلوم، فإنه ليس بينه وبين الله حجاب"(۱)

- متعلّمین اور شاگردوں کی انفرادی خصوصیات کی رعایت کرے، یعنی ہر شخص کو اس کے مطابق اور اس کے مقتضاء حال اس کی تربیت کرے، حضور ﷺ کا بھی اس حوالے سے یہی معمول تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ (ایک مرتبہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے سوار تھے، حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: اے معاذ (بن جبل)! انہوں نے عرض کیا لبيك يا رسول الله وسعديك آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے معاذ انہوں نے عرض کیا: "لبيك يا رسول الله وسعديك" تین مرتبہ (ایسا ہی ہوا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جو کوئی اپنے سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں ،اللہ اس پر (دوزخ کی) آگ حرام کر دیتا ہے، حضرت معاذ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر کر دوں؟ تا کہ وہ خوش ہو جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اس وقت جب کہ تم خبر کر دو گے لوگ (اسی پر) بھروسہ کر لیں گے اور عمل سے باز رہیں گے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث اپنی موت کے وقت اس خوف سے بیان کر دی کہ کہیں (حدیث کے چھپانے پر ان سے) مواخذہ نہ ہو جائے "وأخبر بها معاذ عند موته تأثما"(۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ایک نوجوان آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! روزے کی حالت میں میں اپنی بیوی کو بوسہ دے سکتا ہوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں تھوڑی دیر بعد ایک بڑی عمر کا آدمی آیا اور اس نے بھی وہی سوال پوچھا، نبی کریم ﷺ نے اسے اجازت دے دی، اس پر ہم لوگ ایک

---

(۱) بخاری: باب الإتقاء والحذر من دعوة المظلوم، حدیث: ۲۳۱۶

(۲) بخاری: باب من خص بالعلم قوما، حدیث: ۱۲۸

دوسرے کو دیکھنے لگے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دوسرے کو کیوں دیکھ رہے ہو؟ دراصل عمر رسیدہ آدمی اپنے اوپر قابو رکھ سکتا ہے، "إن الشیخ یملك نفسه" (۱)

❁ استاذ کو چاہئے کہ گفتگو اور سوالات کے ذریعہ مسئلہ کی حقیقت کو سمجھائے، یہ طریقہ کار نفسِ مسئلہ کے سمجھنے میں معین و مددگار ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تمہارا خیال ہے کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر کوئی نہر ہو، اور وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو، کیا اس کے بدن پر کوئی میل کچیل باقی رہے گا "هل یبقی من درنه شيء" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: اس پر سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نمازوں کے ذریعہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ "هل تدرون من المفلس" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تو مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس کوئی روپیہ پیسہ اور ساز وسامان نہ ہو، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ آدمی ہوگا جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوۃ لے کر آئے گا؛ لیکن کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، اسے بٹھا لیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کی نیکیاں دے کر ان کا بدلہ دلوایا جائے گا، اگر اس کے گناہوں کا فیصلہ مکمل ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں، تو حقداروں کے گناہ لے کر

---

(۱) مجمع الزوائد: باب القبلة والمباشرة للصائم، حدیث: ۴۹۶۲، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ابن لہیعہ ہے اور ان کی حدیث حسن درجہ کی ہے اور اس میں کلام ہے۔

(۲) بخاری: باب الصلوات الخمس کفارة، حدیث: ۵۲۸

اس پر لاد دیئے جائیں گے پھر اسے جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔(۱)

طریقہ تعلیم میں گفتگو کے انداز کی سب سے بہترین اور مشہور مثال ''حدیث جبرئیل علیہ السلام'' ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس دوران ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت سفید تھے، اس کے بال بہت سیاہ رنگ کے تھے، معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ سفر سے آیا ہے، اور ہم میں سے کوئی شخص ان کو نہیں پہچانتا تھا، وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا، اپنے گھٹنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے لگا کر اور اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے (یعنی ادب سے بیٹھا جس طریقہ سے کہ کسی استاذ کے سامنے کوئی شاگرد بیٹھتا ہے) پھر وہ کہنے لگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! بتلایئے کہ اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اس بات کی گواہی دینا کہ عبادت کے کوئی لائق نہیں ہے علاوہ خداوندِ قدوس کے اور بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور نماز پڑھنا زکوۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا خانہ کعبہ کا حج کرنا اگر طاقت ہو (یعنی حج کیلئے آنے جانے اور دیگر شرائط شرعی حج کی پائی جائیں) اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا، ہم کو حیرت ہوئی کہ خود ہی سوال کرتا ہے، پھر کہتا ہے کہ آپ نے سچ فرمایا، پھر کہا بتلایئے کہ ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یقین کرنا خداوند قدوس پر یعنی اس کی ذات اور صفات میں اور اس کے فرشتوں پر کہ وہ اس کے پاک بندے ہیں، جیسا خداوندِ قدوس کا حکم ہوتا ہے بجالاتے ہیں ان میں بڑی طاقت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور اس کی کتابوں پر (جیسے قرآنِ کریم تورات انجیل زبور پر اور اس کے صحیفوں پر) جو کہ خداوندِ قدوس نے اپنے رسولوں پر نازل فرمائے، وہ سب حق ہیں، خداوند قدوس کی طرف سے ہیں، خداوندِ قدوس کے کلام میں اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر (کہ خیر اور شر سب کچھ خداوندِ قدوس کی جانب سے ہے یعنی اچھے اور برے سب کام پیدا کرنے والا خداوندِ قدوس ہے اس کو خوب معلوم تھا کہ یہ شخص برا ہوگا یہ اچھا ہوگا) اس کے حکم کے بغیر

(۱) مسلم: باب تحریم الظلم، حدیث: ۲۷۴۴

اوراس کے ارادے کے بغیر انجام نہیں پاتے؛ لیکن وہ اچھے لوگوں سے خوش ہوتا ہے اور برے لوگوں سے ناراض ہوتا ہے اوراس نے ہم کو اختیار عطا فرمایا ہے، یہ سن کراس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا، پھراس نے کہا کہ: بتلایئے کہ احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: خداوند ِقدوس کی عبادت اس طریقہ سے کرنا کہ گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ مقام حاصل نہ ہو تو (کم ازکم یہ مقام حاصل ہو کہ) خداوندِ قدوس تم کو دیکھ رہا ہے، پھراس شخص نے کہا مجھ کو بتلایئے کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس سے تم دریافت کررہے ہو، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا (یعنی خداوندِ قدوس کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں ہے) اس شخص نے کہا کہ: آپ اس کی علامات بتلایئے، آپ ﷺ نے فرمایا اس کی ایک علامت تو یہ ہے کہ باندی اپنے مالک کو جنے گی، دوسرے یہ کہ ننگے پاؤں اور ننگے جسم والے لوگ جو (ادھر ادھر) پھرتے ہیں، مفلس بکریاں چرانے والے وہ بڑے بڑے محل تعمیر کریں گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں تین روز تک ٹھہرا رہا، پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عمر رضی اللہ عنہ! تم واقف ہو کہ وہ سوال کرنے والا اور دریافت کرنے والا کون شخص تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کو ہی علم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے جو کہ تم کو دین سکھلانے کیلئے تشریف لائے تھے۔(۱)

اس حدیثِ پاک میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا اور سوالات کر کے آپ ﷺ سے گفتگو کرنا یہ سب کچھ تعلیمی مقصد کے تحت ہوا تھا۔

- استاذ کو چاہئے کہ بسا اوقات طلبہ کو سوال وجواب کی شکل میں عقلی ومنطقی دلائل کے ذریعہ ان کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے اخلاقیات کی درستگی کرے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک نوجوان نبی کریم ﷺ کی خدمت میں

(۱) صحیح ابن حبان، ذکر البیان بأن ال إیمان وال إسلام شعب، حدیث: ۱۷۳، محقق شعیب الارناؤوط کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے زنا کرنے کی اجازت دے دیجئے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوکر اسے ڈانٹنے لگے اور اسے پیچھے ہٹانے لگے، لیکن نبی ﷺ نے اس سے فرمایا میرے قریب آ جا، وہ نبی ﷺ کے قریب جا کر بیٹھ گیا، نبی ﷺ نے اس سے پوچھا کیا تم اپنی والدہ کے حق میں بدکاری کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا اللہ کی قسم! کبھی نہیں، میں آپ پر قربان جاؤں، نبی ﷺ نے فرمایا لوگ بھی اسے اپنی ماں کیلئے پسند نہیں کرتے، پھر پوچھا: کیا تم اپنی بیٹی کے حق میں بدکاری کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا اللہ کی قسم! کبھی نہیں، آپ پر قربان جاؤں، نبی ﷺ نے فرمایا لوگ بھی اسے اپنی بیٹی کیلئے پسند نہیں کرتے، پھر پوچھا: کیا تم اپنی بہن کے حق میں بدکاری کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا اللہ کی قسم! کبھی نہیں، آپ پر میری جان قربان، نبی ﷺ نے فرمایا: لوگ بھی اسے اپنی بہن کیلئے پسند نہیں کرتے، پھر پوچھا: کیا تم اپنی پھوپھی کے حق میں بدکاری کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا اللہ کی قسم! کبھی نہیں، میں آپ پر قربان، نبی ﷺ نے فرمایا: لوگ بھی اسے اپنی پھوپھی کیلئے پسند نہیں کرتے، پھر پوچھا کیا: تم اپنی خالہ کے حق میں بدکاری کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا کہ: اللہ کی قسم کبھی نہیں، میں آپ پر قربان، نبی ﷺ نے فرمایا: لوگ بھی اسے اپنی خالہ کیلئے پسند نہیں کرتے، پھر نبی ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس کے جسم پر رکھا اور دعا کی کہ اے اللہ! اس کے گناہ معاف فرما، اس کے دل کو پاک فرما اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما" **اللّٰھم اغفر ذنبہ وطھر قلبہ وحصن فرجہ**"، راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان نے کبھی کسی کی طرف توجہ بھی نہیں کی۔(۱)

۞ استاذ شاگردوں کو بات مثالوں کے ذریعے ان کے ذہین نشیں کروائے، حضور ﷺ کا طریقہ کار بھی یہی تھا آپ ﷺ مثالوں کے ذریعہ مخاطب کو بات سمجھاتے جس سے اس کو وہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جہینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت

---

(۱) مجمع الزوائد: باب فی أدب العلم، حدیث: ٥٤٣، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ: میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی اور مر گئی تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اس کی طرف سے حج کر اگر تیری ماں پر کوئی قرض ہوتا تو کیا اسے ادا نہ کرتی؟ "لو كان على أمك دين أكنت قاضية" اللہ تعالیٰ کا حق تو اور بھی پورا کئے جانے کا مستحق ہے۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: وہ مومن جو قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج کی سی ہے کہ اس کی خوشبو بھی پاکیزہ ہے اور اس کا ذائقہ بھی عمدہ ہوتا ہے اور وہ مومن جو قرآنِ کریم پڑھتا نہیں ہے اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس کا ذائقہ تو عمدہ ہوتا ہے؛ لیکن اس کی کوئی خوشبو عمدہ نہیں ہے اور اس فاسق وفاجر آدمی کی مثال جو قرآنِ کریم پڑھتا ہے ریحان کے پھل کی طرح ہے کہ اس کی خوشبو عمدہ ہوتی ہے؛ لیکن اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے اور وہ فاجر آدمی جو قرآنِ کریم کی تلاوت نہیں کرتا اس کی مثال حنظل کے پھل کی سی ہے کہ اس کا ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے اور خوشبو بھی کچھ نہیں ہوتی اور نیک آدمی کے ہم نشین کی مثال مشک والے کی سی ہے کہ اگر تجھے اس مشک میں سے کچھ بھی نہ ملے تو اس کی خوشبو تو تجھے پہنچے گی ہی، اور برے آدمی کے ہم نشین کی مثال دھونکنے والے کی سی ہے کہ اگر اس کی کالک تجھے نہ بھی لگے لیکن اس کا دھواں تو تجھے ضرور پہنچے گا، "إن لم يصبك من سواده أصابك من دخانه" (۲)

❁ استاذ کو چاہئے کہ بات کو سمجھانے کیلئے نقشہ بنانے کی ضرورت پڑے تو نقشہ بھی بنالے اس سے بات کے سمجھنے میں سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک شکل چار خطوط (لکیروں) کی بنائی اور اس میں ایک خط کھینچا جو اس سے باہر نکلا ہوا تھا، اور اس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی لکیریں اس طرح بنا دیں، جو حصہ اس مربع کے درمیان تھا، اور فرمایا یہ آدمی ہے اور یہ اس کی موت ہے، جو

---

(۱) بخاری: باب الحج والنذور عن الميت، حدیث: ۱۸۵۲

(۲) أبوداؤد: باب من يؤمر أن يجالس، حدیث: ۴۸۲۹

اس کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ خط جو باہر کو نکلا ہوا ہے، اس کی دراز آرزویں اور امیدیں ہیں اور یہ چھوٹی چھوٹی لکیریں اغراض اور مصائب ہیں، اگر ایک سے بچ کر نکلا تو دوسرے میں پھنسا، اور اس سے نکلا تو پھر کسی اور میں پھنسا، "وإن أخطأه هذا نهشه هذا" (١)

❁ استاذ ضرورت پڑنے پر گفتگو اور اشارے دونوں سے تعلیم دے، اشارے بھی بات کو سہولت کے ساتھ سمجھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا (کہ وہ یتیم خواہ اس کا ہو یا کسی اور کا) جنت میں اس طرح ہوں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعہ اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی "وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما شيئا" (٢)

❁ استاذ کو چاہئے کہ طلباء کو بغیر کسی سوال یا پیشکش کے علاوہ اہم امور بھی بیان کرے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ اور فلاں کو کس نے؟ حتی کہ یہ کہتا ہے کہ (بتا) تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہاں تک معاملہ پہنچ جائے تو اللہ سے پناہ مانگنا اور خاموش ہو جانا چاہیے، "فليستعذ بالله ولينته" (٣)

❁ استاذ کو چاہئے کہ شاگردوں کو سوالات کرنے پر ابھارے اور ان کو سوالات کرنے کی ترغیب دے اور پھر ان سوالات کا جواب دے، اس طرح بھی طلباء کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سفر کیلئے روانہ ہوئے، راستہ میں ایک شخص کو پتھر لگا جس سے اس کا سر پھٹ گیا (رات کو جب سو گیا تو) اس کو احتلام ہوا،

---

(١) بخاری: باب فی الأمل وطوله، حدیث: ٦٤١٧

(٢) بخاری: باب فضل من یعول یتیما، حدیث: ٦٠٠٥

(٣) بخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، حدیث: ٣٢٧٦

اس نے ساتھیوں سے پوچھا کہ: کیا تم مجھے تیمم کی اجازت دیتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں ہم تیرے لیے تیمم کی کوئی گنجائش نہیں پاتے؛ کیونکہ تجھے پانی کے حصول پر قدرت حاصل ہے؛ لہٰذا اس نے غسل کیا اور مر گیا، جب ہم رسول ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں نے اس کو ناحق مار ڈالا، اللہ ان کو ہلاک کرے جب ان کو مسئلہ معلوم نہ تھا تو ان کو پوچھ لینا چاہیئے تھا؛ کیونکہ نہ جاننے کا علاج معلوم کر لینا ہے "فإن شفاء العی السوال"۔ اس شخص کے لیے کافی تھا کہ وہ تیمم کر لیتا اور اپنے زخم پر کپڑا باندھ کر اس پر مسح کر لیتا اور باقی سارا بدن دھوڈالتا۔(۱)

استاذ ایسے مواقع کی تلاش میں رہے جس سے تعلیم مؤثر ہوسکتی ہے اور پیش آمدہ خاص واقعہ اور اس علمی بات یا حکم کے درمیان ربط پیدا کرے، اس سے بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے اور قیدیوں میں سے ایک عورت کسی کو تلاش کر رہی تھی، اس نے قیدیوں میں اپنے بچے کو پایا، اس نے اسے اٹھا کر اپنے پیٹ سے لگایا اور اسے دودھ پلانا شروع کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے عرض کیا نہیں اللہ کی قسم جہاں تک اس کی قدرت ہوئی اسے نہ پھینکے گی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس عورت کے اپنے بچہ پر رحم کرنے سے زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے، "اللہ أرحم بعبادہ من ھذہ بولدھا"۔ (۲)

- استاذ خشونت اور تیکھا اور سخت رویہ ہر دم اختیار کئے نہ رہے، بلکہ طلباء سے مزاح بھی کیا جاسکتا ہے، جب کہ یہ مزاح حق بات پر مشتمل ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا

---

(۱) ابوداوٗد: کتاب الطھارۃ، باب فی المجروح یتیمم

(۲) بخاری: باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ، حدیث: ۸۶۵۳

اور اس نے نبی ﷺ سے سواری کیلئے درخواست کی، نبی ﷺ نے فرمایا ہم تمہیں اونٹنی کے بچے پر سوار کریں گے، وہ کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! میں اونٹنی کے بچے کو لے کر کیا کروں گا؟ نبی ﷺ نے فرمایا کیا اونٹنیاں اونٹوں کے علاوہ بھی کسی کو جنتی ہیں؟ "وهل تلد الإبل إلا النوق"(۱)

اس میں لطیف مزاح ہے کہ اونٹ خواہ وہ مال برداری کے قابل کیوں نہ ہو جائے ہوتا ہے وہ اونٹنی کا بچہ ہی۔

❁ استاذ کو چاہئے کہ بیٹھنے کا انداز بدل کر، بات کو مکرر کر کے کہی جانے والی بات کی طرف طلباء کی توجہ مبذول کروائے۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرہ، اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا، اس وقت آپ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے اور فرمایا سن لو جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا، سن لو! جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا، آپ ﷺ اسی طرح (بار بار) فرماتے رہے؛ یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ آپ خاموش نہ ہوں گے "فمازال يقولها، حتى قلت لا يسكت"(۲)

☆ استاذ کو چاہئے کہ بار بار نام لے کر اور جواب میں تاخیر کے ذریعے طالب علم کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک سواری (دراز گوش) یعنی گدھے پر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا، آپ ﷺ کے اس دراز گوش کا نام عفیر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے، میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے، کہ اس کی

---

(۱) ترمذی: المزاح، حدیث: ۱۹۹۱، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

(۲) بخاری: باب عقوق الوالدین من أکبر الکبائر، حدیث: ۵۹۷۶

عبادت کریں، اوراس کے ساتھ کسی کوشریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شرک نہ کرتا ہواس کوعذاب نہ دے، میں نے عرض کیا میں اس بات کی لوگوں کو بشارت دے دیتا ہوں فرمایا بشارت نہ دو، ورنہ وہ اسی پر تکیہ کرلیں گے، اور اعمالِ صالحہ چھوڑ بیٹھیں گے، "لا تبشرهم فيتكلوا" (١)

❁ استاذ شاگرد کی توجہ مبذول کرانے اور بات کواس کے ذہن ودماغ میں جاگزیں کرنے کیلئے اس کے کاندھے اور ہاتھ کوبھی پکڑ سکتا ہے، جیسا کے حضور اکرم ﷺ کا اس حوالہ سے معمول تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے تشہد اس طرح سکھایا جس طرح قرآن کی سورۃ سکھاتے تھے اور میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے لیا (وہ کلماتِ تشہد یہ تھے) :

التحيات لله والصلوات والطيبات السلام عليك أيها النبي ورحمة الله وبركاته السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله

(آپ ﷺ اس وقت ہمارے درمیان موجود تھے) جب آپ ﷺ کی وفات ہوگئی تو ہم لوگ السلام على النبي صلى الله عليه وسلم کہنے لگے۔ (٢)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا مونڈھا پکڑ کر فرمایا کہ تم دنیا میں اس طرح رہو گویا تم مسافر ہو یا راستہ طے کرنے والے ہواور ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب شام ہوجائے تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح ہوجائے تو شام کا انتظار نہ کرو اور اپنی صحت کے اوقات سے اپنے مرض کے اوقات کیلئے حصہ لے لے، اور اپنی

(١) بخاری: کتاب الجهاد، باب اسم الفرس والحمار، حدیث: ٦٥٨٢

(٢) بخاری: باب الاخذ بالیدین، حدیث: ١٩٥

حیات کے وقت سے اپنی موت کیلئے کچھ حصہ لے لے، "ومن حیاتك لموتك"(۱)

❁ استاذ کو چاہئے کہ شمار کی جانے والی چیزوں میں پہلے اجمال پھر تفصیل بیان کرے، اس سے طالبِ علم کے ذہن ودماغ میں بات بالکل جاگزیں ہوجاتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو: بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، فقر ومحتاجی سے پہلے مالداری کو، مشغولیت سے پہلے فرصت کو اور موت سے پہلے زندگی کو "وحیاتك قبل موتك"(۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شادی کیلئے عورت کی چار باتیں دیکھی جاتی ہیں، مال، نسب، خوبصورتی، دین، تجھے دینداری کو حاصل کرنا چاہئے (اگر تو نہ مانے) تو تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں گے "فاظفر بذات الدین تربت یداك"(۳)

❁ استاذ اگر کسی باعث شرم وحیاء بات کی تعلیم دینا چاہتا ہو تو اس سے پہلے بطور تمہید اور تقریب کے کوئی بات کہہ سکتا ہے، تاکہ شرم وحیاء کا ازالہ ہوسکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہارے لئے ایسا ہی (شفیق اور مربی) ہوں جیسا باپ اپنے بیٹے کیلئے میں تمہیں از راہ شفقت تمام امور کے متعلق تعلیم دیتا ہوں، "انما انا مثل الوالد لولده" مثلاً (جب تم قضائے حاجت کیلئے جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ مت کرو اور تین پتھر استعمال کرنے کا حکم دیا اور گوبر اور ہڈی استعمال کرنے سے اور دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے سے منع فرمایا۔(۴)

❁ استاذ کو چاہئے کہ قابل شرم وحیاء امور کی تعلیم میں اشارات وکنایات کا اسلوب اختیار کرے۔

---

(۱) بخاری: باب قول النبیا، کن فی الدنیا الخ، حدیث:۳۵۰٦

(۲) المستدرك: کتاب الرقاق، حدیث:۷۸۴٦

(۳) بخاری: باب الأکفاء فی الدین، حدیث:۵۰۹۰

(۴) ابن ماجة: باب الاستنجاء بالحجارة والنهی عن الروث، حدیث:۳۱۳

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے حضرت نبی ﷺ سے اپنے غسل حیض کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ اس طرح غسل کرے، فرمایا کہ ایک ٹکڑا (کپڑے کا) مشک سے (بسا ہوا) لے اور اس سے صفائی کر، اس نے عرض کیا کہ اس سے کس طرح صفائی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! صفائی کرلے، تو میں نے اس عورت کو اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا کہ اسے خون کے مقام پر پھیر دے "تتبعی بها اثر الدم"۔(١)

۞ استاذ سے غلطی ہوجائے اور شاگرد متنبہ کرے تو استاذ فوراً اس کو قبول کرے، ٹال مٹول نہ کرے۔

حضرت محمد بن کعب قرظیؒ کہتے ہیں کہ: ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا کچھ جواب دیا، اس آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین! مسئلہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ اس طرح ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: تم نے ٹھیک کہا، میری بات غلط تھی اصبت واخطأت "فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ"(٢) اور ہر جاننے والے کے اوپر اس سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے۔(٣)

حضرت خلف بن احمر مشہور امامِ لغت گذرے ہیں، امام احمدؒ ان کے تلامذہ میں سے ہیں لیکن علومِ اسلامی میں مہارت اور زہد وتقوی کی وجہ سے امام صاحبؒ کو اپنے استاذ سے بھی زیادہ عزت ملی، اس کے باوجود امام احمدؒ کبھی ان کے برابر بیٹھنے کو تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ: آپ کے سامنے بیٹھوں گا؛ کیونکہ ہمیں اپنے اساتذہ کے ساتھ تواضع اختیار کرنے کا حکم ہے۔(٤)

---

(١) بخاری: کتاب الحیض، باب دلک المرأۃ نفسھا إذا تطھرت من المحیض، حدیث: ٨٠٣

(٢) یوسف: ٧٦

(٣) جامع بیان العلم وفضلہ، فصل فی الانصاف فی العلم، ١/١٣١

(٤) تذکرۃ السامع والمتکلم: ٨٧

امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے شاگردوں میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ: جب میں امام مالکؒ کے سامنے ورق پلٹتا تو بہت نرمی سے کہ کہیں آپ کو بارِ خاطر نہ ہو۔(۱)

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ اپنے استاذ حمادؒ کے مکان کی طرف پاؤں کرنے میں بھی لحاظ ہوتا تھا، امام صاحبؒ خود اپنے صاحبزادے کا نام اپنے استاذ کے نام پر حماد رکھا۔

حضرت قاضی ابویوسفؒ کو اپنے استاذ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ایسا تعلق تھا کہ جس روز بیٹے کا انتقال ہوا اس روز بھی اپنے استاذ کی مجلس میں حاضری سے محرومی گوارا نہ کی۔

منتظمین ومہتممین اور معلمین کی خدمت میں

جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا، ہمارے انحطاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ رفتہ رفتہ دینی مداس کے تعلیم وتعلم کا یہ نظام ایک رسم بنتا جا رہا ہے، اور اس کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے، اگر چہ ہماری زبانوں پر یہی جملہ رہتا ہے کہ ہماری تمام کاوشوں کا مقصد اصلی دین کی خدمت ہے؛ لیکن بسا اوقات یہ محض گفتار ہی کی حد تک محدود رہتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوتی، اگر یہ مقصد واقعہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا تو اس کی لگن سے ہمارا کوئی لمحہ خالی نہ ہوتا، پھر ہمیں اپنے اسلاف کی طرح ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ ہمارا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو نہیں، اور ہمارا طرز عمل خدمت دین اور اس کے مقصد کے لئے مفید ہو رہا ہے یا مضر؟

اس کے برعکس عملاً ہماری تمام تر توجہات دینی مدارس کے ظواہر پر مرکوز رہتی ہیں اور ان توجہات میں مقصد اصلی کی لگن کا کوئی عکس نظر نہیں آتا، عموماً منتظمین کے عملی مسائل یہ ہوتے ہیں کہ کس طرح مدرسے کی شہرت میں اضافہ ہو کس طرح اس میں طلبہ کی تعداد بڑھے؟ کس طرح مشہور اساتذہ کو اپنے یہاں جمع کیا جائے؟ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کس طرح عوام میں مدرسے اور اس کے اہل حل وعقد کی مقبولیت میں اضافہ ہو؟ ہمارا طرز عمل

(۱) تذکرۃ السامع والمتکلم: ۸۷

اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مدارس کے قیام سے ہمارے پیش نظر یہی بنیادی مقاصد ہیں جن کے حصول کی دھن میں ہمارے شب وروز صرف ہورہے ہیں، چنانچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات ایسے ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں جو کسی طرح دین اور اہل دین کے شایان شان نہیں ہوتے، بلکہ بعض اوقات تو ان مقاصد کے لئے واضح طور پر ناجائز ذرائع کے استعمال میں بھی باک محسوس نہیں کیا جاتا، اور اگر کسی مدرسہ کو ان مقاصد میں فی الجملہ کامیابی حاصل ہوجائے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مقصد اصلی حاصل ہوگیا، لیکن طلباء کی تعلیمی، اخلاقی اور دینی حالت کیسی ہے؟ ہم کس قسم کے افراد تیار کرکے اس سے معاشرے کی قیادت کے خواہش مند ہیں؟ اور فی الواقع ہماری جدوجہد سے دین کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے ،ان سوالات پر غور کرنے اور ان کی تڑپ رکھنے والے رفتہ رفتہ مفقود ہوتے جارہے ہیں۔

اس صورت حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم ایک مرتبہ زبان سے اپنا مقصد اصلی خدمت دین کو قرار دینے کے بعد عملی زندگی میں اسے بھول جاتے ہیں اور اپنی کوششوں کا تمام تر محور ان ظواہر کو بنالیتے ہیں جو یا تو شرعاً مطلوب ہی نہیں، یا اگر مطلوب ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ ان کو نیک نیتی سے مقصد کا محض ذریعہ قرار دیا جائے، خود مقصد نہ سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح اساتذہ کا معاملہ عام طور سے یہ نظر آتا ہے کہ ان کا محور فکر بسا اوقات یہ رہتا ہے کہ ہمیں کونسا مضمون یا کونسی کتاب پڑھانے کے لئے ملے؟ طلبہ پر کس طرح اپنے علمی تفوق کی دھاک بٹھائی جائے؟ وہ کونسے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے طلبہ میں اپنی مقبولیت بڑھے؟ اور پھر اس مقبولیت میں اضافہ کی خاطر بسا اوقات یہ بات مدنظر نہیں رہتی کہ طلبہ کے لئے کونسا طرز عمل زیادہ مفید اور مناسب ہے؛ بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کیا طرز عمل طلبہ کی خواہشات کے مطابق ہے؟ چنانچہ اس کے نتیجے میں اساتذہ اپنے طلبہ کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان کی خواہشات کے تابع ہوکر رہ جاتے ہیں اور طلبہ اساتذہ کے پیچھے نہیں چلتے؛ بلکہ اساتذہ طلبہ کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔

ماضی میں خاص طور پر دینی مدارس کی روایت یہ رہی ہے کہ اساتذہ اور طالب علم کا

رشتہ محض ایک رسمی رشتہ نہیں ہوتا تھا جو درسگاہوں کی حد تک محدود ہو، اس کے بجائے ایک ایسا روحانی رشتہ ہوتا تھا جو دائمی طور پر عمر بھر قائم رہتا تھا، استاذ صرف کتاب پڑھانے کی ڈیوٹی ادا کرنے والا معلم نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ ایک شفیق نگراں کی حیثیت رکھتا تھا، جو طلبہ کے نجی معاملات تک دخیل ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ سلیقہ سیکھتے تھے، ان سے للّٰہیت، ایثار، تواضع اور دوسرے اخلاق فاضلہ اپنی زندگی میں جذب کرتے تھے، اور اس طرح شاگرد اپنے استاذ کے علم و عمل کا آئینہ ہوا کرتا تھا۔

اب رفتہ رفتہ یہ باتیں داستان پارینہ ہوتی جارہی ہیں، اور وجہ وہی ہے کہ استاذ نے اپنا مقصد صرف درسگاہ میں ایک ایسی تقریر کرنے کو بنالیا ہے جسے طلبہ پسند کرسکیں، رہی یہ بات کہ کس قسم کی تقریر ان طلبہ کے لئے زیادہ مفید ہے؟ ان طلبہ کو مفید تر بنانے کے لئے ان کو کن کاموں کا مکلف کرنا ضروری ہے؟ طلبہ کو کونسے رجحانات ان کے علم و عمل کے لئے مضر ہیں؟ ان رجحانات کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے؟ طلبہ علم درسگاہ سے باہر جاکر کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں؟ ان سوالات کے بارے میں سوچنے اور ان مقاصد کی لگن رکھنے والے الا ماشاء اللہ مفقود ہوتے جارہے ہیں۔

اساتذہ کرام کا اصلاحی تعلق

دارالعلوم دیوبند اور اس کے فیض یافتہ دوسرے دینی مدارس کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے صرف ''علم برائے علم'' کو کبھی مقصد نہیں بنایا، چنانچہ وہاں کے تمام طلبہ درسیات سے فراغت کے فوراً بعد کسی شیخ کامل سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کرتے تھے، آج علماء دیوبند کی فہرت میں جن اصحاب کے اسماء گرامی اپنی علمی کارناموں کے لئے معروف اور ممتاز ہیں وہ سب کسی نہ کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے عہد شباب میں کسی ایسے استاذ کا تصور تقریباً ناممکن تھا جو کسی شیخ کامل سے وابستہ نہ ہو، اس کا نتیجہ تھا کہ اساتذہ صرف علمی استعداد ہی نہیں؛ بلکہ کردار و علم اور ذہن و فکر کے لحاظ سے اپنے طلباء کے لئے ایک مثالی نمونہ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے

دل للّٰہیت کے جذبے سے سرشار، ان کے جذبات پاکیزہ، ان کے اخلاق جلا یافتہ، اور ان کے ذہن دنیا طلبی اور جاہ پرستی کے فتنوں سے پاک ہوتے تھے، اور وہ صرف اللہ کی رضا جوئی کی خاطر درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے تھے۔

افسوس ہے کہ اب دینی مدارس اور ان کے فارغ التحصیل حضرات میں اپنی اصلاح وتربیت کے لئے کسی شیخ کامل سے رجوع کرنے کا ذوق ختم ہوتا جارہا ہے، بلکہ بہت سی جگہوں پر سلوک وتصوف اور تربیت وارشاد کے سلسلے کو فضول سمجھ لیا گیا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ طلباء فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو کسی تربیت کا محتاج نہیں سمجھتے اور جب اس ناپختگی کے عالم میں اپنی پختگی کا زعم باطل لے کر عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں، یا دوسروں کی رہنمائی کا منصب سنبھالتے ہیں تو ''او خویشتن گم است گرا رہبری کند'' کا منظر سامنے آتا ہے۔

ان گزارشات کا مقصد خدانخواستہ تنقید برائے تنقید نہیں؛ بلکہ ان حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے جن سے ہم دوچار ہیں، اگر مدارس کے اہل حل وعقدان مسائل کی طرف کما حقہ توجہ دیں تو اب بھی اس صورت حال کا مداوا ہوسکتا ہے، تجربہ یہ ہے کہ ان باتوں کا بار بار تذکرہ کرنے سے بھی اصلاح حال میں مدد ملتی ہے، لہٰذا ہم اہل مدارس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تعلیمی سال کے آغاز میں ان مسائل پر غور وفکر کے لئے اساتذہ کی مجلس منعقد کریں جن میں ان حالات کا تجزیہ کر کے ان اسباب کو دور کرنے اور اصلاح کی تدابیر پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

تجربہ یہ بھی ہے کہ ان حالات کی اصلاح کے لئے اپنے بزرگوں کے حالات اور ملفوظات کا مطالعہ اور مذاکرہ بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے، اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ ہر مدرسے میں کچھ وقت اس مذاکرے کے لئے مخصوص کیا جائے، اور اس میں علامہ زرنوجیؒ کی ''تعلیم المتعلم'' علامہ خفاجی کی ''تذکرۃ السامع والمتکلم'' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ''ارواح ثلاثہ'' شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ

کی ''فضائل علم'' اور'' آپ بیتی'' اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مختلف مواعظ وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کیا جائے ،ضرورت تو اس کی ہے کہ یہ مذاکرہ روزانہ ہوا کرے ،لیکن اگر ایسا کرنا مشکل ہو تو کم از کم ہفتے میں ایک بار پابندی کے ساتھ اس مذاکرے کی مجلس منعقد ہو اور اس میں اساتذہ وطلبہ سب شریک ہوں، امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مجلس اصلاح احوال میں نہایت مؤثر ثابت ہوگی، اور اپنے اسلاف کی باتیں بار بار کانوں میں پڑیں گی تو اس سے انشاء اللہ جذبہ عمل خود بخود پیدا ہوگا۔(۱)

نظام حاضری وہدایات برائے معلمین و متعلمین شعبہ عالمیت

شوال کے مہینے میں عربی مدارس میں تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوجاتی ہیں، اساتذہ وطلبہ رمضان المبارک کے وقفے کے بعد ایک تازہ نشاط کے ساتھ مصروف عمل ہوجاتے ہیں، امت کے یہ دونوں طبقے دین کی ایک بہت اہم خدمت میں مصروف ہیں۔

خدمت علم کی اہمیت کے پیش نظر اس کے آداب وشرائط اور ذمہ داریاں بھی بہت اہم ہیں،اس بات میں نظام حاضری۔

۱) ہر طالب علم کو لازم ہوگا کہ وہ روزانہ اپنے درجہ کے گھنٹوں میں حاضر ہو۔

۲) اگر کوئی طالب علم معذور ہو تو اس کو ایک دن یا اس سے زیادہ کی ضرورت کے لئے ایک درخواست مہتمم دار العلوم کی خدمت میں پیش کرنا ہوگی، درخواست پر ناظر دارالاقامہ (اگر طالب علم دار الاقامہ میں رہتا ہو) ورنہ اس کے سرپرست کی تصدیق ہونی چاہئے۔

۳) دس روز متواتر بلا اجازت غیر حاضری پر طالب علم کا نام دارالعلوم سے خارج کردیا جائے۔

۴) جو طالب علم اکثر غیر حاضر رہتا ہو،جس کی چال چلن خراب ہوں یا حکم عدولی یا

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۱۲۶-۱۲۷

گستاخی کرے اس کو مہتمم فہمائش کرے، اگر یہ مؤثر نہ ہوا تو اس کا نام دار الاقامہ یا دار الاقامہ و دار العلوم دونوں سے خارج کر سکتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو آئندہ کے لئے ممنوع الادخال قرار دے سکتا ہے۔

۵) جس طالب علم کا نام دار العلوم سے خارج ہوگا وہ دار الاقامہ سے فوراً خارج کر دیا جائے گا۔(۱)

۶) آفس میں حاضری رجسٹر رکھا جائے ، ہر آنے والے استاذ، نیز ملازمین روزانہ دونوں وقت مدرسہ آتے ہی کسی ایک جگہ رکھے رجسٹر میں دستخط کر کے جائیں، جس دن دستخط نہ ہوں اور درخواست بھی نہ ہو تو تین دن کی تنخواہ وضع کر لی جائے یا پھر کسی معقول عذر کی وجہ سے تاخیر کو معاف کیا جائے۔

۷) اگر مدرس ایک یا دو گھنٹے کے لئے کہیں جائیں تو آفس میں اطلاع دے کر جائیں۔

۸) اگر مدرس زیادہ دیر کے لئے کہیں جائیں تو تحریری درخواست ضروری ہوگی۔

۹) ہر مدرس کی ایک علاحدہ فائل جس میں اس کا معلوماتی فارم ہو اور اس کے متعلق سارے کاغذات اس میں رکھے جائیں۔

۱۰) اساتذہ اپنے درجہ میں خود طلبہ کی حاضری لیں؛ تاکہ ان کو ہر طالب علم کا نام اور شکل وصورت مشخص رہے اور غیر حاضری یا اسباق میں غفلت کی شکل میں اس کو تنبیہ کر سکیں۔

۱۱) اساتذہ خود مؤثر بنیں، بار بار انتظام کے پاس بھیجنا، بھیجنے کی دھمکی دینا، یا اولیاء کو مطلع کرنا، طالب علم میں بے شرمی اور بغاوت پیدا کرتا ہے۔

۱۲) ایک سال میں تعطیلات مقررہ کے علاوہ دس یوم کی رخصت اتفاقی ہوگی، اس سے زیادہ غیر حاضری کی تنخواہ وضع کر دی جائے گی۔(۲)

---

(۱) نصاب تعلیم:۶

(۲) مدارس دینیہ کے رہنما اصول:۱۸

۱۳) پندرہ روز سے پہلے گھر جانے کی اجازت نہ ہوگی ناگہانی ضرورت مستثنٰی ہے۔
۱۴) پندرہ روز میں جمعرات کی دوپہر سے سنیچر کی دوپہر تک رخصت ہوگی۔
۱۵) وقتی ضرورت پر بھی چھٹی مل جائے گی؛ مگر اس کا حساب دس یوم کی رخصت میں ہوگا ہاں بیماری کی چھٹی اس میں محسوب نہ ہوگی۔
۱۶) مسلسل دس پندرہ یوم کی تعطیل مدرسے کی جانب سے نہیں مل سکے گی، تقریب کے موقع پر صرف ۴/۵ یوم کی رخصت مل سکے گی۔
۱۷) تعطیلاتِ مقررہ کے علاوہ 15% غیر حاضری ہونے سے مدرسہ آئندہ تعلیمی خدمت سے معذور رہے گا۔
۱۸) مقدار رخصت سے بلا عذر پانچ روز زائد ہوتے ہی مدرسے سے نام خارج کر دیا جائے گا۔
۱۹) ایک ماہ سے پہلے چھٹی لینے کی اجازت نہ ہوگی، جمعرات کی دوپہر سے سنیچر کی دوپہر تک اجازت ہوگی۔
۲۰) کسی وقتی حادثے پر بھی چھٹی مل سکتی ہے۔(۱)

ہدایات برائے اساتذہ (ہردوئی)

۱۔ تعلیمی خدمت کو اپنا فرض منصبی خیال کرنا اور وظیفہ کو انعام خداوندی سمجھنا۔
۲۔ انتظام وظیفہ وانتظام تعلیم کرنے والوں کو اپنا محسن سمجھنا اور ان کے لئے دعائے خیر کرتے رہنا، نیز عامۃ المسلمین کے لئے بھی دعا کا اہتمام کرنا۔
۳۔ طلباء کو بھی اپنا محسن سمجھنا کہ ان کی وجہ سے علمی اور عملی ترقی کا موقع ملتا ہے۔ نیز ان کو اللہ تعالیٰ نے سبب روزی بنایا ہے کہ خدمت دین کے ساتھ روزی کا نظم بھی ہے، ہم خرما و ہم ثواب کا سلسلہ بھی ہے۔
۴۔ طلباء کی عظمت بوجہ مجاہد فی سبیل اللہ اور ضیف رسول اللہ ﷺ ہونے کے کرنا۔

(۱) تعلیم وتربیت کس طرح: ۱۷۴

۵۔ مثل اولاد کے طلباء سے شفقت ومحبت کا معاملہ کرنا۔

۶۔ ایسے معاملات سے احتیاط فرمانا کہ طلباء یا منتظمین یا معاونین کی تحقیر ظاہر ہو یا عامۃ المسلمین کے سامنے شکایت و بے وقعتی ہو۔

۷۔ غصہ کی حالت میں تادیب سے احتیاط کرنا۔

۸۔ تادیب ضربی سے حتی الوسع احتیاط فرمانا اور بشرط ضرورت تادیب حدود کے اندر کرنا۔

۹۔ نماز باجماعت؛ بلکہ تکبیر اولی، تعدیل ارکان، ادعیہ ماثورہ اور اوقات مقررہ کی پابندی کی تلقین فرماتے رہنا گاہِ بگاہِ نگرانی ازخود کرنا (یہ حق اسلام بھی ہے)

۱۱۔ امارد کو خلوت میں آنے سے سختی سے روکنا۔

۱۲۔ بڑے طلباء سے خدمت کے لئے اجازت منتظم لینا، امارد سے سخت احتیاط اس بارے میں رکھی جائے۔

۱۳۔ طلباء کی عیادت اور ضروری اعانت کا خاص خیال رکھنا۔

۱۴۔ ناغہ سبق کے نقصانات گاہِ بگاہِ بیان کرنا۔

۱۵۔ مطالعہ کی تاکید فرمانا، اسی طرح تاکید مطالعہ سبق کی بھی۔

۱۶۔ قرآن شریف میں ہر ایک کا سبق خود سننا، دیگر جماعتوں میں باری باری سبق پڑھانا، یا ایک دن میں کئی طلباء سے۔

۱۷۔ طالب علم کے سبق کا مدار اپنی تجویز پر رکھنا کہ آج کون پہلے سنائے، تاکہ سب تیاری کر کے لائیں۔

۱۸۔ طلباء کی شرارت اور بے ادبی پر صبر وتحمل کا اہتمام چاہئے اور اس وقت کفار مکہ کے حالات کو سامنے رکھ کر اسوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سونچا جائے بعد شفاءِ غیظ مناسب طریقہ اصلاح کا تجویز کیا جائے، فہمائش یا تادیب۔

۱۹۔ کسی کے توجہ دلانے پر اپنی غلطی یا عملی کمزوری ظاہر ہو تو اس کا ممنون ہونا چاہئے۔

۲۰۔ ظہور غلطی پر اس غلطی کی تلافی کی فکر کرنا چاہئے، اس سے عظمت بڑھتی ہے

۲۱۔ تعلیم المتعلم کا مطالعہ میں رکھنا۔(۱)

۲۲۔ اس کی کوشش کرے کہ استاذ جب بنے کہ اپنی اصلاح کسی شیخ کامل سے کرا چکا ہو اور ماتحتوں کو ان کی نظر سے دیکھے اور طلبہ کے اخلاق کی نگرانی اور ان کی اصلاح کو مدنظر رکھے۔

۲۳۔ طلباء سے خدمت نہ لے اگر ضرورت پڑے تو کام میں آسانی کا خیال رکھے، خود مدد کرے یا کسی اور سے مدد کرائے۔

۲۴۔ شاگردوں کا ممنون رہے کہ ان لوگوں نے اپنے کو تمہارے سپرد کیا ہے تم اپنے دین کی کھیتی باڑی میں خوب شوق سے کام کرو۔

۲۵۔ متعلمین کو ایک نظر سے دیکھے اور یکساں برتاؤ رکھے؛ تاکہ کسی متعلم کے دل میں حسد یا رنج نہ پیدا ہو اور بدگمانی نہ ہو کسی کے ساتھ کچھ خاص معاملہ کرنا ہو تو اس کو مع اس کی وجہ کے اوروں پر صراحۃ یا یا اشارۃ ظاہر کر دے۔

۲۶۔ تعلیم میں دنیا پیش نظر نہ ہو؛ بلکہ دین مدنظر ہو۔

۲۷۔ حیاء اور وقار سے رہے؛ تاکہ یہ اخلاق متعلمین میں پیدا ہوں؛ کیوں کہ حیاء ایمان کے درخت کی بڑی شاخ ہے، اگر یہ پیدا ہو جائے گی تو دین کے بہت سے کاموں کی پابندی کر لیں گے؛ مگر وقار سے مراد کبر نہ سمجھے۔

۲۸۔ کچھ دیر تک خلوت میں فراغت کے وقت رہے اور اس میں اپنے نفس سے محاسبہ کرے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اوامر میں کیا کیا پورا کیا اور نواہی میں سے کس کس کو چھوڑا اور تعلیم میں اور تربیت میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں اور کیا کیا سرانجام ہوئیں، مرضیات خداوندی کے بجالانے پر تہہ دل سے شکریہ ادا کرے؛ تاکہ موافق وعدہ خداوندی "لئن شکرتم لازیدنکم" اور ترقی ہو، اور ارتکاب معاصی پر دل

(۱) مجالس ابرار، تحفہ مدارس: ۲/۱۱۱

سے توبہ واستغفار کرے؛ تاکہ بشارت یعنی ”طوبی لمن وجد فی صحیفته استغفارا کثیرا“ میں داخل ہو اور کوتاہیوں کو دفع کرنے کی دل وجان سے کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ سے بصد عاجزی والحاح التجا کرے کہ مرضیات بجالانے کی توفیق عنایت فرمائیں اور نامرضیات سے اجتناب نصیب فرمائیں اوراسی پرعمر بھر قائم رکھیں اوراسی پر خاتمہ فرمائیں ”وما ذلك علی الله بعزیز“ خلاصہ یہ ہے کہ کچھ دیر تک ضرور خلوت اختیار کرے اور مذکورہ بالا کاموں کو بجالائے تاکہ نورِ باطن نصیب ہواور بہت سی آفتوں سے نجات ہو۔

۲۹۔ خلوت بالامرد سے بہت اجتناب کرے اور امرد خوبصورت سے بہت ہی سخت اجتناب کرے ہرگز ان کے ساتھ خلوت نہ کرے اور جلوت میں بھی ضرورت سے زیادہ بات چیت نہ کرے نہ ان کی طرف قصدا دیکھے اور نہ ان کی بات نفس کے تقاضہ سے سنے؛ کیوں کہ امرد پرستی کا مرض اسی طرح پیدا ہوتا ہے کہ پہلے بالکل پتہ نہیں چلتا اور جب جڑ مضبوط ہوجاتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کنارہ کشی امرد سے بہت دشوار ہوگئی ہے۔

اپنی پاکدامنی پر ناز نہ کرے، کہ میں بھلا اس مرض میں کہاں مبتلا ہوسکتا ہوں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ”إن النفس لأمارة بالسوء“ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے امام محمد رحمہ اللہ کے رخ پر جب تک وہ امرد تھے نظر نہ ڈالی، حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں دنیا میں سوائے نفس کے کسی سے نہیں ڈرتا تو ہم تم اپنے پاک ہونے پر کیا ناز کرسکتے ہیں۔

۳۰۔ طلبہ کی صحت کے لئے اور ان کی فراغت کے لئے برابر دعا کیا کرے؛ تاکہ اپنے دین کی کھیتی کرسکے۔

۳۱۔ اگر طلباء سے کوئی بات خلاف طبیعت پیش آئے اور باعث ملول ہو تو یہ خیال کرے کہ ان سے دین کا نفع مجھ کو بہت ہورہا ہے، اور معاف کردینے سے اور بھی اللہ

میاں کے یہاں قرب بڑھے گا۔(۱)

ہدایات برائے طریقہ تعلیم

۱۔ جہاں کتاب نہ سمجھ میں آئے تو باتیں نہ بنائے؛ بلکہ صاف کہہ دے کہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتا ہے، دوسرے وقت کتاب دیکھ کر یا کسی سے پوچھ کر بتاؤں گا جب معلوم ہو بتلا دے۔

۲۔ اگر شاگرد کوئی بات بیان کرے اور وہ حق ہو تو بلا تکلف فوراً مان لے، ٹال مٹول نہ کرے۔

۳۔ پڑھائے گئے سبق کی بہت نگرانی کرے۔

۴۔ پڑھانے کے وقت نہ اوروں سے باتیں کر کے ان کا نقصان کرے اور نہ ان کو فضول باتیں جو کتاب سے متعلق نہ ہوں بتلا کر ان کا حرج کرے۔

۵۔ ہر کتاب پڑھنے کا جو نفع ہو اتنی لیاقت پیدا کرا کر تب اگلی کتاب شروع کرا دے۔

۶۔ ان کے ہر فضول سوال کا جواب نہ دے؛ بلکہ اگر فضول سوال ہو تو ان کو ڈانٹے اور سزا دے۔

۷۔ اس کا خیال رکھے کہ سوال سے زیادہ جواب نہ دیں جتنی باتوں کا سوال ہو اتنا ہی جواب دیا کریں۔

۸۔ نیچے کی کتابوں میں اوپر کی باتیں نہ بتا دے اس سے طالب علم پریشان ہوگا اور جو ضروری باتیں کتاب کے سبق میں ہوں گی انہیں بھی نہ یاد کر سکے گا۔

۹۔ پڑھاتے وقت ہر طالب علم کی طرف توجہ کرے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

۱۰۔ ہر کتاب کا خلاصہ بیان کر دے، خصوصاً جو سبق ہوا اور گذشتہ سبق کو اختصاراً بیان کر دیا کرے؛ تاکہ طالب علموں کو خلاصہ کتاب سے آگاہی ہو جایا کرے اور یادداشت میں سہولت و آسانی ہو جائے اور روزانہ سبق میں یہ بیان کر دیا جائے

---

(۱) مجالس ابرار، تحفہ مدارس: ۱۲۶/۲

کہ آج کے سبق میں یہ فلاں فلاں باتیں یاد کرنے کی ہیں اور خلاصہ ان کا یہ ہے کہ طالب علم کثرت مضامین سے گھبرائے نہیں اور مضامین ذہن میں محفوظ رہیں اور ہر کتاب اور ہر سبق کے نئے مضامین پر انہیں مطلع کر دے اور ہدایت کر دے کہ نئے مضامین کو الگ نوٹ کر کے یاد کریں۔

۱۱۔ کتابوں میں جو مسائل کی مثالیں ہیں انہیں پر کفایت نہ کرے؛ بلکہ اور بہت سی مثالیں صحیح وغلط بنا کر انہیں دکھا دے اور صحیح وغلط کی ان سے تمیز کرا دے، مثلا "دخلت فی المسجد" میں اعراب ان سے دلوا دے یا خود اعراب دے کر ان سے تصحیح کرا دے؛ تاکہ مسائل کی خوب مشق ہو جائے۔

۱۲۔ طالب علموں کو مطالعہ کرنے کا سبق یاد کرنے کا آموختہ کی نگرانی کا طریقہ سکھلائے، اگر اس کی پابندی نہ کریں، تنبیہ کرے اور بغیر طریقہ بتائے ہوئے مارنا ظلم ہے۔

۱۳۔ جس فن سے مناسبت نہ ہو وہ طلبہ کو نہ پڑھائیں اگرچہ ان کے سرپرستوں کی تاکید ہو؛ کیوں کہ وہ فن پڑھانا ان کا وقت ضائع کرنا ہے۔

۱۴۔ اخلاق رذیلہ وجمیلہ کے امثال قرآن وحدیث سے چھوٹے چھوٹے جملے نکال کر معرب مبنی اعراب عامل معمول وغیرہ کی مشق کرا دیں؛ تاکہ قواعد کی بھی مشق ہو جائے اور ادب بھی آجائے اور حدیث کا علم بھی ہو جائے اور حدیثیں ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائیں۔

۱۵۔ مسائل وقواعد کی تقریر طلبہ سے کرا دے؛ تاکہ ان کی زبان کھلے۔

۱۶۔ بغیر مطالعہ سبق نہ پڑھائیں؛ مگر مطالعہ کرنے کا امتحان کر لیں اس طرح پر کہاں تک پڑھو گے، اگر ایسی جگہ بتائے جہاں پر بات تمام ہونے کو ایک جملہ باقی ہو یا سوال کر لے کسی مسئلہ کی علت کا جو بعد میں بیان ہوا گر وہ کچھ نہ بولے تو سمجھو کہ اس نے مطالعہ نہیں دیکھا، یا دیکھا ہے، مگر بغیر غور وفکر کے۔

۱۷۔ تھوڑا پڑھائیں؛ مگر مطالعہ خوب کرا دیں، یہ نہ خیال کریں کہ زیادہ زیادہ پڑھائیں،

کتاب جلد ختم ہوجائے؛ کیوں کہ کتاب ہی ختم کرا کرکیا کریں گے، جب سمجھیں گے نہیں یا یاد نہ رکھیں گے اور یہ بھی نہ خیال کریں کہ دوسری کتاب میں سمجھالیں گے؛ کیوں کہ شاید دوسری کتاب پڑھنے کا موقعہ نہ ملے اور یہ مثل پیش نظر رکھیں کہ جو تھوڑا پڑھتا ہے وہ تھوڑے دن میں پڑھتا ہے اور جو زیادہ پڑھتا ہے وہ زیادہ دن میں پڑھتا ہے، وجہ ظاہر ہے کہ جو زیادہ پڑھے گا وہ مطالعہ ٹھیک طور پر کرے گا اور نہ آموختہ کی نگرانی کر سکے گا، نہ اچھی طرح سمجھے گا اور آموختہ کا اختصار ان سے بیان کردے گا اور اس کا اکثر ان سے سوال کرلیا کرے یہاں تک کہ آموختہ ازبر ہوجائے۔

۱۸۔ استاذ کو چاہئے کہ صرف میں جو افعال باعتبار صحیح مہموز و معتل وغیرہ کے گیارہ قسم پر ہیں ہر ایک کی ایک ایک گردان صرف صغیر کی ایک ایک گردان صرف کبیر کی خوب یاد کرادیں، اور ان کی تعلیلیں خوب مشق کرادیں اور اشعار عربیہ دعائیہ وصلواتیہ یاد کرادیں؛ تاکہ ادب بھی آجائے اور دعا و درود جو مغز عبادت ہے یہ بھی حاصل ہوجائے اور انہیں جب ذوق وشوق ہو تب ان اشعار کو پڑھ کر دعا بھی مانگ لیں اور علم نحو میں عامل معمول کی خوب مشق کرادیں؛ کیوں کہ اس کی مشق کی بہت ضرورت ہے۔(۱)

۱۹۔ کسی طالب علم کے متعلق ایسے طالب علم کا سبق نہ کرے کہ ان دونوں میں یارانہ اور دوستانہ تعلق ہونے کا احتمال ہو، اگر غلطی اس خیال میں ہوگئی کہ سمجھا تھا کہ نہ ہوگی ؛مگر ہوگئی تو بعد علم فوراً ان کا تعلق سبق وغیرہ کا چھڑا دے اور ان کو آپس میں بات چیت سلام وکلام سے منع کردے، اگر یہ علاج کام نہ کرے تو ایک کو نکال دے، اگر گندہ تعلق معلوم ہوجائے تو دونوں کو نکال دے۔

۲۰۔ اگر شاگرد مغموم ہو اور استاذ کو معلوم ہو کہ یہ اس خیال سے غمگین ہے کہ میں ناخوش

(۱) مجالس ابرار، تحفۃ المدارس: ۲/ ۱۳۳

ہوں یا اس کی طرف سے میرا گمان برا ہے اور واقع میں استاذ جی کے دل میں کچھ نہ ہو تو شاگرد پر اظہار کردے کہ میرے دل میں کچھ نہیں ہے؛ تا کہ اس کا غم جاتا رہے۔

۲۱۔ خود آزاد رہے اور انہیں بھی آزاد رکھے یعنی تعلیم وتربیت واصلاح کا تعلق تو رہے اور خوب دل سے رہے، اس کے علاوہ اپنے کسی کام کی وجہ سے ان کی آزادی میں خلل نہ ڈالے اور نہ ان کے کام کی وجہ سے اپنی آزادی میں خلل ڈالے، اپنے کام کے واسطے ان کو مجبور نہ کرے اور نہ ان کے کام کے واسطے خود مجبور ہو، اپنی مصلحت کے خلاف نہ ہو اور ان کا بھلا ہو تو کردے اور اپنا بھلا ہو اور ان کی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو کرالے، جیسے بہشت میں لوگ رہیں گے ویسے ہی رہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ مدرسہ کے مدرسین کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''جو کتاب آپ کو سپرد کی گئی اس کے مصنف کو ایصال ثواب کرنا چاہئے ، اگر ایک قرآن کریم مکمل پڑھ کر بخش دیا جائے تو انشاء اللہ زیادہ فائدہ ہوگا، باوضو رہنے کا اہتمام کریں، پہلے زمانہ میں قدوری کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا تھا کہ حاملہ عورت کو جب ولادت کا وقت قریب ہوتا اور دردزہ شروع ہوتا تو اس کے سرہانے قدوری رکھ دی جاتی تھی اس کی برکت سے ولادت بہت سہل ہوجاتی، اور جو کتابیں پڑھانا شروع کریں تو اس کے مصنف کے حالات مختصر طلبہ کے سامنے بیان کردیا کریں، سن ولادت، سنِ وفات، فقہی مسلک، اہم اساتذہ، اہم تلامذہ، کتاب کی خصوصیات بیان کردیا کریں''(۱)

اور ایک جگہ مدرسین کو تدریس کے سلسلے میں نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''مصنف کتاب کو وقتاً فوقتاً ایصالِ ثواب کریں، باوضو رہیں، سبق میں

(۱) تربیت الطالبین: ۲۶۳

جانے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ لیں تو بہتر ہے، معمولات کی پابندی کریں، یہی ترقی کا زینہ ہے، طلبہ پر خاص طور سے اور مخلوق پر عام طور پر شفقت رکھیں، مہربانی کا معاملہ کریں، ان کو اپنا محسن تصور کریں، غلطیوں اور کوتاہیوں پر صبر و تحمل کریں'' (۱)

اور ایک جماعت نئے فارغین کو جو آئندہ مصروفِ تدریس ہوں گے نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ عہدہ طلب نہ کرنا کہ مجھے یہ کتاب پڑھانے کے لئے دو وغیرہ۔

۲۔ پیسے مت مانگنا کہ میری تنخواہ اتنی کردو۔

۳۔ اگر کوئی کہے کہ یہ لائق نہیں تو دل سے اس کا اقرار کرنا اور کہنا کہ ہاں بھئی میں تو بالکل لائق نہیں؛ مگر مدرسہ والوں نے بٹھا دیا ہے، اللہ مجھے اس کی لیاقت دے اور کتب کا حق ادا کرائے۔

۴۔ کوئی طالب علم سوال کرے تو شفقت سے اس کا جواب دینا اگر چہ وہ اس طعن سے سوال کرتا ہو۔

۵۔ کسی جگہ کتاب سمجھ میں نہ آئے تو دو رکعت صلاۃ الحاجت پڑھ کر دعا مانگنا اور مصنف کتاب کو ایصال ثواب کرنا بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔

۷۔ طلبہ سے خدمت نہ لینا، حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ میں اپنے کسی مرید یا شاگرد سے خدمت لینا حرام سمجھتا ہوں۔

۸۔ طلبہ سے اختلاط نہ ہونا چاہئے، اسلئے کہ اس میں مختلف اغراض سے لوگ آتے ہیں۔

۹۔ طلبہ کا احسان مانو کہ انہوں نے اپنے قلوب کی زمین تمہارے علم کے لئے ہموار کی ورنہ تمہارا علم یونہی رہتا، تمہارا ان پر احسان نہیں۔

---

(۱) حوالہ سابق: ۲۶۴

۱۰۔ طلبہ مختلف اغراض سے اشکال کرتے ہیں کوئی اپنے کو نمایاں کرنے کے لئے کوئی استاذ کو دق کرنے کے لئے وغیرہ مگر سب کا جواب علی اسلوب الحکیم دینا، مناظرہ نہ کرنا۔

۱۱۔ مصنف کو تین مرتبہ قل ہو اللہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتے رہنا۔

۱۲۔ اگر کوئی بات سبق میں غلط کہدی جائے تو اس سے رجوع کرنے میں تأمل نہ کرنا۔

۱۳۔ سبق کی مشغولیت کی وجہ سے ذکر وغیرہ معمولات کو ترک نہ کرنا۔

۱۴۔ مطالعہ کے بغیر کوئی کتاب نہ پڑھانا۔(۱)

---

(۱) تربیت الطالبین:۲۹۶

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کا طرز تدریس

آپ قوت اجتہاد، قابلیت استنباط، خوبی تطبیق وارتباط، جودت ذہن، اتقان وعدالت، حافظہ وثقاہت، تقدس وتبحر، تقاریر وسلامت بیانی، فراست وہمہ دانی، حلم ورفق، لطف وشفقت، خندہ روئی وکرم گستری، مسکین نوازی اور طلبہ کی گستاخ وبیجا حرکات پر صبر وتحمل، حضرت کے درس حدیث میں یہ خاص برکت تھی کہ مضمون حدیث سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا، یہ خاص روحانی اثر تھا کہ یہ تحدیث کتابی نہیں بلکہ حضرت اقدس سرہ کے دل صفا منزل کے سامنے ایک آئینہ لگا ہوا ہے جس میں صاحب حدیث علیہ السلام کے انوار کا عکس پڑتا ہے، اس کا انعکاسی تجلی سے حضرت اپنے طلبہ کو متمتع فرمارہے ہیں، آپ کی تدریس میں ایسا محویت کا عالم ہوتا تھا کہ بے اختیار دل خواہش کرتا کہ کاش تقریر کا سلسلہ دیر تک ختم نہ ہو، حضرت کی تقریر سلیس عام فہم ہوتی تھی کہ پاس بیٹھے ہوئے عامی لوگوں کو بھی حرفا حرفا سمجھ میں آتی اور دل کے کواڑ کھولتی چلی جاتی تھی، اسناد حدیث کے متعلق پوری تحقیق فرماتے، اختلافات احادیث اور تعارض کے متعلق مختصر مگر جامع تطبیق فرماتے تھے۔ تقریر میں ایک یہ عجیب کرامت تھی کہ وسیع تقریر اور بلیغ تحقیق کی طرف دیکھا جاتا تو خیال ہوتا تھا کہ سبق بہت کم ہوا؛ لیکن اوراق

وصفحات شمار کئے جاتے تو حیرت ہوتی کہ اس قدر سبق کیوں کر ہو گیا، آپ کی تقریر کے بعد حواشی بالکل نکمے معلوم ہوتے تھے، اور یوں خیا ل ہوتا کہ جب رسول مقبول ﷺ یا آپ کے صحابی نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہوگا تو ہمارے حضرت وہیں کسی جگہ کھڑے سن رہے ہوں گے۔

حضرت امام ربانیؒ صحاح میں سب سے پہلے عموماً ترمذی شریف شروع کراتے تھے، اور ما لہ وما علیہ کی تحقیق کے ساتھ واضح تقریریں فرما کر طلبہ کے ذہن نشیں نکر دیا کرتے تھے، ہر ہر حدیث کا ترجمہ اور معنی مطلب سلیس اور عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے اور نفس مطلب کو ایسا کھول دیا کرتے تھے کہ گوشت یا پوست اور چھلکے سے مغز اور گودے کو نکال کر سامنے رکھ دیا اور اس کے بعد احادیث کا باہم یا حدیث کا کسی آیت قرآن سے تعارض ہوتا تو اس کا دفع فرماتے اور مطابقت اور موافقت ظاہر فرماتے تھے، بقدر ضرورت اسماء الرجال ذکر فرماتے اور اس کے بعد حدیث کی بات سے مناسبت بیان کرتے تھے، باہم عبارت اور سیاق وسباق میں ارتباط مخفی ہوتا تو اسکو کھولتے اور ایک مضمون کو دوسرے مضمون سے ربط دیتے تھے، اگر کوئی حدیث دیگر کتب حدیث کے معارض ہوتی تو ان کو بھی تطبیق دیتے ، اصول حدیث اور اصول فقہ اور عبارات کے اشارات بھی بیان فرماتے تھے، مشکل مقامات کو متنبہ کر کے کئی کئی بار بیان فرماتے اور اس پر اگر طلبہ مکرر پوچھتے یا بیجا سوال اور اپنی غلطی پر ناحق اصرار کرتے تو ہرگز چیں بجبیں نہ ہوتے۔
ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوتی تھیں، ان کتابوں کے درس میں حدیث کا ترجمہ نہ ہوتا تھا صرف جو حدیث نئی یا

مؤلف کی عبارت آتی، اس کی توضیح مثل بیان گذشتہ فرماتے اور باقی حدیثوں کی قراءت پر اکتفا فرمایا کرتے تھے۔

حضرت امام ربانیؒ تو ہر وقت ہی باوضو رہتے تھے؛ مگر درس کے وقت خصوصیت کے ساتھ اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ ابتداء سے انتہا تک ایک حرف بلا وضو نہ ہونے پائے اور باضو رہنے کی طلبہ کو صراحۃ وکنایۃ تاکید فرماتے تھے، اسی طرح آپ کی پیشانی ہر وقت خندہ تھی اور آپ ہنس مکھ رہتے تھے، ہر شخص کے ساتھ خلق سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش آتے تھے، مگر پڑھاتے وقت تو طلباء سے بالکل بے تکلف اور ظریف الطبع ہوجاتے۔(۱)

حضرت امام ربانی قدس سرہ کا درس کچھ عجیب ہی درس تھا، ہمیشہ طلبہ کی استعداد کے موافق کلام کرتے اور ہر شاگرد کی قابلیت اور سمجھ کے انداز پر گفتگو فرماتے تھے، اس میں شک نہیں کہ آپ کا درس اس زمانہ کے تمام اساتذہ میں طلبہ کے لئے سب سے زیادہ نافع اور مفید تھا، عقد ہائے مشکلہ اور عبارات مغلقہ کو بسہولت حل کرتے اور سہل ترین الفاظ میں سمجھا دیا کرتے تھے، حدیث سے مسائل کا استنباط اور استخراج فرماتے اور مذاہب بیان کیا کرتے تھے، دوسرے مذہب کی کافی تقریر فرما کر امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی ترجیح بیان فرماتے اور شافی دلائل وبراہین سے اس درجہ مدلل فرماتے تھے کہ شمس فی نصف النہار روشن ہوجاتا۔

کسی طالب علم کی زبان سے کسی محدث پر اعتراض یا تنقیص شان کا کلمہ سنتے تو چہرہ پر کراہت کا اثر پیدا ہوتا اور دوران سبق بجائے ترجیح مذہب حنفیہ مذاہب دیگر امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کی وجوہ ترجیح بیان فرمانے لگتے، تاکہ طلبہ کو محدثین کے ساتھ حسن ظن پیدا ہوجائے اور جہاں یہ بات پیدا ہوگئی تو ترجیح حنفیہ کی طرف متوجہ ہوجاتے۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ الرشید: ۸۸-۸۹-۹۰ طبع قدیم، بلالی سٹیم سادھورہ میں طبع ہوئی

(۲) تذکرۃ الرشید: ۹۲

حضرت خلیل احمد سہارنپوریؒ کی درسی خصوصیات

حضرت مولاناؒ کا درس وتدریس میں ایک نظریہ تھا وہ پورے سال یکساں طور پر پڑھنے کا تھا، بہت سے مدرسین کا جو یہ قاعدہ ہے کہ شروع سال میں طویل طویل بحث کرتے اور میں کتاب پوری کرنے کی خاطر ورق گردانی اور مختصر بحث کر کے کورس پورا کردیتے ہیں، ایسے قاعدے اور طرز تعلیم کے آپ مخالف تھے، فرماتے بھی تھے، اور خود اپنے دور درس وتدریس میں اس توازن اور یکسانیت پر عمل بھی کیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب زید مجدہ ارشاد فرماتے ہیں،:

میرے حضرت اس کے شدید مخالف تھے کہ ابتداء میں لمبی تقریریں کی جائیں اور آخری رمضانی حافظ کی طرح ورق گردانی کی جائے، اس سلسلہ میں حضرت قدس سرہ نے اکابر مدرسین کو مجمع میں ڈانٹا ہے کہ مجھے یہ طرز بہت ناپسند ہے، میرے حضرت قدس سرہ کے یہاں جب تک ترمذی شریف، بخاری شریف مستقل ہوتی رہی اور صبح کے پہلے دو گھنٹوں میں سبق تھا، ماہ صفر کے کسی حصہ میں ترمذی شریف ختم ہوجاتی تھی، اس کے ختم ہونے کے بعد اس کی جگہ بخاری شریف شروع ہوجاتی تھی، اول کے چند ایام چھوڑنے کے بعد حضرت قدس سرہ جب سبق شروع کراتے تو جہاں سبق کے شروع کا نشان رکھا ہوا ہوتا تھا سبق کے شروع میں اس نشان کو نکال کر اور پانچ ورق گن کر پانچ ورق کے بعد وہ نشان رکھ دیتے تھے، مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اور بارہا اس کو بہت غور سے دیکھا کہ دوسرے گھنٹے کے ختم پر وہ پانچ ورق بھی ختم ہوجاتے نہ تو کبھی گھنٹہ بچتا نہ کبھی ورق بچتا، میں بہت کثرت سے اس منظر کو غور کرتا رہا، اس میں احکام کے ابواب بھی آتے تھے، اور رقاق وآداب کے بھی آتے تھے، تقریر بھی کم وبیش ہوتی تھی؛ لیکن ان پانچ ورقوں میں تخلف نہیں ہوتا تھا۔(۱)

حضرت شاہ اسعد اللہ صاحبؒ کی درسی خصوصیات

یہاں بطور تذکیر کے حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحب رحمہ اللہ ناظم اعلی جامعہ

(۱) حیاتِ خلیل: ۲۵۸، مکتبہ یحیوی سہارنپور

مظاہر العلوم سہارنپور کے درسی خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱) تمام علوم وفنون میں مستحضر ہونے کے باوجود آپ جو سبق بھی پڑھاتے، پہلے اس کا مطالعہ ضرور فرماتے، خواہ چند ہی منٹ مطالعہ فرمائیں، بغیر مطالعہ آپ کوئی سبق نہیں پڑھاتے تھے، اور طلبہ کو بھی اس کی تاکید فرماتے کہ بلا مطالعہ سبق ہرگز نہ پڑھیں، مطالعہ میں درسی مباحث کے اقوال ودلائل اور حوالجات پر نظر ضرور ڈالتے، خواہ آپ کو وہ سب چیزیں یاد ہوتیں۔

۲) سبق کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی بلا تاخیر آپ درسگاہ میں پہنچ جاتے، اور طلبہ کی حاضری لے کر فوراً سبق شروع کروادیتے، اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی سبق ختم ہوجاتا، اگر کوئی بحث ناتمام رہ جاتی تو اگلے دن اس کو ابتداء سے انتہا تک مکمل فرماتے۔

(۳) عبارت کی صحت ودرستگی پر بہت زور دیتے، نحوی قواعد کے اعتبار سے بھی اور تلفظ وادائیگی کے اعتبار سے بھی ان کے یہاں عبارت کا صحیح ہونا انتہائی ضروری تھا، خصوصاً حدیث کی عبارت میں قواعد نحویہ وصحتِ تلفظ کے ساتھ قواعد تجوید کی رعایت بھی ضروری تھی، ہمزہ وصلی کو درج کلام میں گرانا اور نون قطنی کا تک پڑھنا ضروری تھا، اس کے علاوہ صحابہ کرام کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہم صاف صاف کہنا، اور رسول اللہ ﷺ کے ذکر شریف پر درود پاک صحیح صحیح اس طرح پڑھنا ضروری تھا کہ سننے والے کو محسوس ہو کہ پڑھنے والا درود پاک سے لطف اندوز ہو رہا ہے، آپ تنبیہ فرماتے کہ رسول اللہ، نبی اللہ اور آپ کا اسم گرامی کو بہت ہی صحت وادب وعظمت کے ساتھ اس طرح والہانہ انداز میں ادا کریں کہ اس کی لذت وحلاوت محسوس ہونے لگے، اسی طرح درود پاک بہت ہی مزے لے لے کر پڑھا کریں، بار بار تنبیہ کے باوجود بھی طلبہ عبارت میں غلطیاں اور اصول کی خلاف ورزیاں کرتے تو آپ ناراض ہوجاتے، بعض مرتبہ آپ اتنے متاثر ہوتے کہ سبق بند کردیتے، پھر جب کوئی ایک طالب علم عرض کردیتا، حضرت معاف فرمادیجئے تو فوراً

خوش ہوجاتے ،معلوم ہوتا کہ ناراض ہی نہ تھے ، اور پوری شفقت کے جذبہ کے ساتھ سبق شروع فرمادیتے ،عبارت پڑھوائی ،اس نے بھی غلط پڑھی ،آپ خفا ہوکر کمرہ میں چلے آئے ہیں، میں فورا پیچھے پیچھے آیا اور عرض کیا حضرت ہمیں معاف فرمادیجئے ،آپ اس لفظ کو سنتے ہی راضی ہوگئے ،اور درسگاہ میں واپس تشریف لے آئے ،اسی اہتمام کی وجہ سے آپ کے سامنے عبارت پڑھنے کی طلبہ ہمت نہ کرتے تھے ؛ بلکہ بعض فضلاء واساتذہ جو سبق میں اجازت لے کر شامل ہوجاتے عبارت پڑھنے کی ان کو بھی ہمت نہ ہوتی ، بندہ کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی ، دورہ حدیث کے سبق میں اسی ارادہ سے کہ حضرت اگر ماریں گے بھی تب بھی عبارت ضرور پڑھا کروں گا ،اول ہی دن سے عبارت پڑھنی شروع کی ،اور آخری دن تک پڑھتا رہا، طحاوی شریف کی اکثر عبارت ، ابوداؤد کی اکثر عبارت ، اور موطا امام محمد شریف کی پوری عبارت ، الحمد اللہ بندہ ہی نے پڑھی تھی ، درمیان میں بہت سے طلبہ نے شروع کی ،اور نباہ نہ سکے ،میرے ساتھ مولوی عبدالکریم صاحب آسامی نے البتہ کافی دنوں تک عبارت پڑھی تھی ،حضرت شیخ کے درس بخاری شریف میں بھی سہ ماہی امتحان تک عبارت پڑھی تھی ،لیکن عبارت اسی انداز میں پڑھتا تھا جو حضرتِ والا کے درس میں سیکھا تھا، حضرت شیخ رحمہ اللہ نے سہ ماہی کے بعد فرمایا: او قاری صاحب ہمارے یہاں تو عبارت رواں دواں ہوتی ہے ، تیرے بس کی نہیں ، چنانچہ بخاری شریف کی عبارت اور دوسرے تیز رو ساتھی پڑھتے رہے ، اور ہم ختم بخاری تک سامع بنے رہے ۔(حضرت مولانا نسیم احمد صاحب غازی مظاہری مراد ہیں ، جو اس کتاب کے مصنف ہیں)

۴) حضرت والا لغوی تحقیق اور اسماء الرجال کے صحیح ضبط کا بھی اہتمام فرماتے تھے ، لغوی کلیات اور مواد کلمات کی کلیات مفسر بیضاوی وصاحب کشاف کے طرز پر عموما طلبہ کو بتاتے تھے ، اس سلسلہ میں قرآنی آیات سے استدلال فرماتے ؛ بلکہ بعض

قواعد کا قرآن مقدس کی روشنی میں استنباط فرماتے، مثلاً ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ لفظ ''سوء'' جب مضاف ہوگا تو بضم السین ہوگا جیسا کہ قرآن پاک میں ''سُوءُ الحِسَابِ'' ہے اور جب مضاف الیہ ہوگا تو بفتح السین ہوگا جیسے کہ ''عَلَيهِمْ دائرةُ السَّوءِ'' اور شاعر کے قول ''إذا كان الطباع سوء'' میں ہے اور اگر نہ مضاف ہو نہ مضاف الیہ تو اس صورت میں بضم السین ہی ہوگا۔

۵) عبارت کا ترجمہ ایسا سلیس و شستہ ہوتا کہ مطلب تک ذہن پہنچ جاتا، ترجمہ میں ضمائر کے مراجع کا مکمل اظہار فرماتے، مطالب و معانی اور مفاہیم ایسے صاف ستھرے اور مختصر انداز میں بیان فرماتے کہ طلبہ الفاظ کتاب سے معانی کتاب سمجھتے، اور اس میں کوئی دشواری نہ ہوتی، تقریر اتنی مختصر نہ ہوتی کہ تشنگی رہ جائے، اور اتنی طویل بھی نہ ہوتی کہ مطلب خبط ہوجائے ہاں دوران درس علمی وادبی نکتوں کا خوب بیان فرماتے، زوائد اور فضولیات سے آپ کا بیان مبرا اور پاک ہوتا، ہاں فوائد و حکم آپ خوب بیان فرماتے، اور اس سلسلہ میں آپ کے تفردات بہت تھے، جو بحمد اللہ ہمارے پاس حضرت والا کی تقاریر میں محفوظ ہیں۔

٦) ائمہ کے اختلافات کا بیان فرما کر سب کے دلائل بیان فرماتے، اور احناف کے مسلک کو دلائل نقلیہ و عقلیہ سے مبرہن فرماتے تھے، آپ کے عقلی دلائل بڑے مضبوط و عجیب فیصلہ کن ہوتے تھے، پوری تقریر (تائید و تردید) میں ائمہ کرام وشراح حدیث کا احترام ملحوظ رہتا، بیان میں کبھی تعلّی کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔

قدیم وجدید فرق باطلہ کی تردید بھی خوب فرماتے، مگر اہل باطل کی بھی توہین نہ فرماتے، ہر فرقہ اور ہر مذہب کے مقتداؤں کا ذکر احترام سے کرتے، اور تاکید فرماتے کہ کسی کی توہین نہیں کرنی چاہئے، ہاں حق کی تائید اور باطل کی تردید یقینا ضروری ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ غیر مسلم اور شیعہ حضرات تک بھی آپ سے محبت وعقیدت رکھتے تھے، حالانکہ آپ مناظروں کے میدانوں میں ان سے نبرد آزما

رہے تھے۔

۷) اگر کوئی طالب علم سوال یا اعتراض کرتا تو اس کو بغور سنتے، اگر اعتراض غلط کیا جاتا تو اس کے اعتراض کی اولاً غلطی ظاہر فرماتے، پھر اس کو درست کرتے، کہ اس طرح کہنا چاہئے تھا، اور اس کا معقول جواب دیتے، اگر اعتراض نامعقول کیا جاتا یا ایسا کوئی سوال کرلیا جاتا جس کا جواب آپ دے چکے تھے، تو مسکرا کر اس کو تھوڑا سا اس طرح بناتے تھے کہ سب طلبہ کی طبیعت میں تازگی پیدا ہوجاتی، اور پھر ارشاد فرماتے کہ ہم ابھی اس کا جواب اس طرح دے چکے ہیں، یا یہ اعتراض مناسب نہیں ہے۔

۸) اگر کوئی مسئلہ کی کما حقہ تحقیق نہ ہوسکی تو برملا اس کا اظہار فرماتے، اور جب تک حضرت کے اساتذہ حیات رہے تو درس چھوڑ کر کتاب لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے اور طلبہ کی موجودگی ہی میں نہایت ادب کے ساتھ ان کو جا کر دریافت فرمالیتے اور واپس آکر طلبہ کو بتادیتے تھے، کسی لغت میں اشکال ہوجاتا تو فوراً لغت دیکھ کر طلبہ کو بتاتے، غرض کبر وتعلّٰی سے آپ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، اور نہ افادہ واستفادہ میں کوئی تکلف تھا۔

۹) اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسا سوال کرلیا جس کے جواب کی تحقیق نہ تھی تو آپ صاف اعتراف فرمالیتے، اور لا ادری (مجھے معلوم نہیں) کہنے میں آپ کو قطعاً تردد نہ ہوتا تھا۔

۱۰) دوران درس انتہائی سنجیدگی ومتانت ملحوظ رکھتے، اور غیر متعلق باتوں سے احتراز کرتے، درسگاہ، کتاب اور علم کا مکمل احترام، طلبہ پر نظر کہ وہ سبق سے غافل تو نہیں ہیں، یا ان کی نشست احترام کے خلاف اور ناشائستہ تو نہیں ہے، یہ سب باتیں ملحوظ رہتی، ہاں گاہے گاہے طلبہ میں دل چسپی وتازگی پیدا کرنے کے لئے کوئی مفید لطیفہ یا عبرت آموز واقعہ یا کوئی شعر یا چند اشعار سنادیا کرتے تھے۔

۱۱) پوری متانت وسنجیدگی کے ساتھ کبھی کبھی طلبہ سے مزاح فرما کران کو مانوس فرماتے، ایک مرتبہ طحاوی شریف کے درس میں شرکاءِ درس کی حاضری لے رہے تھے، تو آپ نے فرمایا: ''عبد الکریم'' جلدی سے مولوی عبد العزیز گونڈوی بولے ''حاضر جناب''، حضرت نے مسکرا کران کی طرف دیکھا، اوراس انداز سے کہ جماعت میں ہنسی کے پھول کھل گئے اور نشاط کی لہر دوڑ گئی فرمایا:

نہ دانش بداری نہ عقل وتمیز
دماغت خراب است عبد العزیز

۱۲) بعض خاص باتوں کو بشکل اشعار یاد کرادیتے تھے، کیوں کہ عموماً نظم کا حفظ کرنا نثر کی بہ نسبت آسان ہوتا ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات کو یاد کرنے کے لئے ایک شعر سناتے تھے:

کُن حدیثِ بوہریرہ را شمار
پنج الف وسہ صد وہفتاد وچار (۵۳۷۴)(۱)

جذبۂ افادہ استفادہ ونفع رسانی

آپ ویسے تو ہر ایک کے لئے جذبہ نفع رسانی رکھتے تھے، لیکن طلبہ کے لئے تو آپ نے زندگی وقف کردی تھی، وہ طلبہ کو اپنی بہترین اولاد اور سرمایہ حیات سمجھتے، جس کو خطاب فرماتے ''بیٹا'' کہہ کر خطاب فرماتے، ایک مرتبہ بندہ سہارنپور زیارت وملاقات کے لئے حاضرِ خدمت ہوا تو آپ یہ تذکرہ فرمارہے تھے کہ میری علمی اولاد کی اتنی نسلیں چل گئی ہیں، مجھ سے پوچھا: ''بیٹا'' آپ کی علمی نسلیں کتنی ہوگئی ہوں گی، میں نے سوچ کر عرض کیا کہ حضرت اندازہ یہ ہے کہ پانچ نسلیں ہوگئی ہوں گی، حضرت بہت خوش ہوئے، اور فرمایا الحمد للہ حق تعالی نے میری زندگی ہی میں میری علمی نسلیں دور تک چلادیں اور کئی پشتوں تک علم کا سلسلہ پہنچایا۔

طلبہ آپ سے دوران درس کے علاوہ بھی استفادہ کرتے، آپ سے درس کے علاوہ

(۱) حیات اسعد: ۲۰۰ - ۲۰۴، حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری، مکتبہ نسیمیہ مرآدآباد

کچھ پوچھنے کے لئے آتے تو ان کی بہت قدر کرتے، اور نہایت خندہ پیشانی سے ان کے سوالات کا جواب دیتے، وہ طلبہ جن کے اسباق آپ سے متعلق نہیں تھے، کسی فن کی کوئی کتاب لے کر پہنچ جاتے، آپ کو ناگوار نہ ہوتا، بلکہ پوری بشاشت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوتے، اور جب تک ان کو مطمئن نہ فرمادیتے سمجھاتے رہتے۔

جو طلبہ حضرت سے قرب و تعلق رکھتے اور حاضر خدمت ہوتے رہتے تو آپ سے بہت زیادہ استفادہ کرتے، حضرت والا خود بھی ان کے علمی نشو و نما، گفتار و کردار وغیرہ پر کڑی نظر رکھتے، اور وقتاً فوقتاً ان کا محاسبہ کرتے رہتے تھے، بعض مرتبہ ایسے طلبہ کو خود ہی کوکتاب پڑھاتے۔

چنانچہ مولانا عبدالقیوم صاحب شاکر الاسعدی لکھتے ہیں:

زمانہ طالب علمی میں یہ ناکارہ محنت نہیں کرتا تھا، گو بفضلہٖ تعالی ذہن اوسط درجہ کا تھا، حضرت والا کو بجا طور پر میری بد استعدادی کا ظن غالب تھا، اتفاق سے دیوان متنبی یا عروض المفتاح کا ہمارا امتحان حضرت والا کے پاس تھا، اتفاقاً پرچہ اچھا گیا، حضرت والا کو اس سے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، بلا کر مبارک بادی دی اور فرمایا کہ تمہارے اندر صلاحیت موجود ہے، اگر تم محنت سے پڑھو تو کچھ کام کر سکتے ہو، ورنہ اس چہار دیواری سے نکلو گے اور درس و تدریس کا مشغلہ ہوگا تو دیوار سے سر ٹکرا دینے کو جی چاہے گا، پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا: تم سے میرا ایک کام ہے، اور وہ میرا ذاتی کام ہے، کیا تم اس کو انجام دے سکتے ہو،؟ میں نے عرض کیا انشاء اللہ، ضرور انجام دوں گا، فرمایا: جانے دو تم اس کو انجام نہ دے سکو گے، تم سے کہنا فضول ہے، تم کرو گے نہیں تو کیا فائدہ کہنے سے؟

اسی طرح چند منٹ تک اصرار پر انکار فرماتے رہے، اس کے بعد فرمایا: میرا کام سمجھ کر مجھ سے کوئی کتاب دس منٹ پڑھ لیا کرو۔

طلبۂ کرام سے محبت اور تعلق

افادہ و استفادہ کے لئے طلباء اور شاگردوں کے مابین محبت و تعلق ناگزیر ہے، اس

زمانہ میں یہ چیز مفقود ہو چکی ہے، اور عموما اسکا مقام نفسانیت اور خود غرضی نے لے لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ افادہ واستفادہ کا دروازہ تقریبا بند ہو چکا ہے۔

جب تعلیمی سال ختم ہوتا، طلبہ رمضان کی کلاں تعطیل میں اپنے گھروں کو جانے کے لئے تیاریاں کرتے تو حضرت والاؒ فکر مند اور اداس نظر آتے ، اور رخصتی مصافحہ کے لئے حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت پر رقت طاری ہوتی اور بسا اوقات زار وقطار رو پڑتے۔

اور طلبہ بھی اپنے مشفق ومربی استاذ سے روتے ہوئے جدا ہوتے۔

عنایت واعانت

حضرت والا کی طبیعت خصوصا طلباء کے تعلق سے بہت زیادہ وسیع القلب واقع ہوئی تھی، خاص طور پر طلبہ کی تعلیم وتربیت کا اہتمام فرماتے، ان کو بڑی دلسوزی سے زندگی کے نشیب وفراز سمجھاتے، ان کو تدین، تقوی اور پرہیز گاری کا خوگر بناتے، آپ تمام طلبہ پر نظر رکھتے، ان کے احوال کا تفقد فرماتے، مستحقین طلباء کی بہت خاموشی سے امداد فرماتے، جن طلبہ میں علم کا ذوق وشوق اور لگن محسوس فرماتے ان پر آپ کی عنایت بہت ہوتی، اور ان کے تو گویا آپ گرویدہ ہو جاتے، راقم کا خاص تعلق حضرت والا سے دورہ حدیث کے سال ہوا تھا، لیکن میں حیران رہ گیا جب ایک دن حضرت والا نے میری مظاہر العلوم کی پنج سالہ زندگی کے تمام حالات مجھ کو سنا دیئے، فرمایا: بیٹا آپ فلاں تاریخ کو مظاہر العلوم میں آئے، فلاں فلاں کمرہ میں اتنے اتنے دنوں قیام رہا، اتنے دن بیمار رہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن حضرت والا نے دیکھا کہ میرے پیر میں ٹوٹا ہوا جوتا ہے، تو اپنے ایک مرید خاص کو حکم دیا کہ میرے بیٹے کے لئے ایک جوڑی اچھے جوتے بنا کر لائے، (ان کا جوتوں کا کارخانہ تھا) اور جو دام اوروں سے لیتے ہیں وہی ہم سے لیں، چنانچہ انہوں نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی، ایک دن ایک صاحب سے (جو کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور آپ کے پاس ہر ہفتہ حاضر ہوتے تھے) میری طرف اشارہ کر کے فرمایا: میرا بیٹا حدیث

شریف پڑھ رہا ہے، اور بہت محنت کرتا ہے، پڑھتے پڑھتے اس کی آواز بیٹھ جاتی ہے، میرے بیٹے کے لئے عمدہ گھی جو آپ کے گھر تیار ہوا ہو اور اچھا قابل اطمینان ہو ایک سیر لا دو، اور مجھے اس کے پیسے بتادو۔

حضرت والا بہت سے طلبہ کی بڑی خاموشی اور رازداری سے اعانت فرماتے تھے۔ باوجودیکہ تحائف قبول کرنے میں محتاط تھے، تنخواہ کم تھی اخراجات زیادہ۔

مولانا صدیق احمد صاحب شریف نگری نے مجھ سے بیان کیا کہ:

میں زمانہ طالب علمی میں تنگ دست تھا، مجھے اساتذہ کی تقریریں لکھنے کا شوق تھا اتفاق سے کاپی ختم ہوگئی، پیسے بھی نہ تھے، اس لئے مجھے اس کی بہت فکر تھی کہ کل اساتذہ کی تقریریں کیسے لکھوں گا؟ کسی سے قرض لینے کی عادت نہ تھی، اسی فکر میں اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ حضرت کا ایک خادم میرے پاس آیا، اور کہا کہ حضرت ناظم صاحب آپ کو بلا رہے ہیں، میں حاضر خدمت ہوا، تو کمرہ میں حضرت محمد اللہ صاحب (صاحبزادہ محترم) اور قاری احمد گورا خادم خاص اور حضرت والا موجود تھے، حضرت نے صاحبزادہ محترم سے ارشاد فرمایا: جاؤ کمرہ ۱۹ کے سامنے والے نل سے ایک لوٹا پانی لاؤ، اور پھر قاری گورا کو انہیں بلانے کے لئے بھیج دیا، اور فوراً ایک چیتھڑے میں بندھی ہوئی کوئی چیز میرے ہاتھ میں دی اور فرمایا: دیکھو کیا ہے، میں کھولا تو اس میں کچھ ریزگاری تھی، میں نے عرض کیا: پیسے ہیں، فرمایا شمار کرلو، میں نے شمار کئے تو وہ ایک روپیہ کی تھی، فرمایا: جیب میں رکھ لو، اپنے کام میں لاؤ اور کسی سے بالکل ذکر نہ کرنا۔(۱)

حضرت مولانا یوسف بنوری کا اندازِ تدریس

معروف معاشی اسکالر حضرت مولانا محمد طٰہٰ یسین مرحوم رقم طراز ہیں:

''تدریس میں مولانا بنوری کا جو طریقہ کار تھا وہ بڑی حد تک اپنے محبوب استاذ حضرت شاہ صاحب نورہ اللہ مرقدہ کے طریقۂ تدریس

(۱) حوالہ سابق: ۲۰۷ تا ۲۱۱

سے ملتا جلتا؛ بلکہ اس سے ماخوذ تھا، وہ یہ کہ زیر درس مسئلہ کے متعلق صرف ان باتوں کے بیان پر اکتفا کرتے جو کتاب، اس کے حواشی اور مطبوعہ شروح میں لکھی ہوتیں؛ بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی نادر معلومات بھی پیش فرماتے جو اس علم وفن کی دوسری کتابوں میں مذکور ہوتیں اور جن سے زیر بحث مسئلہ پر کس نے کس کتاب میں زیادہ بہتر طور پر لکھا ہے؛ تاکہ طلباء اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ انہوں نے جو پڑھا ہے وہی سب کچھ ہے، اب مزید کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں اور تاکہ وہ آئندہ مزید پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی کوشش کریں اور ان کے علم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو، بالفاظ دیگر تدریس کا وہ طریقہ یہ تھا کہ زیر درس مسئلہ کے سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی"(۱)

حضرت باندوی رحمہ اللہ کا انداز تدریس

حضرت کے درس میں ایک خاص بات عمومی طور پر یہ پائی جاتی تھی کہ خواہ چھوٹی کتاب کا درس ہو یا بڑی کتاب کا، حضرت اس کو طلباء کی تعلیمی واخلاقی تربیت کا بہترین ذریعہ سمجھتے، اور بناتے، چنانچہ حسب موقع تعلیم پر توجہ، اس کے لئے محنت، تعلیم میں کیا جذبہ ہو؟

مستقبل کے لئے تیاری وحوصلہ کی گفتگو فرماتے، نصیحتیں فرماتے، اور اس بابت اکابر کے اور ماضی کے لوگوں کے قصے سناتے، اور باجودیکہ اپنے حالات میں اخفاء ہی پسند تھا لیکن ضرورت کا احساس کر کے اپنے حالات ومجاہدات بھی سناتے، اور دوران سبق متعلقہ کتابوں کے مسائل وعبارت میں جہاں بھی کوئی مناسبت نکلتی عبرت ونصیحت کی بات فرماتے اور توجہ دلاتے۔

(۱) جمال یوسف، تدریس وتحقیق وعلوم ومعارف: ۵۷، علامہ محمد یوسف بنوری کا تذکرہ سوانح، مولانا عبد القیوم حقانی، القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرۃ

حضرت نے یہ بات اپنے اساتذہ سے سیکھی تھی، اور بعض اساتذہ نے حضرت کو اس کی وصیت اور تاکید کی تھی، یہ تو بات حضرت کے سبق میں تربیتی پہلو کی تھی۔

رہا تعلیمی پہلو: کتاب اس کے مسائل اور اس کی عبارت اور متعلقہ فن کی نسبت سے درس کا معاملہ تو اس اعتبار سے حضرت کا درس بڑا کامیاب، مفید اور نمونہ کا درس تھا، ہر فن کی کتاب میں اس کا پورا حق ادا فرماتے، محنت کرتے اور محنت لیتے اور محنت کراتے، فنی کتابوں میں سوالات قائم کرکے ان کے جوابات طلب کرتے؛ بلکہ لکھاتے اور بتاتے، چنانچہ حضرت نے متعدد فنی کتابوں کے سوالات پر مشتمل کاپیاں بنا رکھی تھیں۔

سبق میں تقریر اور بے ضرورت تفصیل کا مزاج نہ تھا؛ بلکہ توجہ واہتمام عبارت کی توضیح اور فنی بات کی تفصیل کا تھا۔

منطق کے مسائل بہت سہل اور اچھے انداز میں سمجھاتے، ہدایہ میں بھی دلائل عقلیہ کو صاحب ہدایہ کے ذوق کے مطابق بہت اچھی طرح قضایا کی روشنی میں سمجھاتے، صغری کبری حسب ضرورت بتاتے، بناتے اور ملاتے اور پھر نتیجہ کا تذکرہ فرماتے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے عموما کیا ہے۔

حضرت مولانا انتظام حسین صاحب جنہوں نے حضرت سے فتح پور میں پڑھا تھا اور قریب سے دیکھا تھا وہ فرماتے ہیں:

> ”حضرت کے سبق پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ طلباء سے پہلے عبارت پڑھواتے، درمیان میں نحوی صرفی اشکالات خود کرتے، اعرابی حالت کی وجہ بھی دریافت کرتے، طلبہ نہ بتاتے تو خود ہی بتلاتے، عبارت سے فارغ ہونے کے بعد مطلب بیان فرماتے، ترجمہ طلبہ سے ہی کراتے، بعض کتابوں میں سبق کے ختم ہونے پر سوالات لکھاتے، کبھی خود لکھ دیتے؛ تاکہ کتاب کی روشنی میں طلبہ ان سوالات کے جواب یاد کرلیں“۔(۱)

(۱) مآثر حضرت باندی: ۸۴۔۸۵۔۸۶، مولانا عبیداللہ الاسعدی، فرید بک ڈپو دہلی

حضرتؒ کے اسباق میں برکت کا ایک سبب

حضرت کے اسباق میں برکت اور افہام وتفہیم کے اعتبار سے سہولت وقدرت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ حضرت کے یہاں علم کا بڑا اہتمام واحترام تھا، اساتذہ درسگاہوں کے ادب، انتہائی توقیر وتعظیم کے ساتھ، آلات واسباب علم کا بڑا احترام تھا، کاغذ کا احترام تو معروف کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی کہیں پڑا ہوا دیکھنا گوارہ نہ تھا، فرماتے کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا کارخیر وصدقہ ہے، اس سے بھی تکلیف ہوتی ہے تو اسکو بھی اٹھانا یہی حیثیت رکھتا ہے، ایک مرتبہ کسی نے اس بابت کچھ استخفاف کا ذکر کیا تو حضرت نے فرمایا اور ایک جوش کے ساتھ ''بخدا اگر اس کی وجہ سے نجات نہ ہو تو قیامت میں دامن پکڑ لینا''۔

مطالعہ وسبق کے لئے وضو کا بڑا اہتمام تھا، اور بے وضو مطالعہ وسبق شاید و باید ہی ہو اور اس میں بھی اسکا اہتمام فرماتے تھے کہ براہ راست کتاب کو ہاتھ نہ لگاتے رومال سے پکڑتے اور اوراق کو پلٹتے۔

اساتذہ اور طلباء کے درمیان ربط وتعلق کی اہمیت

حضرت مولانا قاری طیب صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ فتن اس کی بنیاد ہیں، حالات اتنے بگڑ چکے ہیں، اور مزاج اتنے فاسد ہو چکے ہیں کہ وہ جو ایک عقیدت اور ایک محبت اساتذہ سے ہوتی تھی وہ نہیں ہے، کچھ تو حالات کا اثر ہے۔

اور مثل مشہور ہے: ''کچھ لوہا کھوٹا کچھ لوہار کھوٹا'' کی تھوڑی بہت اساتذۃ میں بھی آئی ہے، ان کو جس درجہ کا معیاری ہونا چاہئے، نئے اساتذہ میں وہ چیز کم ہے، تو طلباء پر اثر پڑنا لازمی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اساتذہ چندسالوں کے بعد پرانے بن کر کسی اونچے مقام پر پہنچ جائیں؛ لیکن ابتدائی حالت اساتذہ کی، نوجوان اساتذہ کی وہ نہیں جو ان کے اساتذہ کی تھی۔

ہم لوگوں نے تعلیم پائی، اس وقت اساتذہ علمی اعتبار سے بھی معیاری تھے، اور تقوی

وطہارت کے لحاظ بھی معیاری تھے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ (مولانا انور شاہ کشمیری) پر اتباع سنت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کے طرز کو دیکھ کر ہم مسئلہ معلوم کر لیتے تھے، اور وہی مسئلہ نکلتا تھا جو ان کا طرز عمل تھا، اس درجہ گویا وہ منہمک تھے، اور ہمہ وقت انہیں فکر آخرت ضرور رہتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ صاحب دوپہر کو چھوٹی مسجد میں آکے قیلولہ کرتے تھے، تو عموماً گھٹنے پیٹ میں دے کے لیٹا کرتے تھے، یعنی سکڑ کے، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پیر پھیلا کے لیٹے ہوں تو میرے خسر مولوی محمود صاحب رامپوری مرحوم، طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب کے ساتھ چھوٹی مسجد ہی میں رہتے تھے تو ابتداء میں وہ یہ سمجھے کہ امر اتفاقی ہے، لیکن جب دیکھا کہ عادت ہی یہ ہے تو انہوں نے ایک دن پوچھا کہ آپ پیر پھیلا کے کبھی نہیں سوتے؟ فرمایا کہ: بھائی پیر پھیلا کے سونے کی جگہ قبر ہے" دنیا نہیں، ۔۔۔۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ان کے اوپر ہر وقت فکر آخرت غالب رہتی تھی۔

حضرت مفتی صاحب ہی کا واقعہ ہے، جلالین شریف ہم نے ان کے یہاں پڑھی، آیت یہ آئی کہ "لیس للإنسان إلا ما سعی" آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے سعی کی ہے، یہ نہیں کہ کسی غیر کی سعی اس کے کام آجائے ۔۔۔۔۔ادھر تو یہ آیت اور ادھر روایت میں ایصال ثواب ثابت، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی سعی کام آئے گی، اب آیت اور روایت میں ایک قسم کا تعارض ہوتا، جب یہ آیت پہنچی تو حضرت مفتی صاحب نے کتاب میں مثبت پہلو میں مطلب سمجھا دیا اور بعد میں یہ فرمایا کہ میں اس میں الجھا ہوا ہوں، اور ابھی رفع تعارض کی صورت سمجھ میں نہیں آئی کہ حدیث بتلاتی ہے کہ دوسرے کی سعی کارآمد ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ قطعا کارآمد نہیں تو فرماتے تھے کہ کتابیں دیکھیں، رجوع کیا، کتابوں کی طرف، مگر تشفی نہیں ہوئی، گھر تشریف لائے رات کا وقت، گرمی کا زمانہ، چارپائی پر لیٹے تو خیال یہ بندھ گیا کہ تجھے ایک آیت میں شک ہے، اگر اسی حالت میں موت آگئی تو آیت خداوندی میں شک لے کر جائے گا تو تیرا ایمان کہاں رہے گا، یہ تو "ریب" (شک) کی

کیفیت ہے، بس یہ جذبہ آنا تھا کہ اسی وقت کھڑے ہو گئے، اور پیدل سفر شروع کر دیا گنگوہ کا کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ) سے جا کر تحقیق کروں گا، تو پہلا جذبہ تو اس سے معلوم ہوا فکر آخرت کا کہ وہ (اس علم کو) محض ریسرچ یا تحقیق نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اپنی آخرت سمجھتے تھے، جب آیت میں ایک قسم کا شک ہے تو وہ ریب ہوا اور ایمان میں اگر ذرا سا بھی ریب ہو تو ایمان کی بقاء مشکل ہے، یہ جذبہ تھا اصل میں، محض علمی تحقیقات نہیں تھیں، پیدل سفر کر لیا گنگوہ کا ساری رات چلتے رہے، حالانکہ عادت نہیں تھی، پیدل سفر کرنے کی، آخر شب میں گنگوہ پہنچے، صبح کی نماز کا وقت تھا، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہ وضو فرما رہے تھے، انہوں نے سلام کیا، فرمایا کون؟ عرض کیا کہ عزیز الرحمن، فرمایا کہ: اس وقت! کیا رات آئے تھے؟ کہا کہ رات بھر سفر کیا بس ابھی پہنچا ہوں، فرمایا ایسی کیا ضرورت پیش آئی تھی جو ساری رات سفر کیا، انہوں نے کھڑے کھڑے وہ اشکال پیش کر دیا کہ حضرت یہ ایک اشکال ہے کہ آیت میں نفی ہے کہ کسی کی سعی کسی کے کام نہیں آئے گی اور احادیث میں اثبات ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آجائے گا ایصال ثواب کی صورت میں، یہ تعارض رفع نہیں ہو رہا ۔۔۔۔ حضرت گنگوہیؒ نے وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ "لیس للإنسان إلا ما سعی" میں سعی ایمانی مراد ہے، یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے لئے نجات کا ذریعہ نہیں بنے گا، عمل کی نفی نہیں، تو حدیث ثابت کر رہی ہے عمل کو کہ عمل کا فائدہ پہنچے گا اور آیت نفی کر رہی ہے سعی ایمانی کی کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا، اس میں کوئی تعارض نہیں تو یہاں ایمان مراد ہے، وہاں عمل مراد ہے، آیت میں جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے حدیث میں اس کا اثبات نہیں اور حدیث جسے ثابت کر رہی ہے، قرآن میں اس کی نفی نہیں ہے تو تعارض کہاں سے آ گیا؟ تو مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے یہ معلوم ہوا جیسے ایک علم کا دریا میرے اندر پھوٹ گیا تو غزیر (وسیع) اور گہرا علم تھا ان اکابر کے ایک ایک لفظ میں۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت حدیث میں بدعت کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "من أحدث فی أمرنا هذا ما ليس منه فهو

رد"، جو ہمارے دین میں احداث کرے اور وہ چیز دین کے ذوق کی نہ ہو تو وہ چیز مردود ہے" اس پر کسی نے کہا کہ پھر یہ مدارس بھی مردود ہونے چاہئے تو، یہ قرن اول میں کہاں تھے؟ اور یہ مدرسوں کے لئے گھنٹوں کا تعین اور گھنٹا بجنا یہ کہاں تھا؟ اور یہ جماعت بندی (کلاس بندی) یہ سارے بدعات ومحدثات ہیں تو اس حدیث کی رو سے ممنوع ہونے چاہئے ، حضرت نے ایک مختصر سا جواب دیا فرمایا کہ: احداث فی الدین کی ممانعت ہے، احداث للدین" کی ممانعت نہیں۔

ان دولفظوں میں مسئلہ کھول دیا یعنی یہ احداث جو ہے "لتقویۃ الدین، لإعانۃ الدین، لنصرۃ الدین" ہے، عین دین کے اندر اضافہ نہیں ہے، کسی مدرسہ میں صبح کے گھنٹے مقرر ہیں، کسی میں شام کے، یہ نہیں کہ اس کو دین سمجھ رہے ہیں کہ یہی چار گھنٹے ہونے چاہئیں، دوسرے نہ ہوں، ایک تدبیر ہے، ایک معالجہ ہے، تو احداث للدین اور فی الدین کے فرق سے حضرت نے سارے اشکالات رفع فرمادیئے۔(۱)

تو یہ بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ ان اکابر کے یہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں، ایک ایک جملہ سے مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا، اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ استعداد نہایت قوی ہو اور استحضار ہو علوم کا، اب محنتیں تو ہیں نہیں، قوی ویسے نہیں، استحضار وہ نہیں علوم کا، جو کچھ کتاب میں دیکھا صبح کو بیان کردیا، وہ جو قلبی کیفیت ہے شامل نہیں ہوتی ، اس لئے استعدادوں پر برا اثر پڑ رہا ہے، تو نہ نصاب میں خرابی ہے اور نہ کسی اور چیز میں ؛ بلکہ کچھ طرز تعلیم کی اور کچھ اساتذہ کے ترقی نہ کرنے کی ، کہ وہ پڑھ رہے ہیں کہ بس پڑھا دیں گے، پیشہ سمجھ لیا ہے، یہ وجہ ہو رہی ہے استعدادوں کی کمی کی۔

اسلئے میں نے کہا " کچھ لوہا کھوٹا کچھ لوہار کھوٹا" کچھ اساتذہ آگے نہیں بڑھنا چاہتے، کچھ طالب علموں میں محنت کی کمی، اب وہ قصور بتادیتے ہیں نصاب کا۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب ہمارے استاذ رحمہ اللہ بہت مختصر گو تھے، کسی نے

(۱) البلاغ: حضرت قاری طیب صاحبؒ کے نصیحت پر مبنی کلمات: ۲۷-۲۸، صفر المظفر :۱۴۳۹ھ

ان سے ذکر کیا کہ حضرت نصاب میں کچھ تغیر تبدل ہونا چاہئے، تو جیسے ان کی عادت تھی، ایک لمبی سی ''ہوں'' کر کے فرمایا: دیکھو تعلیم کے سلسلہ میں تین چیزیں ہیں (۱) اساتذۃ (۲) تلامذہ (۳) تیسرا نصاب تعلیم تو اساتذہ کی جماعت تو ہے بڑوں کی جماعت، چھڑی ہاتھ میں ہے، کوئی بولے تو اسی وقت گردن زنی قرار پائے اور طلباء اس زمانے کے بھائی وہ بھڑوں کا چھتہ نہیں کوئی انہیں چھیڑے گا تو وہ آ کے لپٹ جائیں گے، آدمی ڈرتا ہے، بس صاحب اب بے چارہ بے زبان رہ گیا ہے، اسی میں کتر بیونت کرتے رہو، نصاب میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

کمی استاذ میں اور طالب علم میں نصاب میں کمی نہیں ہے، مگر بے زبان چیز ہے، اسی پر سب مشق آزمائی کرتے رہتے ہیں، تو یہ ہے اصل میں بنیاد۔۔۔ بہر حال کچھ جدید معلومات کی تو ضرورت ہے کہ طلباء نابلد نہ رہیں۔(۱)

---

(۱) حوالہ سابق

مسلم ہندوستان میں تعلیمی روایت مختلف مدارج سے گذر کر متنوع ابعاد کی شکل میں ڈھلی ہے، ایک وقت تھا کہ برصغیر میں مسلم انتظام کا دائرہ وادی سندھ، ملتان اور اس کے گرد کے علاقے میں محدود تھا، برصغیر کی مسلم تاریخ یہ عرب دور تھا، جب ہندوستان کی روایات عرب مراکز علم، کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق مکہ اور مدینہ کے ساتھ وابستہ تھیں، یہ جگہیں تعلیم و تعلم کا مرکز تھیں، جہاں برصغیر کے اصحاب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے گئے اور اپنے متعلقہ میدانوں میں اعلی مقامات کا حصول کیا، علماء کی ایک کھیپ ہے جن کے فقہ، سیرت، حدیث عربی ادب وغیرہ میدانوں میں حصے کا اعتراف شرق اوسط، عراق، عرب اور شام کے علماء نے بھی کیا ہے، عربی شاعری کے منتخب مجموعے حماسہ میں ان حضرات کے قطعات اور نظمیں شامل ہیں، جن کا تعلق سندھ سے تھا، ابوعطا سندھی اس طرح کے ایک عالم تھے جن کی بعض سطور ابو تمام نے منتخب عربی شاعر کے اس مشہور مجموعے میں شامل کی ہیں۔

اس سے عربی فہمی اور عربی کے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے استعمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سطح پر پہنچ چکی ہے، جس سے ابوعطا سندھی جیسا شاعر پیدا ہو سکے۔

عرب علمی روایات کی اصطلاح کے اعتبار سے اس کمال کی ایک مثال ابو معشر نجیب سندھی کی ہے، جو سیرت اور حدیث میں اپنے کردار کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں، اس نوعیت کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو نقل نہیں کیا جا سکتا، برصغیر کی علمی تاریخ میں یہ دور تقریبا چار صدیوں تک جاری رہا، وسط ایشاء اور افغانستان سے آنے والے لوگ اس کے وارث بنے، اور ساتویں صدی میں قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سلطنت دہلی کے قیام میں نے اسلامی

تعلیم کو ایک نئی اٹھان بخشی، اب عرب دنیا کے ساتھ تعلقات شروع میں تو کم زور ہوئے اور پھر تقریباً ختم ہوکر رہ گئے، اب ان تعلقات کو درآمد کیا جارہا تھا، جن میں زیادہ زور فقہ، اصول، عربی زبان اور اس کی گرامر پر دیا گیا، اسی عہد میں مختلف فنون کی روایتی اور مختصر متون کو ہندوستان میں لایا گیا جو دہلی اور دنیا کے مختلف حصوں کے مدارس میں قائم تعلیم و تدریس کا موضوع بن گئے، اشاعت علم اور علمی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ عہد ہندوستان کی دینی تعلیم کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں جب ابن بطوطہ نے ہندوستان کا سفر کیا تو اس نے دیکھا کہ صرف دہلی میں ایک ہزار سے زائد مدارس تھے، جن میں اعلی تعلیم ہوتی تھی، اس نے دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علماء کا مشاہدہ کیا، اس کی ملاقات شیخ عبدالعزیز اردبیلی سے ہوئی جو شام سے محمد تغلق کی دعوت پر آئے؛ تاکہ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کا مدرسہ قائم کریں، یہاں تقریباً ہر قصبے اور گاؤں میں مدارس تھے، جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں بھی اشاعت علم کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

یوں مدرسے کا کردار صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ اس کا دائرہ ہندوؤں، بدھوں اور دوسروں تک بھی رہا ہے، ابھی تک ہندوؤں کی روایت کے مطابق علم دو مختلف گروہوں میں محدود رہا ہے، مذہبی علم ایک مخصوص طبقے میں محدود، جب کہ دنیوی علم ایک دوسرے طبقے میں خاص تھا، ہندو معاشرے کے دیگر طبقات کو کسی قسم کے علم تک رسائی کی کوئی اجازت نہیں تھی، وہاں مختلف طبقات تھے، شودر طبقے کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا تھا؛ بلکہ اگر اس طبقے کا کوئی فرد بلا ارادہ بھی علم تک رسائی حاصل کر لیتا تو اس کا یہ عمل جرم اور گناہ تصور کیا جاتا تھا، اور اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر سزا دی جاتی تھی، یہ قانون ان کی مذہبی کتابوں کی دین تھا، مدرسے نے پہلی بار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں (سکھ وہاں نہیں تھے، بعد کے دور میں ایسا ہوا) جین مت کے پیروکاروں اور بدھوؤں کے لئے بھی علم کا دروازہ کھلا تھا، یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں کے تمام طبقوں نے علم حاصل

کیا، وہ فارسی زبان کے ماہر بنے جو اس وقت عدالت، ثقافت اور بازار کی زبان تھی، بدھ، فارسی اور اسلامی قانون کے ماہر بنے، جو اس وقت عدالت، ثقافت اور دیگر مذاہب کے اہل علم ایسے ہیں جنہوں نے مدرسہ کی بدولت مختلف علوم وفنون میں اپنا اثر چھوڑا ہے، تاہم اس عہد میں مدرسے کا ایک منفی پہلو یہ نظر آتا ہے کہ اس میں اشاعت علم اور آزادانہ تحقیق ومطالعے کے باب میں دل چسپی کی کمیابی یا نایابی نظر آتی ہے، اب علم کا زیادہ ارتکاز ان متون پر تھا جو وسط ایشیائی یا عرب ممالک میں کہیں تیار ہوئے، اصول فقہ، فقہ، منطق اور فلسفے کے متون ہندوستان برآمد کئے گئے، اور ان کو درسی کتابوں کی حیثیت دی گئی۔

ہندوستان کے مسلمان علماء کا حصہ جو کہ کمیت میں بڑا تھا، لیکن شروحات ہی تک محدود تھا، شروحات اور وسط ایشیا یا عرب دنیا سے آئے ہوئے متون پر حواشی پر مشتمل تھا، یہ حصہ حواشی پر حواشی اور پھر ان پر مزید حواشی پر مشتمل تھا، کئی کتابیں اس کی مثال ہیں

جب مغل ہندوستان آئے اور ہمایوں کے بعد اپنے آپ کو مستحکم کیا، تو برصغیر میں ایک اور روایت متعارف ہوئی، یہ روایت فلسفے اور منطق کی تھی جس کی ساخت پرداخت اور تانا وبانا ایران میں تیار ہوا، اب برصغیر اور مدارس کے علمی روابط ایران کے ساتھ استوار ہوئے، اور ایرانی علماء بڑی تعداد میں بلائے گئے، سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اہل علم وادب یہاں آئے، شاعر، فلسفی، منطق اور دیگر علوم کے ماہرین نے ہندوستان آکر مدارس کے نصاب میں فلسفے اور معقولات یا عقلی علوم کو متعارف کروایا، اور اس کے بعد کے دور میں مدرسہ دو مختلف روایات کا امین بن گیا: وسط انڈونیشیا اور افغانستان کی روایت جو متن، مختصر متن اور متن پر متن کے ذریعے فقہ اور اصول فقہ پر زور دیتی ہے، اور دوسری روایت ایرانی ہے، جس میں زور فلسفے اور منطق پر تھا، عہدِ مغلیہ میں مدرسے کا یہ بنیادی خاکہ ہے۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی روایات قائم تھیں، جن میں سے دو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ایک روایت لکھنو میں ایک ادارے فرنگی محل میں پروان چڑھی، فرنگی محل دراصل ایک عمارت کا نام ہے، جسے جہانگیر نے برطانوی تاجروں کے ایک گروہ کے

لئے مختص کیا تھا، جنہیں ہندوستان میں کاروبار اور تجارت کی اجازت دی گئی تھی، ان کا دفتر وہیں تھا، اور اس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں جب ان سے متعلق شکایات ملیں کہ وہ جہانگیر کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی نہیں کرتے تو اورنگ زیب نے ان کے خلاف انتظامی کاروائی کی اور ان سے وہ عمارت چھین کر انہیں اس سے بے دخل کر دیا، مدرسہ قائم کر دیا، چوں کہ یہ عمارت مسلمان علماء کی ایک جماعت کو دی گئی جس میں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کر دیا، چوں کہ یہ عمارت ''فرنگیوں'' کی ملکیت میں تھی، اس لئے یہ ''فرنگی محلی'' (قصر مغرباں) کے نام سے معروف ہوئی، یہ مدرسہ بھی فرنگی محل (فرنگیوں کے محل یا قلعے میں قائم کردہ مدرسہ) کے نام سے معروف ہوا، یہ مدرسہ اورنگ زیب عالم گیرؒ کے ایک معاصر فقیہ اور عالم نظام الدین سہالوی نے قائم کیا تھا، جنہوں نے عالمگیر کے حکم سے فتاوی عالم گیری مرتب کرنے والی دوسو علماء کی کمیٹی کی نگرانی بھی کی تھی۔

آپ کو مدرسہ قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جسے آپ نے قائم کیا، جس نے فقہ اور اصول کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے برصغیر کی علمی روایت پر غیر معمولی اثر مرتب کیا، فقہ اہلِ اسلام کا ایک زندہ قانون ہے جو اسلامی شریعت کی متحرک روایت کا امین ہے، اس میں ہر زمان ومکاں کے لئے راہ نمائی اور نمو پذیری کی صلاحیت موجود ہے، یہ شریعت وہ راہ نما قانون اور نظام ہے جس نے مسلمانوں کی ہمیشہ بھر پور راہ نمائی کی اور ان کو تاریخ کے ہر دور میں کسی بھی چیلنج سے نمٹنے کے قابل بنایا۔

تاہم بدقسمتی سے مدرسے کی یہ تعلیمی شریعت وہ چیز نہ تھی جو زندہ اور متحرک اسلامی روایت سے عبارت ہے، یہ بس ان متون تک محدود تھی جو ہندوستان سے باہر کہیں (وسط ایشیا یا عرب دنیا میں) تیار کئے گئے، اور جن کے مصنفین کے پیش نظر مختصر نویسی کی مہارتوں کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہوتا تھا، جو جس قدر زیادہ اختصار میں ماہر اور مشکل پسند ہوتا، اسی قدر زیادہ مشہور اور ممتاز ہوتا، یہ متون مدرسہ فرنگی محل میں پڑھائے جاتے تھے، طلبہ سے

مطلوب ان متون کو زبانی یاد کرنا اور مصنف وشارح کے طرز اطناب اور لفاظی پر توجہ مرکوز کرنا تھا، قواعد زبان، فقہ اور اصولِ فقہ اسی طرز پر پڑھائے جاتے تھے۔

اصولِ فقہ کو تفقہ اور نئے اصولِ قانون وضع کرنے کے وسیلے کے طور پر پڑھانے کے بجائے الفاظ کی بازی گری کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، جس کا ارتکاز کسی مصنف کے متن پر ہوتا تھا، یہی حال فقہ کا تھا، اسی لئے ہماری ناچیز رائے مدرسۂ فرنگی محل کے عظیم کردار کے باوجود فقہ اور اصول فقہ کے میدان میں اس کا اثر ہے بے حد محدود تھا، اس عمل کے ذریعے کوئی نئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اگر کچھ نئی کتابیں تھیں بھی تو ان میں کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا گیا، نہ اس میں اصولِ فقہ کے وسیع میدان کا کوئی حصہ نیا شامل کیا گیا، کم از کم مدرسہ فرنگی کی یہ صورتِ حال مغلیہ سلطنت کے سقوط تک جاری رہی۔

دوسری روایت جون پور کی تھی جو جنوبی شمالی ہندوستان، جنوبی یوپی میں قائم تھی، اس کو شیرازِ ہند کہا جاتا تھا، شیراز کی علمی روایت کا ارتکاز زیادہ تر فلسفے پر تھا، جس کو معقولات یا عقلی علوم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، شیرازِ ہند، جون پور نے بعض بڑے جلیل القدر علماء پیدا کئے، لیکن ان کی دل چسپی کی تگ وتاز کی جولاں گاہ، ایران سے درآمد شدہ یا ایرانی علماء کے پروردہ عقلی علوم تھے، جون پور کی تاریخ میں ملا محمود جون پوری سب سے نمایاں شخصیت سمجھے جاتے تھے، بعض علماء کے نزدیک وہ امام شاہ ولی اللہ کے پائے کی شخصیت تھے، بعض دیگر اہل علم کا خیال ہے کہ وہ نبوغِ علمی اور فکری عبقریت میں شیخ احمد سرہندی کی ہم سر شخصیت تھے ؛لیکن ان کا یہ سارا فضل وکمال ایران میں رائج اور مشہور فلسفیانہ کی تلخیص پر مشتمل متون تیار کرنے تک محدود تھا، یہ جون پور کی علمی روایت تھی۔

جب امام شاہ ولی اللہؒ عرب دنیا میں تقریباً پندرہ کے قیام کے بعد وہاں سے ہندوستان لوٹے تو انھوں نے ان تعلیمی نظاموں میں کچھ تبدیلیوں اور بہت پیش رفت کو متعارف فرمایا، آپ نے فلسفے کے مقابلے میں قرآن حدیث، اور اسرارِ شریعت کے مطالعے پر زور دیا، شاہ صاحبؒ نے متعدد متون تحریر کئے جنہیں داخلِ نصاب کیا گیا، متنِ حدیث کے مطالعے کے لئے مؤطا

امام مالک مع شروحات لازمی قرار دی گئی متن پر ضرورت سے زیادہ کی روایت کم کی گئی، انسانیت، برصغیر اور شمالی ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک پہلا تعارف تھا جس میں نصاب کو قرآن، حدیث اور سیرتِ رسول ﷺ کی بنیاد پر استوار کرنے کی سنجیدہ اور منضبط کوشش کی گئی۔

اس سے پہلے اس طرح کی ایک کوشش شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی کر چکے تھے، جہاں سیرت اور حدیث کی کچھ کتابیں متعارف کروائی گئیں، لیکن شاہ عبدالحقؒ کی وفات کے بعد برصغیر کی علمی روایت میں ان کوششوں کا راستہ بند ہو گیا۔

یہ صورت حال تھی جب مغل سلطنت کا سقوط ہوا، مدرسہ فرنگی محل کی روایت وہی رہی، شرقی برصغیر کی روایت جون پور کے طرز ہی پر رہی، البتہ دہلی، لکھنؤ اور ٹھٹھہ (اور بعض دیگر شہروں) کے کچھ (چھے یا سات) مدارس نے امام شاہ ولی اللہؒ کے متعارف کردہ نصاب کی ترویج کی جس میں بنیادی زور فہمِ قرآن اور متن حدیث کے مطالعے پر تھا، جب اٹھارویں صدی کے درمیان برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ جمالیا، اور مغل بادشاہ، شاہ عالم (شاید شاہ عالم ثانی) کو یہ خطرہ محسوس ہو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی پیش رفت ایک دن سارے برصغیر کو قابو میں لے لے گی، تو اس نے کچھ اقدام کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس سیلاب بلا خیز کا کسی عسکری قوت کے ذریعے مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے اس اٹھتی ہوئی طاقت سے سمجھوتہ کرنے اور تین صوبوں میں اس کی قوت کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا، مغل بادشاہ نے کمپنی کو ایک چارٹر جاری کیا جس میں اس کو محصول جمع کرنے، انتظامِ مدنی اور بعض دیگر شہری معاملات کی اجازت دی۔

یہ مغلیہ سلطنت کا بالفعل قانونی زوال تھا، انھوں نے اپنی سلطنت کے تین بڑے صوبے گنوا دیئے جو اس وقت سب سے مؤثر صوبے شمار ہوتے تھے، بنگال اس وقت مغلیہ سلطنت کا سب سے پر ثروت صوبہ تھا، اورنگ زیبؒ کی سب مہمات کا مالی خرچ بنگال کے لگان سے اٹھتا تھا اور مغلیہ سلطنت کا زیادہ تر مدار اسی کے مالی وسائل پر تھا، یہ امیر صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور مغلیہ سلطنت تین صوبوں: بنگال، بہار اور اڑیسہ اہلِ

برطانیہ کے حق میں سبک دوش ہوگئی۔

اس سبک دوشی کے موقع پر جس معاہدے پر دستخط ہوئے، اس وقت اس عمل کو دست برداری نہیں کہا گیا؛ مگر یہ عملا دست برداری ہی کی ایک شکل تھی، معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کے معاملات کو اسلامی عدالتوں میں مسلمان ججز، قاضیوں اور مفتیوں کی راہ نمائی میں اسلامی شریعت کی رو سے نبھایا جائے گا، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اس شرط پر راضی ہوگئی اور اس نے تینوں صوبوں کے مختلف حصوں میں عدالتیں قائم کیں، جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے آگے بڑھ کر یوپی اور دلی کے گردونواح کے دیگر صوبوں پر بھی قبضہ جمالیا اور آخر کار ۱۸۰۶ء میں وہ دلی میں داخل ہوگئی تو پھر وہی معاہدہ دوبارہ عمل میں لایا گیا، جس میں دیوانی امور کا قانون کمپنی کو دیگر صوبوں میں لاگو کرنے کی بھی اجازت دی گئی، اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ سلطنت کی صوابدید پر ہندوستان پر حکومت کرنے کی سرکاری اجازت دی گئی، ان دنوں جب ایک عمومی اعلان کیا گیا تھا تو قانونی دست برداری کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

تمام مخلوق اللہ کی ہے، تمام کائنات اللہ کی ہے، سلطنت بادشاہ کا حق ہے، لیکن سرکاری فیصلے کمپنی بہادر کے ہیں۔

کمپنی نے آغاز میں مسلمانوں کو کم از کم یہی تاثر دیا کہ وہ معاہدے کی پاس داری کررہی ہے، اور اسلامی عدالتیں قائم کررہی ہے، اس نے عملا ایسے کیا بھی، چنانچہ عدالتیں قائم کیں، ان میں قاضی، جج اور مفتیوں کا تقرر کیا، اس تقرر میں سہولت اور آسانی پیدا کرنے کے لئے انہیں یہ فیصلہ کیا کہ قاضیوں کا انتخاب فرنگی محل یا درسِ نظامی کے فضلاء میں سے ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ انگریز بڑے مربوط طریقِ کار کے حامل لوگ تھے، وہ ابھی بھی نظم کے بہت پابند ہیں اور جب بھی انہوں نے کوئی الٹا یا سیدھا کام کرنا ہو تو وہ اسے ایک ضابطے اور قانون کے تحت ہی کرتے ہیں، پہلے وہ کوئی قانون بناتے ہیں، اس کے لئے ضابطے تیار کرتے ہیں، ایک طریقِ کار مہیا کرتے ہیں اور پھر کام کا آغاز کرتے ہیں، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، چنانچہ

انھوں نے یہ کام بھی ایک قانون اور ضابطے کے تحت ہی کیا، وہ طریقہ یہ تھا کہ قاضی یا مفتی وہی متعین ہوں گے جو درسِ نظامی کے فاضل ہوں گے، ججز کے لئے فقہ حنفی کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگی، اس مقصد کے لئے ہدایہ کا انگریزی ترجمہ کیا گیا، فتاوی عالمگیری کی انگریزی میں تلخیص کی گئی اور فقہ حنفی کے بعض بنیادی متون کو برطانوی اہل علم نے انگریزی میں منتقل کردیا، اس کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے افسروں کو فقہ حنفی کے مطابق مختلف معاملات کی قانونی حیثیت سے آگاہی فراہم کرنا تھا۔

اس اقدام نے درسِ نظامی کو سارے ہندوستان میں بہت مقبول بنادیا، کیوں کہ یہ فضلا کو اعلی مشاہروں پر ملازمت کے مواقع فراہم کرتا تھا، یہ فضلاء دیگر اداروں میں کم مشاہرہ پاتے تھے، لیکن کمپنی میں ان کو اعلی وظائف دیئے جاتے تھے، اس وجہ سے درسِ نظامی بہت معروف ہوگیا اوران دنوں یہ اسی نام سے مشہور ہوا، اب، ۱۷۶۱ء کے بعد درس نظامی بہ بتدریج ہندوستان کے تمام حصوں میں مقبول ہوتا گیا، مدارس نے درس نظامی کو اپنے نصاب کے طور پر اختیار کرنا شروع کیا، لیکن تاج برطانیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ مدارس کی تعداد کم ہونا شروع ہوگئ جس کی مختلف وجوہ ہیں۔

ایک بہت معروف مدرسہ تھا جو ایک طویل عرصے تک قائم اور جاری رہا، اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا اور بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس کالج کو بھی اپنے کنٹرول میں لے کر اس کا ایک نیا نصاب تشکیل دیا، بعض بڑے مسلمان اہل علم کا اس میں تقرر کیا، ان ہی میں سے ایک عالم مولانا مملوک علی تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتوی کے والد تھے، آپ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے علماء کے استاذ تھے، یہ تینوں فضلاء مدرسہ غازی الدین یا دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے کوکب اقبال کے مکمل طور پر غروب ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام مدارس کو ختم کر کے رکھ دیا، اوقاف نظام

پکٹ کردیا اور ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کے ساتھ کئے گئے معاہدہ کو پس پشت ڈال دیا، مسلم عدالتیں باقی نہ رہیں، نفاذ شریعت کا معاملہ کالعدم ہوگیا اور قاضیوں اور مفتیوں کا وجود مٹ کر رہ گیا اور سب بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی

مدارس کو اوقاف کی امداد، مرکزی حکومت کی توجہ اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم صوبائی حکومتوں یا امارتوں کی اعانت سے محروم کردیا گیا اور کسی اسلامی تعلیم کی روایت کو باقی رکھنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

اس صورت حال میں مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حاجی محمد عابد حسینؒ اور بعض دیگر حضرات سامنے آئے اور دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا؛ تاکہ ہندوستان میں اسلامی تعلیم اور اس کے اداروں کے ختم کرنے کی جو لہر برپا تھی، اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اور روایت کی حفاظت کی ممکنہ حد تک حفاظت کی جاسکے، یہ لوگ اسی روایت کے تربیت یافتہ اور درسِ نظامی کے متون اور کتب کے فاضل تھے، اس لئے انہوں نے مدرسے کے نصاب کے لئے درس نظامی ہی کو اختیار کیا؛ تاہم اس میں دو بنیادی ترمیمیں کیں، ابتداء میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ منطق اور فلسفے کی کوئی کتاب بھی داخلِ نصاب نہیں کی جائے گی، ان کا خیال تھا کہ اس وقت چوں کہ اصل مسئلہ اسلامی علوم کی حفاظت کا ہے، اس لئے قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا جائے اور ان ہی کو پڑھایا جائے، اس لئے ان کے نزدیک فلسفے، منطق اور دیگر مضامین کے پڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے؛ اس لئے ابتداء میں دارالعلوم دیوبند میں ترمیم شدہ درسِ نظامی کے اندر منطق، فلسفہ اور دیگر علوم شامل نہ تھے۔

دوسری اہم ترمیم یہ تھی کہ درس نظامی کے اختتام پر حدیث کے محض تعارفی نصاب کو شامل کیا گیا اور پھر آخر میں ایک مستقل سال حدیث کے خصوصی مطالعے کے لئے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ خاص کیا گیا، ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم دیوبند کو تقریباً نوے سالہ طویل دوران میں متعدد تبدیلیاں کی گئی، بعد میں فلسفے اور منطق کے علاوہ حدیث کی کچھ مزید کتابیں

(طحاوی، مشکاۃ اور مؤطا امام مالک اور موطا امام محمد) بھی شامل کی گئیں۔کافی بعد میں متنِ قرآن کا ترجمہ بھی متن بھی شامل کیا گیا جو غالباً دوسرے یا تیسرے سال سے شروع ہوتا تھا، اور آخر تک چلتا تھا، جس کے نتیجے میں مکمل قرآن ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہو گیا، اصولِ تفسیر پر بھی کچھ متون شامل کر دیئے گئے، شاہ ولی اللہ کی قرآن فلسفے اور تفسیری اصولوں پر کتاب الفوز الکبیر داخل نصاب کی گئی۔

یہ تبدیلیاں مختلف وقفوں سے کی گئیں، بیسویں صدی کے آغاز میں غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں امام شاہ ولی اللہ کی شاہ کار کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کو ایک تکنیکی ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا، یہ کتاب دارالعلوم کے فضلاء کو پڑھائی جاتی تھی۔

اس طرح درس نظامی ہم تک پہنچا، ۱۸۶۷ء (جب عہد برطانیہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی) سے ۱۹۴۷ء (جب ہندوستان خود مختار بنا) تک دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں (جن کی تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد تھی)۔

درس نظامی کی ترتیب کی وجوہات

یہ حقیقت ہے کہ دینی مدارس نے پچھلے دوسو سال سے خاص طور پر اور اس سے پہلے پوری اسلامی تاریخ میں عام طور پر ایک انتہائی فعال اور تعمیری اور مؤثر کردار ادا کیا ہے، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کی تفریق نہ تھی، تقریباً بارہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں دنیائے اسلام اس تفریق سے نا آشنا رہی، جس نظام تعلیم کی پیداوار مجدد الف ثانی (م: ۱۳؍نومبر، ۱۶۲۴ء) تھے، جنہیں دنیائے اسلام نے دوسرے ہزارے کا مجدد قرار دیا، جن کو علامہ اقبال نے مسلم ہندوستان کا سب سے بڑا (Religious Genius) یعنی نابغہ قرار دیا، اسی نظام تعلیم کی پیداوار اس دور کے دوسرے تمام اہل علم، ارباب سیاست وحکومت اور دیگر اصحاب ادب ودانش بھی تھے، حضرت مجدد صاحب اور سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان مرحوم ہم درس تھے، وہ ایک ہی درسگاہ اور ایک ہی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے تیار ہوئے تھے، تاج محل اور دوسری عظیم الشان عمارتیں بنانے

والا ماہر تعمیرات بھی ان ہی درس گاہوں کا پڑھا ہوا تھا، جن درسگاہوں سے شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم رحمہما اللہ پڑھ کر تیار ہوئے تھے۔(۱)

سوال یہ ہے کہ درس نظامی کا یہ نصاب ملا نظام الدین سہالوی مرحوم و مغفور نے کیوں اور کس مقصد کی خاطر مرتب کیا تھا؟ اس پر اگر ذہن صاف ہو اور تاریخی حقائق سامنے ہوں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں جس کو اب برصغیر کی اسلامی تاریخ کا دور زوال اور دور انحطاط بھی کہہ سکتے ہیں، ریاستی نظام چلانے، اسلامی عدالتوں کو قاضی، مفتی اور مقنن فراہم کرنے کی خاطر یہ نصاب تیار کیا گیا تھا، یہ زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ابتدائی دور تھا، جب اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم سے دیوانی خرید لی تو کمپنی کے زیر انتظام صوبوں کے بارے میں یہ شرط رکھی گئی کہ وہاں کا نظام بدستور فقہ حنفی کے مطابق چلتا رہے گا، اس نظام کے لئے کمپنی کے کار پردازوں نے بھی اپنے اہتمام میں درس نظامی کے کئی ادارے قائم کئے، یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کے مکمل اور حتمی سقوط تک جاری رہا، بہر حال اس کے بعد چوں کہ یہ نصاب موجود تھا اور اسی نصاب کے تیار کردہ علماء دستیاب تھے، اس لئے جب دار العلوم اور دوسرے مدارس قائم ہوئے تو انہوں نے اسی نصاب کو قابل عمل پایا اور اس کو اختیار کر لیا، لیکن دار العلوم دیوبند کے قیام کے بعد خود اس نصاب میں پچھلے سو سال میں اب تک جتنی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہوں نے اس نصاب کو ''حقیقی درس نظامی'' نہیں رہنے دیا، آج کا رائج الوقت درس نظامی اصل درس نظامی سے بہت مختلف چیز بن چکا ہے، لیکن تاریخی تسلسل میں اگر اس کو درس نظامی کہا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

درسِ نظامی کی خصوصیات

اس کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا بڑا حصہ تین بنیادی علوم فقہ، اصول فقہ اور منطق پر مشتمل تھا۔

---

(۱) محاضرات تعلیم: ۷۲

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جتنے علوم اس زمانے میں مسلم ہندوستان میں مروج تھے وہ اس میں شامل تھے، کوشش یہ تھی کہ اس نصاب کا فارغ کسی رائج الوقت علم سے بالکل ناواقف نہ ہو، چاہے وہ سائنس ہو، طب ہو، انجنیر نگ ہو، جو بھی اس زمانے کی سائنس اور انجینئر نگ تھی، وہ اس میں شامل تھی، اقلیدس، الجبرا، جیومیٹری اور ریاضی کے مضامین اس زمانے میں بھی نصاب میں شامل تھے، یہی وجہ تھی کہ اس درس کے پڑھے ہوئے بے شمار لوگ طبیب، مہندس، منتظم اور معمار ہوئے (درس نظامی سے پہلے جو شکل نظام تعلیم کی تھی، اسے ہم درس نظامی کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں) چنانچہ وہ ماہر مہندس جس نے تاج محل تعمیر کیا، یعنی استاد احمد معمار وہ اسی درس کا پڑھا ہوا تھا، معماری کا یہ فن اس نے مدرسے ہی میں بیٹھ کر سیکھا تھا، یہ درس اس زمانے میں ایک اپ ٹو ڈیٹ معاشرے کو چلانے کے لئے ہر لحاظ سے مکمل تھا، معاشرے کی ضرورت کے مطابق تمام علوم وفنون اس میں شامل تھے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ نصاب نہایت ٹھوس اور مشکل تھا اور فارغ ہونے والے کے لئے ہر فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب سے گزرنا ضروری تھا، یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ کوئی کتاب آگے چل کر اس کے لئے مشکل نہ رہے، بعض لوگ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور مشکل کتابوں کو ختم کر کے آسان کتابیں شامل کرانا چاہتے ہیں، لیکن میں ذاتی طور سے اس کو درست نہیں سمجھتا، اس مشکل پسندی میں آج بھی بڑی معنویت ہے، اگر طالب علم کو مشکل کتابوں کا یہ پہاڑ عبور کرالیا جائے تو اس کا مطالعہ اتنا ٹھوس ہو جاتا ہے اور ذہن میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اسے پھر آج کل کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں کا نصاب اور علوم بڑے آسان معلوم ہوتے ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ اتنی اعلی سطح پر جو مباحث پڑھائے جاتے ہیں ان میں علمی اعتبار سے اس کے لئے کوئی مشکل اور ناقابل فہم چیز نہیں ہے، بشرطیکہ طالب علم اس وسیع ذخیرے سے اچھی طرح واقف ہو، اس لئے ضروری ہے کہ ان کتابوں کو باقی رکھا جائے۔

درس نظامی کی کتابوں کی بالخصوص اور علوم اسلامیہ کے بیش تر کتابوں کی بالعموم ایک

اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا آپس میں نہایت گہرا اور مضبوط ربط ہے، اسلامی علوم وفنون دوسری اقوام کے علوم وفنون کی طرح ماضی سے لاتعلق بہ الفاظ دیگر یتیم نہیں ہیں، ان کا اپنے ماضی سے بہت گہرا تعلق ہے، اور ماضی سے تعلق کا یہ سلسلہ کہیں بھی منقطع نہیں رہتا، ان سب علوم اور کتابوں میں ایک غیر منقطع فکری وحدت اور فکری تسلسل پایا جاتا ہے، اس کے برعکس مغربی علوم میں یہ خوبی نہیں ہے، مثلا انگریزی قانون کے کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھی جائے اور وہ مقبول ہوجائے تو اچھی کتاب ہے، اس سے بحث نہیں کہ اس سے پہلے کس نے کیا کہا، مسلمانوں میں یہ بات نہیں ہے، مثلا ظاہر الروایت کی چھ کتابوں کو لیجئے، جو فقہ حنفی کی بنیاد ہیں، آج جو کتابیں فقہ حنفی کی ہمارے پاس ہیں، ان سب کا ماخذ وہی ظاہر الروایت ہے، ظاہر الروایت کی کتابوں کی تلخیص ''الکافی فی فروع الحنفیۃ'' ہے، الکافی کی شرح امام سرخسی کی المبسوط ہے، دوسری طرف ظاہر الروایت کی اور ایک کتاب ''الجامع الصغیر'' کی بنیاد پر ہدایۃ المبتدی لکھی گئی، جس کی شرح ہدایۃ ہے، پھر ہدایہ کی تلخیص وقایہ اور وقایہ کی شرح ''شرح وقایۃ'' ہے، اب اگر آپ کہیں کہ ہدایہ کو نصاب سے نکال دو، تو اس لئے مشکل ہیکہ اس سے ایک خلا پیدا ہوجائے گا اور کسی بھی نئی مجوزہ فقہی کتاب کو ہدایہ کی جگہ رکھ دینے سے دوسرے علمی نقصان کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ ہوگا کہ نئی مجوزہ کتاب کا اس پورے فقہی شجرہ نسب اور علمی ورثے سے رشتہ منقطع ہوجائے گا، اس لئے فقہ اور فلسفے کی کتابیں مشکل تو ہیں؛ لیکن ضروری ہیں، کیوں کہ ایک دوسرے پر ان کا دارومدار ہے، ذاتی طور پر ہرگز اس کا قائل نہیں ہوں کہ درس نظامی کی مشکل کتب کی جگہ آسان کتابیں رکھی جائیں۔(۱)

---

(۱) محاضرات تعلیم: ۲۶۲

درس نظامی کے ابتدائی کتابیں

یہاں ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ عام طور پر ہمارے یہاں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ درس نظامی دینی تعلیم میں مہارت اور اختصاص حاصل کرنے کا کوئی نظام تھا، واقعہ یہ ہے کہ درس نظامی محض دینی تعلیم کا نظام نہیں تھا اور نہ اسکا مقصد علوم دینیہ کے محققین پیدا کرنا تھا، نہ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں دینی راہ نمائی کے لئے قائدین پیدا کئے جائیں، یہ تو اس زمانے کے حساب سے ایک ماڈرن اور اپ ٹو ڈیٹ نظام کا خاکہ تھا جو اس زمانے کے ایک صاحب علم نے وضع کیا تھا، چوں کہ اورنگ زیبؒ کے جانے کے بعد بھی برصغیر میں سوسوا سو برس تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، نظام تعلیم بھی بڑی حد تک اسلامی خطوط پر قائم تھا، اور قانون، تمدن، معاشرت، معاشیات، سیاسیات، سارے کے سارے معاملات اسلامی خطوط ہی پر استوار تھے، اس لئے بنیادی طور پر یہ چیز لازمی تھی کہ اس نظام میں اسلامی علوم کو اساسی اہمیت حاصل ہو، اس لئے ملا نظام الدینؒ نے اس زمانے میں جتنے مروج علوم تھے، جن کا اندازہ ۵۶ کے قریب لگایا جاتا ہے، سب کو یکجا کر کے ایک ایسے آٹھ سالہ نظام تعلیم کا خاکہ پیش کیا جس کو آج کل گریجویشن کی ڈگری کے برابر قرار دے سکتے ہیں، اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس نظام سے ایک مرتبہ تعلیم حاصل کرنے اور اس نصاب میں تعلیم پانے کے بعد اگر کوئی شخص کسی خاص میدان میں ترقی کرنا چاہے تو اس کے سامنے راستہ کھلا ہو، مزید تخصص کے لئے بھی راستہ ہو، اور علمی اعتبار سے بھی وہ اس کے لئے تیار ہو، منطق، فلسفہ، ریاضی، طب، فن تعمیر، جیومیٹری، علم ہندسہ (یہ سارے کے سارے علوم) عربی زبان وادب، فارسی ادب، یہ سب اسلامی علوم کی تحصیل کے لئے اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان،

فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علوم تصوف جیسے خالص دینی علوم، یہ ساری کی ساری چیزیں اس میں شامل تھیں، اگر آپ اس اصل نصاب کو دیکھیں جو ملا نظام الدینؒ نے تیار کیا تھا، تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں تقریبا ۵۶ علوم کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں شامل تھیں، مقصد یہ تھا کہ طالب علم کو رائج الوقت علوم وفنون سے کچھ نہ کچھ شناسائی ضرور ہوجائے، یہ وسعت اور جامعیت غالبا دنیا کے کسی اور مذہب یا روایت میں نہیں ہے کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں یہ سب تکمیل ہوجائے۔(۱)

اگر دس بارہ سال کی عمر کا طالب علم اس میں داخل ہوتو وہ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوسکتا ہے، اگرچہ اس کی مثالیں بھی ہیں کہ چودہ، پندرہ سال یا سولہ سال کی عمر میں طلبہ فارغ التحصیل ہوئے ہیں، خود شاہ ولی اللہ چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، ملا نظام الدینؒ سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، اور صاحب تصنیف بھی ہوئے، ان کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ان کی ایک فقہی تحریر یا تصنیف کو دیکھ کر افغانستان سے ایک بزرگ ان سے ملنے اور کسی مسئلے میں تبادلہ خیال کے لئے حاضر ہوئے، اور لکھنؤ پہنچ کر پوچھا کہ مولانا عبدالحی کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ اپنے ہم عمر دوستوں کے ہم راہ چیل کے انڈے ڈھونڈنے گئے ہیں، انہیں بڑی حیرت ہوئی، وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چند لڑکے ہیں جو چیل کے انڈے پکڑنے کے لئے درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں، پوچھا کہ مولانا عبدالحی کون ہیں؟ ایک لڑکے نے درخت پر بیٹھے ایک دوسرے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ مولانا عبد الحی ہے، اس کو یقین نہیں آیا؛ لیکن اس نے مسئلہ پوچھا، مولانا نے اپنا شغل بھی جاری رکھا اور اسے تفصیل کے ساتھ مسئلے کے بارے میں بھی بتایا، نیز نشان دہی کی کہ فلاں فلاں کتاب میں دیکھیں، فلاں کی دلیل یہ ہے، فلاں کی دلیل یہ ہے، پھر ان دلائل کا محاکمہ کیا اور اس پوری گفتگو کے دوران اپنا شغل بھی جاری رکھا۔

(۱) محاضرات تعلیم: ۱۰۳

اس نظام میں اس طرح کی مثالیں آپ کو بہت ملیں گی ۵۶ علوم اور تقریبا ۱۲۰ بنیادی کتابیں اور متون اس نصاب میں شامل ہیں، ایک بات انہوں نے خاص طور پر پیش نظر رکھی، وہ یہ کہ ہر فن کی انتہائی مشکل اور انتہائی دقیق، حتی کہ چیستاں قسم کی کتاب انہوں نے اس نصاب میں شامل کیا کہ جب وہ یہ نصاب پڑھ کر فارغ ہوں تو مشکل سے مشکل او رادق سے ادق کتاب سے استفادہ کرنا ان کے لئے مشکل نہ ہو۔

دراصل یہ درس نظامی اس دور کا دینی نظام نہیں؛ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک ماڈرن نظام تھا جو ان حالات میں دیوبند کے بانیان نے اختیار کیا۔

نصابِ تعلیم

دینی مدارس میں اس وقت جو نصاب رائج ہے، وہ بنیادی طور پر درس نظامی کا نصاب ہے، یہ نصاب ایک عالم دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا، اوراس میں ہر علم وفن کے اندر ایسی کتابیں تجویز کی گئی تھیں جو سطحی اور سرسری معلومات کے بجائے اس علم وفن میں مستحکم اور ٹھوس استعداد پیدا کریں اوراس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے نزدیک اس بنیادی ڈھانچے میں بہت زیادہ انقلابی تبدیلیوں کی اب بھی ضرورت نہیں؛ البتہ قومی انحطاط اور وقت کی علمی و دینی ضروریات کے پیش نظر مختلف حیثیتوں سے نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں جو خلا محسوس ہوتا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:

دینی مدارس کو عربی زبان سے جو خصوصی تعلق ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، عربی زبان تمام دینی علوم کے لئے بنیادی زینے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ہمارے مدارس میں عربیت کا ذوق اور عربی تحریر وتقریر کا ملکہ افسوس ناک حد تک نایاب ہے، اچھی استعداد رکھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ عربی کتابیں سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا کر لیتے ہیں، لیکن عربی تحریر وتقریر کی مشق سے ۔ الا ما شاء اللہ ۔ بالکل عاری ہوتے ہیں، اکثر متوسط درجے کے طلبہ کی بھی عبارت خوانی تک درست نہیں ہوتی اور عربی میں مضمون نگاری، تصنیف وتالیف یا تقریر

وخطابت تو اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کے لئے بھی کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہے۔

مکمل تعلیم کا نصاب

تعلیم کے سلسلے میں نصاب کو بھی بہت زبردست اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ اسلام کے تین بڑے مآخذ ہیں: (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) فقہ اوران کی زبان عربی ہے تو اس زبان کو جب تک نہ سیکھا جائے اس کی نحو وصرف، محاورات وتعبیرات، امثال کو نہ سمجھا جائے تب تک اس کے مضامین اور مراد کو سمجھنا مشکل ہے، اس لئے زبان کے قواعد جونحو وصرف، معانی بدیع، بلاغت پر مشتمل ہیں پڑھنا ضروری ہے، اس سلسلے میں ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں دو نصاب تعلیم جاری ہیں، ایک تو وہ جس کو دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں نے اختیار کر رکھا ہے، اس نصاب میں نحو وصرف اور ادب کی نیز معانی وبلاغت کی وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن سے صحیح عبارت پڑھنے اور وجوہِ اعراب کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے، جو بہت مفید بھی ہیں؛ مگر ان میں بعض ایسی کتب بھی ہیں جن میں بجائے نحو وصرف کے نحو وصرف کا فلسفہ پڑھایا جاتا ہے، جو منتہی اور فارغ التحصیل طلبہ کے لئے تو بہت مفید ہوسکتی ہیں؛ مگر مبتدی اور متوسطات پڑھنے والے طلبہ کے لئے دشوار بھی ہیں اور مفید بھی نہیں، طلبہ کی بہت بڑی قوت اس کو سمجھنے میں ضائع ہوجاتی ہے اور اس کے بعد بھی عربی بولنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اور نہ لکھنے کی اور نہ عربی اخبارات ورسائل اور نہ محکمہ جاتی اصطلاحات کو جانا جاسکتا ہے۔

اسی طرح علوم عالیہ قرآن وحدیث وفقہ میں جو کتابیں داخل درس ہیں ان کا نصاب اتنا زائد ہے کہ دوتہائی حصہ درایۃ پڑھایا ہی نہیں جاسکتا، ایک سال میں اس کا پورا ہونا بالکل رواروی کے انداز میں ہوتا ہے، نیز اس نصاب میں منطق وفلسفہ کی کتب مقرر تو کی گئی ہیں مگر ان کو پڑھانے والے اتنے ماہر نہیں ہیں کہ ان سے جو فوائد مقصود ہیں ان کو حاصل کیا جاسکے؛ لہٰذا علوم عالیہ کی جو کتابیں اس طرح لکھی گئی ہیں، جن میں منطق وفلسفہ کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ کتابیں بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں، اسی طرح ادب میں وہ کتابیں

داخل ہیں جن میں ادب کم اور لغات زیادہ ہیں ان میں مشکل اور پیچیدہ تعبیرات تو ہیں مگر سلیس ادب کا کہیں نام ونشان نہیں ہے، نیز انشاء کے لئے اس نصاب میں مستقل وقت نہیں دیا جاتا اور نہ اس سلسلے کی کتب نصاب میں ہیں۔

دوسرا نصاب ندوۃ العلماء کا ہے، جس میں نحو وصرف، بلاغت اور ادب کو کافی اہمیت دی گئی ہے اور ابتدائی طلبہ کو عربی زبان کے قواعد اردو زبان میں سمجھانے والی کتب کو درس میں شامل کیا گیا ہے؛ تاکہ طالب علم پر دو یا تین زبانوں کا بوجھ نہ پڑے، مثلاً فارسی میں قاعدہ سمجھیں پھر اردو میں پھر جا کر عربی میں جیسا کہ نحو میر اور علم الصیغہ میں یہ دقت پیش آتی ہے، یہ دقت تمرین الصرف، تمرین النحو، کتاب الصرف، کتاب النحو وغیرہ میں پیش نہیں آتی، نیز انشاء کو بہت اہمیت دی گئی ہے، معلم الانشاء کے دو حصے نصاب میں شامل ہیں، مختارات، منثورات، وغیرہ کتب بھی نصاب میں شامل کی گئی ہیں، جن میں بڑے بڑے ادباء کے ادب کے نمونے ان کی تعبیرات، مثالیں، محاورے اور طرز تحریر سامنے آجاتے ہیں اور ادب نے اسلام کے اتنے لمبے عرصے میں جو سفر طئے کیا ہے اور اس میں جو اصطلاحات اور محاورے استعمال ہونے لگے ہیں وہ سب بھی انتہائی سلیس عربی میں سامنے آجاتے ہیں۔

نیز فقہ حدیث اور قرآن جو علوم عالیہ ہیں ان کے منتخبات اور مشکل حصوں کو پڑھایا جاتا ہے؛ تاکہ نصاب میں مقدار کم رہے تو سال بھر میں بلا دوڑ ابھاگی کے مقررہ کورس پورا کر لیا جائے، پھر اگر کسی کو صحاح ستہ وغیرہ کتب مکمل ہی پڑھنا ہو تو وہ فضیلت والے سال میں عالمیت کے بعد مزید وقت لگا کر پورا کر لیتا ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ درس نظامی والے مدارس بھی اگر نحو وصرف، بلاغت وانشاء اور ادب کے کورس میں ندوہ کے نصاب کو تھوڑی بہت کمی زیادتی کے ساتھ اپنا لیں تو انشاء اللہ ابتدائی درجات میں طلبہ کو کافی فائدہ ہوگا، اس طرح علوم عالیہ کے نصاب میں مقدار میں کمی کر لی جائے اور منتخبات کو پڑھایا جائے تو انشاء اللہ نصاب وقت پر مکمل بھی ہو جائے گا اور درایۃ پڑھایا بھی جا سکے گا، پھر اگر کسی کو صحاح ستہ مکمل درایۃ پڑھنی ہو یا اور کسی فن کی کتاب

پڑھنی ہو تو اس کے لئے ۲ر ۳ سال کا وقت لگا کر اسی فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔

ماہر اساتذہ پیدا کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی بھی فن میں اساتذہ کو بڑی سے بڑی تنخواہ دی جانے لگے تو اس فن میں مہارت حاصل کرنے لگیں، مدارس ان تعلیمی اخراجات کو اپنے دوسرے تعمیری اور جلسوں کے خرچوں کو کم کر کے پورا کر سکتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے۔

ابتدائی درجات کے نصاب میں ''صرف ونحو'' کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ انکے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ ساتھ اس کی بہت سی مثالیں دے کر قاعدے کو ذہن نشین کرایا گیا ہو، اور پھر تمرینات کے ذریعہ طلباء کو ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو، عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوتی ہیں، مثلاً نحو وصرف کے ابتدائی اور متوسط درجات کے لئے (النحو الواضح) اور اعلی درجات کے لئے ''النحو الوافی'' ان کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔(۱)

دار العلوم دیوبند میں طریق کار شروع سے یہ ہے کہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد اور عربی کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طالب علم کو ایک پانچ سالہ نصاب سے گذارا جاتا تھا جو ''درجہ فارسی وریاضی'' کے نام سے موسوم تھا، اس درجے میں اردو، فارسی، دینیات، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اس قدر معیاری تعلیم دی جاتی تھی کہ ان مضامین میں ایک عالم دین کو جتنی واقفیت ضروری ہے ایک طرف وہ تمام تر حاصل ہو جاتی تھی اور دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس درجے پر اپنی تعلیم ختم کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ دین ودنیا کی اتنی بنیادی معلومات حاصل کر چکا ہوتا تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اچھی زندگی گذار سکے۔

لہٰذا یہ بات ہماری نظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق درجہ اعدادیہ کی مدت بڑھائی جائے اور اس میں اردو، فارسی، دینیات،

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۹۷، مفتی تقی عثمانی صاحب، زم زم بکڈپو

سیرت، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اتنی معیاری تعلیم دے دی جائے جو اگلے مضامین کے لئے مناسب بنیاد فراہم کر سکے۔(۱)

یہ درجہ اعدادیہ اسلامی علوم کے لئے ایک بہترین بنیاد کا کام دیتا تھا، اور جب طالب علم اس درجہ سے فارغ ہو کر عربی اور اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہوتا تو وہ اردو اور فارسی میں تحریر وانشاء کی اچھی صلاحیت کا حامل ہوتا تھا جو اس کو عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں بہت مدد فراہم کرتی تھی۔

یہ درجہ موجودہ دینی مدارس میں عرصے قبل یا تو ختم ہو چکا ہے یا اس نے گھٹتے گھٹتے ایک سال کے درجہ اعدادیہ کی صورت اختیار کر لی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم جب عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل شروع کرتا ہے تو عام طور پر اس کی تحریر خراب املاء اور انشاء ناقص اور بنیادی معلومات کمزور ہوتی ہیں، اس میں عربی صرف ونحو اور فقہ وغیرہ کے اہم مضامین کما حقہ سمجھنے اور انہیں اچھی طرح ہضم کرنے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی اور یہ مضامین اسے دشوار معلوم ہوتے ہیں اور جب بنیاد کمزور ہو جائے تو اس کمزوری کا اثر اگلے درجات تک پڑتا ہے۔(۲)

دارالعلوم کا طریقِ درس

دارالعلوم کے طریقہ تدریس کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ابتدائی..................متوسط..........................اعلی

ابتدائی درجات میں اساتذہ کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ طلباء میں کتاب کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اس لئے کتاب فہمی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

متوسط درجات میں کتاب فہمی کے ساتھ زیر درس کتاب کے علاوہ اس فن کے ایسے مباحث زیر بحث لائے جاتے ہیں جو طلباء کے ذہن میں وسعت پیدا کرنے اور ان کے ذہنی معیار کو بلند کرنے کے لئے ضروری ہوں۔

---

(۱) حوالہ مذکور

(۲) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں؟ ۵۰

اعلیٰ درجات میں زیر درس فن کی تعلیم و تفہیم پر مکمل زور دیا جاتا ہے؛ مگر اسی کے ساتھ کتاب فہمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

دارالعلوم کا طریقِ تعلیم یہ ہے کہ پہلے طالب علم کتاب کی عبارت پڑھتا ہے، استاذ کا فرض یہ ہے کہ پڑھی عبارت پر فنی حیثیت سے اس جامعیت کے ساتھ تقریر کرے جس میں متعلقہ عبارت کے ہر پہلو اور مسئلہ پر روشنی پڑ جائے، استاذ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بحث میں موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آجائیں، اور وہ اپنی تقریر کو عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کر دے؛ طلبہ درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا مستحق سمجھتا ہے کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اور جتنے اعتراض و مسائل زیر درس کے متعلق ان کے ذہن میں آئیں، ان کا اطمینان بخش جواب استاذ سے سن نہ لیں، استاذ کو آگے بڑھنے نہ دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو طالب علم پوری محنت کے ساتھ درس میں شریک ہوتے ہیں اور دوسری طرف استاذ کی بھی پوری محنت اور توجہ کے ساتھ پڑھانے پر اپنے کو مجبور کیا جاتا ہے۔

عموماً زیر درس کتابوں کے اسباق میں اساتذہ کی توجہ اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ طلبہ میں کتاب فہمی کی استعداد پیدا ہو جائے اور انہیں مصنف کی منشاء کو سمجھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔

علم الحدیث میں مشکوۃ المصابیح کے علاوہ حسب ذیل کتب نصاب میں داخل ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، موطا امام محمد، شرح معانی الآثار طحاوی، شمائل ترمذی۔

مذکورہ بالا کتب میں اول الذکر چار کتابوں کو بالاستیعاب ختم کرایا جائے اور ان کے مضامین پر پوری بحثیں ہوتی ہیں، بقیہ کتابوں کا استیعاب ضروری نہیں ہے، اساتذہ ان کتابوں کے چند اسباق میں اس قسم کی تقریر کر دیتے ہیں جس سے اس کتاب کا منشاء معلوم ہو جاتا ہے، اول الذکر اور موخر الذکر کتابوں میں چونکہ احادیث کا بیشتر حصہ مشترک ہوتا ہے،

اس لئے ان کے اسباق میں ہر ہر حدیث پر جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حدیث کے درس میں رواتِ حدیث پر جرح وتعدیل سے متعلق بقدر ضرورت مختصر بحث ہوتی ہے، اس کے بجائے فن حدیث پر توجہ زیادہ دی جاتی ہے؛ تاکہ استنباط مسائل اور طریق استخراج کی قوت زیادہ سے زیادہ طلبہ میں پیدا ہوجائے اور وہ ائمہ فقہ کے طریق استنباط کو پوری طرح سمجھ سکیں، البتہ اگر کسی سند یا راوی کی نسبت ائمہ مذاہب کو خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کو زیر بحث لایا جانا دوران سبق میں ناگزیر ہوتا ہے۔

مگر ائمہ اربعہ کے دلائل، ان کے اصول استخراج مسائل اور احناف کی جانب سے ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات اس سنجیدہ اور علمی طریق سے طلبہ کے ذہن نشیں کرائے جاتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی وقعت وعظمت کم نہیں ہونے پاتی، بلکہ نہایت وسعت نظر کے ساتھ ائمہ ثلاثہ کے دلائل وبراہین میں طلبہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، چونکہ اکثر کتب حدیث وتفسیر جو دارالعلوم کے نصاب میں شامل ہیں وہ شوافع اور مالکیہ کی مدون کی ہوئی ہیں، اس لئے ان ائمہ کے دلائل تو لازمی طور پر طلبہ کے سامنے آجاتے ہیں، اس وجہ سے اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ احناف کے مسلک کو دلائل وشواہد کی روشنی میں اس طرح پر راجح قرار دیں؛ تاکہ ائمہ ثلاثہ کی مجتہدانہ عظمت اپنی جگہ پر برقرار رہے اور اس میں کوئی فرق رونما نہ ہونے پائے۔

بڑی جماعت کے باذوق طلبہ متقدمین کی روش کے مطابق استاذ کی تقریر کو قلم بند کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، چنانچہ حضرت گنگوہی، اور حضرت شیخ الہند کے درس ترمذی کی تقریر نفح الشذی اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کے درس صحیح بخاری کی تقریر العرف الشذی اور فیض الباری جو چار ضخیم جلدوں میں ہے، اسی ذوقِ املا کا نتیجہ ہیں، اس طرح کی املائی تقریروں میں سے یہ چند مثالیں ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں، ورنہ جو دعوت طباعت کے انتظار میں ہنوز چشمِ راہ ہیں ان کا شمار بھی مشکل ہے، متاعِ علمی کے یہ جواہر ریزے بکثرت فضلائے دارالعلوم کے پاس موجود ہیں۔

استاذ کی تقریر و تعلیم اردو میں ہوتی ہے جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔(۱)

دار العلوم کی تعلیمی خصوصیات

تعلیم جس قدر سادہ اور مختصر لفظ ہے، اتنا ہی اہم اور ورح کی گہرائی تک کو متاثر کرنے والا ہے، تعلیم محض نقوش وحروف، خطوط آواز، بولیوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا نام نہیں ہے؛ بلکہ ایسی ذہنی ودماغی اور علمی تربیت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان کی فطری قوت وصلاحیت کو ابھار کر سنوارنا اور منظم کرنا ہے، اور انسانی جذبات وحسیات کو ایک عمدہ اور اعلی نصب العین کے تحت لاکر مہذب اور شائستہ بنانا ہے، تاکہ نوع انسانی کے لئے مفید ثمرات ونتائج بروئے کار لائے جاسکیں، انسان کو اس کی اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے اور جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر تعلیم صرف نہ جانی ہوئی چیزوں کی واقفیت تک محدود ہے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے؛ لیکن اگر اسے عمل کا پابند بنا دیا جائے تو پھر اس کی دشواریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، اگرچہ علم کی قدر دنیا کی ہر قوم کرتی ہے، لیکن علم کی نسبت مسلمانوں کا جو نظریہ ہے وہ دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، غیر مسلم علم اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے دنیا میں قوت وعظمت اور ترقی وبرتری حاصل کریں علم کو عام طور پر حصولِ دولت کے لئے وسیلہ سمجھا جاتا ہے، مگر مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے علم کو وسیلے کے بجائے مقصد سمجھا ہے، ذریعہ معاش نہیں سمجھا، مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے، انہوں نے علم کو کبھی اس لئے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ معاش حاصل کریں، مسلمانوں کے نزدیک حصول علم ایک فرض ہے، جس کو پورا کر کے مسلمان علاوہ دنیوی مفاد کے اخروی نجات بھی حاصل کرتا ہے، سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة" یعنی ہر مسلمان مرد وعورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔

---

(۱) تاریخ دار العلوم: ۲۷۹۔۲۸۲، سید محبوب رضوی، طبع لاہور، پاکستان

یہ فرضیت عمل ہی کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے اور ہر شخص پر بقدر ضرورت واجب ہے، تاریخ کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک سر بلند نہیں ہوسکی جب تک اس میں علم وعمل کی قوتیں بیدار نہیں ہوئی، تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت روحانی اور اخلاقی تمدنی اور تہذیبی ترقی ہوسکتی ہے جو انسانی تخلیق کا مقصد اعلی ہے، ایسی ترقی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہر طالب علم کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی بہتر سے بہتر طریقے پر نشوونما کرسکے، بالفاظ دیگر معاشرے کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ تمام ایسی سہولتیں مہیا کردے، جس سے ہر طالب علم اپنے بہترین جوہر دکھا سکے، درحقیقت علم سے قومیں بنتی ہیں اور جہل سے بگڑتی ہیں، بناء بریں ضروری ہے کہ ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں، اسلام نے علم کو سماج کے مخصوص طبقوں کی اجارہ داری سے نجات دلا کر انسانیت پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔(۱)

مفت تعلیم

ہمارے قدیم نظام تعلیم کی یہی روایت دارالعلوم کا طرہ امتیاز ہیں، یہاں بھی طلباء سے فیس نہیں لی جاتی، غیر مستطیع اور ضرورت مند طلباء کو دارالعلوم کی جانب سے کھانا، کپڑا اور نقد وظائف دیئے جاتے ہیں، زیر درس کتابیں اور قیام کے لئے جگہ ہر مستطیع وغیر مستطیع طالب کے لئے مفت مہیا کی جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم صرف دولت مندوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ غریب سے غریب شخص بھی اس کے ذریعے سے اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرسکتا ہے، اس کا فیض عام اور بقار استعداد تام ہے۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں وہ پہلی تعلیم گاہ ہے جو مفت تعلیم (Free Educuation) کی بنیاد پر قائم ہوئی، دارالعلوم ایک صدی سے زیادہ مدت سے اس مفت نظام تعلیم کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔(۲)

---

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند: ۲/ ۴۶۵

(۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند: ۲/ ۲۹۲

اوقات تعلیم

جیسا کہ عموما مدارس عربیہ کا معمول ہے کہ دار العلوم میں بھی درس کے اوقات دو حصوں پر تقسیم ہیں، پہلا حصہ چار گھنٹے کا ہے اور دوسرا دو گھنٹے کا، موسم گرما میں صبح ۶ بجے سے ۱۰ بجے تک اور بعد ظہر ۳-۱/۲ (ساڑھے تین) بجے تک درس کے اوقات ہیں، دار العلوم میں تعلیمی گھنٹہ پورے ۶۰ منٹ کا ہوتا ہے، موسم کے تغیر کے ساتھ تدریجا اوقات بدلتے رہتے ہیں، یعنی چھ سے سوا چھ، اور دو سے سوا دو، اسی طرح آٹھ سے پونے آٹھ اور ساڑھے تین سے سوا تین۔

عام طور پر شوال میں داخلے کے بعد اوائل ذی قعدہ سے اسباق شروع ہوجاتے ہیں، اور آخر رجب تک جاری رہتے ہیں، شعبان میں سالانہ امتحان ہوتا ہے، جو تقریبا تین ہفتوں تک جاری رہتا ہے، شعبان کے آخر ہفتے سے عام تعطیل ہوتی ہے، جو شوال کے پہلے ہفتے تک رہتی ہے، دوسرے ہفتے سے داخلہ شروع ہوجاتا ہے، جمعہ، ہفتہ واری تعطیل کا دن ہے۔

تعلیمی وظائف

مدارس عربیہ میں تعلیم پانے والے طلباء اکثر و بیشتر غریب اور نادار ہوتے ہیں، ان کے سرپرستوں میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت میں روپیہ خرچ کرکے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرسکیں۔

ہر ترقی کرنے والی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو، چنانچہ صدہا برس کے تجربے کے بعد بیسویں صدی کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہئے، اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا، تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے، جدید تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے لئے خاص ہوکر رہ گئی ہے جو اپنے اخراجات کے خود متحمل ہوسکیں، گویا عصری تعلیم کے حصول میں غریبوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں تعلیمی مصارف کو طلباء کے بجائے درسگاہوں کے ذمہ رکھا گیا ہے، اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس نہیں لی جاتی اور نہ صرف یہ بلکہ طلباء کے لئے زیر درس کتابوں کا انتظام بھی مفت کیا جاتا ہے؛ بلکہ نادار اور غریب طلباء کو درس گاہوں کی جانب سے کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں، دارالعلوم میں شروع ہی سے اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ غریب اور نادار طلباء کے قیام وطعام، لباس، مصارف علاج اور دوسری لازمی ضروریات کے تکفل کا بار طلباء کے بجائے دارالعلوم کی جانب سے برداشت کیا جائے، الا یہ کہ جو طلباء خود اپنے تکفل پر قدرت رکھتے ہوں۔

مگر اجرائے وظائف میں یہ لحاظ رکھنا کہ طلباء میں تعلیمی امور سے بے رغبتی اور مفت خوری کی عادت پیدا نہ ہونے پائے، اور وہ ہمہ تن تعلیمی مشاغل میں منہمک رہیں۔

اس لئے تمام وظائف ایک سال کے لئے جاری کئے جاتے ہیں، سال آئندہ میں ان کی از سر نو تجدید کرائی جاتی ہے، طالب علم اگر کسی وقت بھی امتحان میں ناکامیاب ہوتا ہے تو وظیفہ بند کر دیا جاتا ہے، اور جب تک وہ اجرائے امداد کے قانون کے مطابق اوسط درجے کی کامیابی امتحان میں حاصل نہ کر لے وظیفہ جاری نہیں ہوتا، البتہ دارالاقامہ میں قیام کے لئے اور کتب خانہ سے سال متعلقہ کی زیر درس کتابیں بلا تخصیص مستحق وغیر مستحق ہر طالب علم کو مستعار طریقے پر مفت دی جاتی ہیں۔

وظیفہ حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل شرائط ضروری ہیں:

الف: طالب علم کم از کم النحو الواضح اور شرح تہذیب وغیرہ کتب (جو دوسرے سال میں پڑھائی جاتی ہیں) پڑھ چکا ہو۔

ب: مذکورہ کتب کے امتحان میں پچاس نمبروں میں کم از کم ۳۷ نمبر حاصل کئے ہوں، جو کامیابی کا درجہ اوسط ہے۔

ج۔ غربت کی وجہ سے امداد کا طلب گار ہو۔

وظیفے کی دو قسمیں ہیں کھانا......اور..........نقد

کھانے کے انتظام کے لئے مطبخ ہے، جس سے ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں جو ۲۵۰ گرام (خشک) آٹے کی ہوتی ہیں، دوپہر کو دال اور شام کو کھانے میں گوشت دیا جاتا ہے۔

کھانے کے علاوہ مختلف مقدار میں نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں، جو پچاس روپیہ (مرتب کے دور میں یہ وظیفہ ۷۰، ۲۰۰۱ تا ۲۰۰۴ میں روپیئے ہوا کرتا تھا) ماہانہ ہوتے ہیں، یہ دونوں قسم کے وظائف دارالعلوم کی اصطلاح میں ''امداد'' کہلاتے ہیں، جن طلباء کی ''امداد'' جاری ہوجاتی ہے، ان کو سال بھر میں چار جوڑے کپڑے دو جوڑی جوتے اور سردی کے موسم میں لحاف بھی دیا جاتا ہے۔

حجروں میں روشنی اور کپڑوں کی دھلائی کے لئے ماہانہ وظیفہ ہے، بیمار طلباء کے علاج کے لئے معالج مقرر ہیں، طلباء کو دوا مفت مہیا کی جاتی ہے اور کھانا پرہیز گاری ملتا ہے۔

ان امور کے علاوہ احاطہ دارالعلوم کی تمام گذرگاہوں میں روشنی، اقامت گاہوں میں پانی نل اور موسم سرما میں مسجد دارالعلوم میں گرم پانی کا انتظام اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم میں داخل تمام طلباء کو کتب خانے سے زیر درس کتابیں کسی معاوضے کے لئے بغیر ایک سال کے لئے مستعار دی جاتی ہیں، طالب علم کو مالی امداد ملتی ہو یا نہ ملتی ہو دونوں صورتوں میں اس سے دارالاقامہ کے کمرے کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔(۱)

درجاتِ تعلیم

دارالعلوم میں ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے، دارالعلوم کا سب سے اہم کورس ''فاضل'' ہے، جو آٹھ سال پر مشتمل ہوتا ہے، فاضل کورس کو عالمیت اور مولویت وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے، فاضل کورس کے پہلے چار سالوں کا نظام ''مدرسہ ثانویہ'' کی صورت میں علاحدہ ہے، جس میں عربی صرف ونحو، عربی انشاء، منطق، ترجمہ قرآن، تاریخ اور مبادی

(۱) تاریخ دارالعلوم: ۳۰۱/۲

کی تعلیم دی جاتی ہے، جب کہ آخری چار سالوں میں تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، معانی و بلاغت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، فاضل کورس کا آخری سال ''دورہ حدیث'' سے موسوم ہے، جس میں صحاح ستہ کے ساتھ موطا امام مالک، موطا امام محمد، طحاوی شریف اور شمائل ترمذی کتب حدیث روایۃ ودرایۃ پڑھائی جاتی ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل کورس کو متعدد عصری جامعات جیسے یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ میں بے اے کے مساوی تسلیم کیا جاتا ہے۔

فاضل کے بعد تکمیلات کے نام سے تخصصات کے شعبے ہیں، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، علوم اسلامی، ادب عربی، تقابل ادیان وفرق وغیرہ موضوعات میں تخصص کے درجات ہیں، علوم اسلامیہ کے علاوہ انگریزی زبان وادب کمپیوٹر اپلیکیشن، صحافت وغیرہ کے کورسز بھی موجود ہیں، جن سے طلبہ حسب ضابطہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

فاضل کورس (مدت: آٹھ سال)

درجات ثانویہ

(۱)　سال اول عربی

(۲)　سال دوم عربی

(۳)　سال سوم عربی

(۴)　سال چہارم عربی

درجات متوسطہ:

(۵)　سال پنجم عربی

(۶)　سال ششم عربی

درجات عالیہ

(۷)　سال ہفتم عربی (موقوف علیہ)

(۸)　سال ہشتم (دورۂ حدیث)

نصاب اردو دینیات (دارالعلوم دیوبند)

درجہ اطفال	نورانی قاعدہ مکمل، قاعدہ اردو (بعد ششماہی) گنتی (۱۰۰ تک لکھنا پڑھنا) تختی لکھنا، کلمات (پہلا اور دوسرا کلمہ حفظ)
درجہ اول	قرآن شریف (پارہ عم/الم/ناظرہ اور تا سورۂ فیل حفظ ترتیب معکوس) اردو کی پہلی کتاب مولوی محمد اسماعیل صاحب، اردو لکھنا، دینی تعلیم کا رسالہ اور، نماز وضو کی (عملی مشق) کلمات (تین کلمے حفظ) بیسک حساب حصہ اول، پہاڑے (۱۰ تک) بھاشکرن پہلا حصہ (حروف واترا شناسی از کتاب) نقل ہندی از کتاب
درجہ دوم	قرآن شریف از پارہ (۲ تا ناظرہ اور تا سورۃ الشّمس حفظ) دینی تعلیم کا رسالہ حصہ دوم وسوم، اردو کی دوسری کتاب، نماز وضو کی (عملی مشق) کلمات (پانچوں کلمے حفظ) نقل اردو اور آسان املا از کتاب، جغرافیہ، بھاشکرن دوسرا حصہ، نقل ہندی، بیسک حساب حصہ دوم پہاڑے (۲۰) تک
درجہ سوم	قرآن شریف پارہ (از ۱۳ تا ختم ناظرہ اور تا سورۃ انشقاق حفظ) دینی تعلیم کا رسالہ حصہ چہارم، وپنجم، اردو کی تیسری کتاب، نقل اردو، بھاشکرن تیسرا حصہ، نقل ہندی، بیسک حساب حصہ سوم، چھ کلمے حفظ، وضو ونماز کی عملی مشق اور دعائے نماز جنازہ، قواعد اردو اول (نثار بیگ)۔
فارسی چہارم	تاریخ الاسلام حصہ اول، اردو کی چوتھی کتاب، املا اردو، آمدنامہ مکمل، رہبر فارسی، تیسیر المبتدی، فارسی کی پہلی کتاب، گلزار دبستان حصہ اول ودوم، کریما، بھاشکرن، چوتھا حصہ املا ہندی، انگلش پرائمر، بیسک حساب حصہ چہارم، سائنس آؤ کر کے سیکھیں، حصہ اول۔
فارسی پنجم	تاریخ الاسلام حصہ دوم، مشاہیر دارالعلوم دیوبند، اردو کی پانچویں کتاب، اردو خطوط نویسی (املاء) فارسی کا معلم، گلستان مکمل (باستثناء باب پنجم) بوستان (از ابتداء تا ختم باب اول) بھاشکرن، پانچواں حصہ، املاء ہندی، انگلش رینبو حصہ پنجم، بیسک حساب حصہ پنجم

نصابِ تعلیم شعبہ دینیات (جامعۃ اسلامیہ اشاعۃ العلوم اکل کوا)

سال		
سال اول	اشاعتی احسن القواعد، بعدہ پارہ عم اشاعتی اردو قاعدہ دینی تعلیم کا رسالہ نمبرا مع تحریر تعلیم الاسلام نمبرا نورانی قاعدہ چہل حدیث مراٹھی، علم بالقلم انگریزی	اول کلمہ مع صحت وترجمہ، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم کلمات، ایمان مجمل ومفصل مع صحت، کھانے سے پہلے اور بعد کی دعا، دعوت کھانے اور دودھ پینے کی دعا، سونے سے پہلے اور سوکر اٹھنے کی دعائیں، مسجد میں دخول وخروج اور اذان ونماز کے بعد کی دعا
سال دوم	قرآن شریف پارہ نمبر ۱ تا پارہ نمبر ۱۲ مکمل دینی تعلیم کا رسالہ نمبر ۲، ۳، ۴، تعلیم الاسلام کا حصہ نمبر ۲ اردو زبان کی پہلی دوسری مع تحریر صحت وتجوید مراٹھی حساب انگریزی	آدابِ تلاوت کلام پاک، کھانے اور سونے کی سنتیں، نمازوں کی رکعتیں، نماز کی جملہ دعائیں، کپڑا پہننے، نیز چاند دیکھنے کی دعائیں، فرائض وضو، سنن وضو، مکروہات وضو، مستحبات وضو، نواقض وضو، اذان ونماز کی عملی مشق، چہل ربنا مع صحت ترجمہ، اسمائے حسنی
سال سوم	قرآن شریف پارہ نمبر ۳ تا پارہ نمبر ۳۰ مکمل دینی تعلیم کا رسالہ نمبر ۵، ۶، ۷۔ تعلیم الاسلام کا حصہ نمبر ۳، ۴۔ اردو زبان کی تیسری مع تحریر صحت وتجوید مراٹھی حساب انگریزی	فرائض نماز، واجبات نماز، سنن نماز، مکروہات نماز، مستحبات نماز، فرائض غسل، سنن غسل، نماز جنازہ کی مکمل دعائیں، تیمم کا طریقہ، چہل ربنا مع صحت ترجمہ، اسمائے حسنی۔

نصاب تعلیم فاضل کورس (آٹھ سالہ) دارالعلوم دیوبند

سال اول عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
تجوید القرآن	۶	اصول التجوید (قاری جمشید علی قاسمی) پارہ عم حفظ صحیح مخارج کے ساتھ، مشق ربع اول
سیرت	۶	سیرت خاتم الانبیاء (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)
صرف	۶	میزان (مولانا سراج الدین عثمان اودھی۔) منشعب (مولانا حمزہ بدایونیؒ) پنج گنج (مولانا صفی رودولویؒ)
نحو	۶	نحو میر (سید شریف جرجانی) شرح مائۃ عامل (سید شریف جرجانی) ترکیب کے لئے
تمرین عربی	۶	القراءۃ الواضحہ (مولانا وحید الزمان کیرانویؒ) مفتاح العربیۃ ۱/ ۲ (مولانا نور عالم خلیل امینی)

سال دوم عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
تجوید القرآن	۶	جمال القرآن (حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) مع مشق بقیہ پارہ عم
صرف	۶	علم الصیغہ (مفتی عنایت علی کاکورویؒ) فصول اکبری (قاضی علی اکبر الہ آبادیؒ)
نحو	۶	ہدایۃ النحو (سراج الدین عثمان اودھیؒ)
تمرین عربی	۶	القراء ۃ الواضحہ دوم (مولانا وحید الزمان کیرانویؒ) نفحۃ الادب (مولانا وحید الزمان کرانویؒ)

فقہ	۶	نورالایضاح (شیخ حسن بن علی الشرنبلالیؒ) مختصرالقدوری (شیخ ابوالحسن محمد بن جعفر القدوریؒ) تاختم کتاب الحج
منطق	۶	آسان منطق (مولانا عبد اللہ گنگوہیؒ) المرقاۃ (علامہ فضل حق خیر آبادی)

سال سوم عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
ترجمۂ قرآن	۶	ترجمہ قرآن (سورۃ ق سے آخر تک، پہلے پارہ عم اس کے بعد سورہ ق سے)
عربی ادب وحدیث	۶	نفحۃ العرب (مولانا اعزاز علی امروہویؒ) تاختم عنوان نبذۃ من ذکاوۃ العرب۔اس کے بعد مشکاۃ الآثار (مولانا محمد میاںؒ) مکمل
فقہ	۶	مختصرالقدوری (شیخ ابوالحسن محمد بن جعفر القدوریؒ) کتاب البیوع تاختم کتاب
نحو	۶	کافیہ (ابن حاجب)
تمرین نحو	۶	القرائۃ الواضحہ سوم (مولانا وحید الزماں کیرانویؒ) مکمل بعدہ تعلیم المتعلم
منطق	۶	شرح التہذیب (شیخ عبداللہ الیزدیؒ)
مطالعہ تاریخ	-----	تاریخ ملت: خلافت راشدہ (قاضی زین العابدین میرٹھیؒ، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادیؒ)

سال چہارم عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
ترجمۂ قرآن	۶	سورہ یوسف سے سورہ ق تک
حدیث	۶	الفیۃ الحدیث (مولانا محمد منظور نعمانیؒ)
فقہ	۶	شرح وقایہ (صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعودؒ) جلد اول، جلد دوم تا کتاب العتاق
اصول فقہ	۶	تسہیل الاصول (مولانا ریاست علی بجنوریؒ، مولانا نعمت اللہ اعظمی) اصول الشاشی (نظام الدین ابوعلی احمد بن محمد الشاشیؒ)
بلاغت	۶	دروس البلاغۃ (حفنی ناصف وغیرہ)
منطق	۶	قطبی (قطب الدین رازیؒ)
تاریخ اسلام	۳	تاریخ ملت : خلافت امیہ وعباسیہ وعثمانیہ(قاضی زین العابدین میرٹھیؒ، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادیؒ)
علوم عصریہ	۳	تاریخ، جغرافیہ، علم مدنیت

سال پنجم عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
ترجمۂ قرآن	۶	از سورہ فاتحہ تا ختم سورۂ ہود
عقیدہ	۳	العقیدۃ الطحاویہ (امام طحاویؒ) سلم العلوم کے بعد
فقہ	۶	ہدایہ (شیخ ابوالحسن مرغینانیؒ) جلد اول
اصول فقہ	۶	نورالانوار (ملاجیونؒ)
ادب عربی	۶	المقامات (الحریری)
بلاغت	۶	مختصر المعانی (شیخ سعد الدین تفتازانی)

منطق	۳	سلم العلوم (ملا محب اللہ بہاری)
تاریخ اسلام	مطالعہ	سلاطین ہند (قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ، مفتی انتظام اللہ شہابی)

سال ششم عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
تفسیر قرآن	۶	جلالین (شیخ جلال الدین محلی، وشیخ جلال الدین سیوطیؒ)
اصول تفسیر	۳	الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ)
فقہ	۶	ہدایہ (شیخ ابوالحسن مرغینانیؒ) جلد دوم
اصول فقہ	۳	حسامی (شیخ حسام الدین اخسکتیؒ) الفوز الکبیر کے بعد
ادب عربی	۶	قصائد منتخبہ دیوان متنبی دیوان حماسہ (ابوتمام) باب الأدب
فلسفہ	۶	مبادیٔ الفلسفہ (مفتی سعید احمد پالن پوری) المیبذی (قاضی امام حسین المیبذیؒ)
سیرت	مطالعہ	اصح السیر (مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ)

سال ہفتم عربی

فن	ہفتہ واری گھنٹے	نصاب
حدیث شریف	۱۸	مشکاۃ المصابیح (شیخ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزیؒ)
اصول حدیث	۳	نخبۃ الفکر (علامہ ابن حجر العسقلانیؒ) مقدمہ (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ)
عقیدہ	۶	شرح العقائد النسفیہ (علامہ سعد الدین تفتازانیؒ)

فقہ	۱۲	ہدایہ (شیخ ابوالحسن مرغینانیؒ) جلد سوم و چہارم
علم الفرائض	۳	سراجی (علامہ سجاوندیؒ) شرح عقائد کے بعد

سال ہشتم (دورہ حدیث)

حدیث	۱۸	صحیح البخاری (امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ)
حدیث	۱۲	صحیح مسلم (امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ)
حدیث	۶	سنن ابی داؤد (امام سلیمان الاشعث السجستانیؒ)
حدیث	۱۸	سنن الترمذی (امام محمد بن عیسی الترمذیؒ)
حدیث	۳	سنن النسائی (امام احمد بن شعیب النسائیؒ)
حدیث	۱	سنن ابن ماجہ (امام محمد بن یزید القزوینیؒ) سنن نسائی کے بعد
حدیث	۲	شمائل ترمذی (امام محمد بن عیسی الترمذیؒ) سنن نسائی کے بعد
حدیث	۲	شرح معانی الآثار (امام احمد بن محمد الطحاویؒ)
حدیث	۱	مؤطا امام مالک بروایۃ یحیی اللیثیؒ (جمعہ کے دن)
حدیث	۱	مؤطا بروایۃ امام محمد بن حسن الشیبانیؒ
تجوید	خارج	تجوید و مشق

نوٹ: دورہ حدیث میں مغرب اور عشاء کے بعد بھی اسباق ہیں۔(۱)

(۱) دارالعلوم دیوبند کی جامع و مختصر تاریخ: ۲۱۹-۲۲۵، مولانا محمد اللہ، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

عالمیت کے بنیادی اصول

ضروری تجوید

تجربہ سب کا یہ ہی ہے کہ بعض وہ طلبہ جو بغیر حفظ کے عالمیت یا ناپختہ حفظ وناظرہ کر کے عالمیت میں داخلہ لیتے ہیں ان کو ضروری تجوید سکھانا ضروری ہے، گجرات وجنوبی ہند (بنگلور، ٹمل ناڈ) کے بہت سے مدارس قراءت حفص وقراءت عشرہ کی بھی نصاب عالمیت میں تکمیل کروادیتے ہیں، دارالعلوم دیوبند نے خود اپنے فضلاء کو سند فراغت کی شرط رکھی ہے، حفظ پارۂ عم اور تجوید کو شرط قرار دیا ہے، خارجی اوقات میں تجوید وقراءت کے شعبہ سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا رہتا ہے، طریقۂ کار یہ ہونا چاہئے کہ تعلیمی سال کے ابتداء میں جدید داخلہ لینے والوں کا جائزہ لے کر بعد نمازِ فجر مستقل اس کی درسگاہ قائم کی جاسکتی ہے۔

تعلیمی ترقی اچھے، باصلاحیت، ذی استعداد، فکرمند، دیندار، سنجیدہ اور خوش مزاج اساتذہ پر موقوف ہے، نہ حسین وآسان نصاب پر کہ علم (درسینہ نہ درسفینہ) لہٰذا ہر جگہ نصاب میں تبدیلی وفرق پایا جانا ناگزیر ہے، البتہ اس میں جمود سے احتراز ضروری ہے، ہم نے اس سلسلہ میں ہنگامی اقدامات کئے ہیں، ابتداء میں ہزار کوششوں کے باوجود تمام شعبوں کا ناظرہ چوپٹ تھا تو ساری کتب بند کرا کے دلیری سے صرف نورانی قاعدہ پر محنت کرائی گئی، پھر نحو صرف کی کمزوری کو دور کرنے کے لئے دو ماہ تک دوم سے اوپر دورہ تک تمام اساتذہ وطلبہ پر تسہیل النحو والصرف اور شرح مأة عامل کی زبردست محنت کرائی گئی، اس طرح ضروری اقدامات ہوتے رہنے چاہئے اور اس سلسلہ میں مخلوق سے زیادہ خالق کے سامنے جوابدہی کا استحضار ہونا چاہئے۔(۱)

---

(۱) معین المدارس: ۹۴، مفتی شاکر خان قاسمی

شعبۂ عالمیت کے ذمہ دار کے لئے ہدایات

۱۔ صبح و دوپہر طلبہ کو کلاس میں بٹھانا اور تاخیر سے آنے والے طلبہ کو سزا دینا۔

۲۔ چل پھر کر کلاسوں کی نگرانی کرنا اور شروع کے دس منٹ میں سبق ہوا یا نہیں جانچنا۔

۳۔ ہر مہینہ کے اخیر میں ماہانہ تفصیلی جانچ لینا اور تعلیمی رپورٹ پیش کرنا۔

۴۔ اساتذہ کتاب اور طلبہ کو مد نظر رکھتے ہوئے مقدار خواندگی یومیہ ماہانہ ششماہی اور سالانہ تیار کرنا۔

۵۔ اساتذہ کی گھنٹہ دو گھنٹہ کی رخصت اور تاخیر کا وقت لکھنا۔

۶۔ ہر مہینہ کے آخری ایام میں وضع شدہ تنخواہ کی فہرست بنا کر دینا۔

۷۔ شعبہ سے متعلق اساتذہ کی مغرب بعد اور عشاء کے بعد کی نگرانی طئے کرنا۔

۸۔ ہر جمعہ کو بعد مغرب طلبہ کی کاپی چیک کرنا کہ سبق نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔

۹۔ تاریخ لکھنے کے ذمہ دار طلبہ سے تاریخ کے بارے میں پوچھتے رہنا اور لکھی ہوئی تاریخ کو چیک کرنا۔

۱۰۔ طلبہ سے تعلیمی استخبار لینا اور اس کا مناسب حل پیش کرنا۔

۱۱۔ ہر کلاس میں جو عام طلبہ کی ضرورت کی چیزیں ہیں جیسے سفیدہ کی بوتل، موم بتی، دیا سلائی وغیرہ کلاس ٹیچرس سے ملکر منگوانا۔

۱۲۔ شعبہ سے متعلق ضرورت کی چیزیں منگوانا اور سالانہ چھٹی کے وقت آفس میں ان چیزوں کو جمع کرنا۔

۱۳۔ اساتذہ بغیر مطالعہ کے کوئی کتاب نہ پڑھائیں اور سبق کا ناغہ بالکل نہ کیا جائے۔

۱۴۔ دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جو کتاب نہ پڑھا سکیں ناظم تعلیمات کو مطلع کر دیں کہ یہ کتاب کسی دوسرے کو دے دی جائے، اس میں طلبہ کا بہت نقصان ہوتا ہے، ان کو شکایت ہوتی ہے۔

۱۵۔ سبق پورے وقت پڑھایا جائے۔

۱۶۔ جو گھنٹہ خالی ہو اس کو مطالعہ میں صرف کریں؛ تا کہ علمی استعداد بہتر ہو، ادھر ادھر بیٹھ کر وقت ضائع نہ کریں۔

۱۷۔ چھوٹی کتابوں کا سبق لازمی طور پر بغیر سنے ہوئے نہ پڑھایا جائے، بڑی کتابوں میں اگر وقت میں گنجائش ہو تو سن لیا کریں ورنہ نہیں۔

۱۸۔ سبق میں عبارت کی صحت پر زور دیا جائے۔

۱۹۔ صرف ونحو کی کتابوں میں خصوصا سوالات لکھ کر طالب علم کو دیئے جائیں؛ تا کہ ان کو حل کر کے دوسرے دن سنائیں۔

۲۰۔ ہفتہ میں ایک دن مضمون نگاری کے لئے رکھا جائے۔

۲۱۔ جمعرات کی شام کو تقریر اپنی نگرانی میں کرائی جائے۔(۱)

تکرار کا نظام

تکرار و مذاکراہ کا نظام بالعموم طلبہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ذہین ذمہ داری کا احساس رکھنے والے طلبہ تو حصہ لیتے ہیں؛ مگر غبی، متوسط اور بعض باصلاحیت، مگر کاہل طلبہ اسکا بوجھ نہیں اٹھاتے ،قوتِ گویائی اور مشکل کشائی کا سلیقہ تکرار اسے بآسانی حاصل ہوتا ہے، مدرسین، انتظامیہ یا ذمہ دار الاقامہ کے نگران کار معلمین کو اس کا نظام طئے کرنا چاہئے ،تکرار کی جماعت بندی، اور ذمہ داری طالب پر تقسیم ہونا چاہئے ،ہم مزاج جمع ہو کر وقت ضائع کرتے ہیں، کمزور طلبہ کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، کمزور اور طاقتور کی جوڑی طئے ہونا چاہئے ،تبھی دوسرے دن درس میں سمجھا جاسکتا ہے، تمام طلبہ مخاطب بن سکتے ہیں، آموختہ پر بھی گرفت رہے گی، مغرب اور عشاء کے بعد کا وقت فضولیات ولغویات سے بچ جائے گا، مغرب سے کچھ پہلے یا فورا بعد ذمہ دار طالب علم اپنی کتاب کی تکرار کی تیاری کر لے۔

دورے اور تربیتی کیمپ، یا مذکّرے اور محاضرے

فن اور کتاب کو مکمل گرفت میں لانے یا آموختہ کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک طریقہ

(۱) تحفہ مدارس، افادات حضرت صدیق صاحب باندوی، مرتب مفتی زید مظاہری: نعیمیہ بک ڈپو دیوبند

دورے اور مذکروں کا بھی ہے، سال کی ابتداء میں یا کسی فن کے اختتام پر (جیسے صرف جماعت دو میں علم الصیغو سے نحو جماعت سوم میں کافیہ، شرح جامی پر، منطق جماعت چہارم پر پنجم میں سلم قطبی پر بلاغت میں مختصر المعانی پر، فقہ ششم میں ہدایہ اخیرین پر، فلسفہ میبذی پر، تفسیر ہفتم میں جلالین پر ختم ہوجاتا ہے) دورۂ فن یا مختصر مذکروں کے ذریعہ سے فن میں پختگی بڑھائی جاسکتی ہے یا کسی تجربہ کار، مشاق ماہر فن سے محاضرہ، پیش کروا کر ذوق کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے، فن کے مشکلات، تمثیلات، قدیم وجدید، عرب وعجم کے تجربات، تاریخ فن، کتب فن اور پہلیوں کے ذریعہ دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔

استیعاب بھی ہوگا اور اختصار بھی، تدریج وتسہیل یکساں، تمرین وتدوین کے ماحول میں کمزور طلبہ کا ذہن بھی لگ جائے گا، ذہن کے آفاق کھلیں گے، رسمی طریقے سے ہٹ کر اس انداز میں نیا نشاط اور استقلال ہوگا، رسائل تعلیم، فنون آلیہ کے بارے میں بالخصوص لگے بندھے طریقے کو منصوص نہیں سمجھنا چاہئے، اجتہاد وتجدد کا عمل جاری رہے، ہر مفید تجربہ کو لیا جائے، عالم عرب اور ہندوپاک کے بعض مدارس میں یہ طریقہ رائج ہے۔

نصاب کتب کی تکمیل

بہت سے مدارس میں نصاب کی تکمیل پر توجہ نہیں ہے، یہاں تک کہ ابتدائی درجات کی کتابیں بھی باقاعدہ اور پوری پڑھانے کا اہتمام نہیں ہے، یہ چیز طلبہ کی استعداد کو کمزور ہونے کا بنیادی سبب ہے، ضروری ہے کہ تمام اساتذہ کرام نصاب کی تکمیل کا اہتمام کریں، اور ذمہ داران مدارس اس کی نگرانی کریں اور اس کام میں اساتذہ کا تعاون فرمائیں، ایام تعلیم میں غیر تدریسی ذمہ داریوں کا باران پر کم سے کم ڈالیں؛ تاکہ وہ نہایت عمدگی سے نصاب کی تکمیل کراسکیں۔(۱)

آغاز کتاب اور ختم کتاب اس لئے لکھنا ہے کہ بہت سی کتابوں کے شروع میں ''ضخیم مقدمے'' لکھے ہوتے ہیں، تو اصل کتاب کہاں سے شروع ہے یہ معلوم ہوجائے، ضخامت

(۱) خطبہ صدارت رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند: ۵-۶، حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم

جاننے کے لئے ختم کتاب لکھا جائے ، اس میں سے سالانہ کل معینہ مقدار خواندگی طئے کی جائے ، یہ کاغذ ابتداء ہی میں اساتذہ کو دے دیا جائے اور سال بھر ان کے پاس رہے، عدم تکمیل کی وجہ جاننے کے بعد معاف بھی کیا جاسکتا ہے،اور باز پرس بھی کی جاسکتی ہے۔

طلبہ کو بھی ان کی ہر کتاب کی یومیہ مقدار خواندگی بتادی جائے۔(۱)

حضرت الامام نانوتوی علیہ الرحمہ نے اصولِ ہشت گانہ میں تکمیل نصاب کے اہتمام کا ذکر کیا ہے ، مقدارِ نصاب کو ایام تعلیم اور اشہر تعلیم پر (چھٹیوں ، جلسوں ، ممکنہ تعطیلات ، اتفاقی رخصتوں کا لحاظ کرتے ہوئے) تقسیم کیا جائے ، کوشش ہو کہ سال بھر رفتار برابر رہے ، مدرس یا انتظامیہ باہمی مشورہ سے اس کام کو ابتداء سال ہی میں انجام دے کر ہر ماہ موجودہ مقدار خواندہ اور مطلوبہ مقدار خواندگی کی یاد دہانی کرواتے رہے ، کسی استاذ کے اسفار یا امراض جیسے اعذار کی وجہ سے پیشگی معاون طئے کر دیا جائے ، ورنہ متعلق فن یا نصاب کتاب کمزور ہو جائے گی ، پھر زندگی میں نہ جانے طالب علم کو وہ فن یا کتاب پڑھنے کا موقعہ ملے گا بھی یا نہیں ، پھر دین کا مجموعی تصور بھی سامنے نہ آئے تو فارغ ہونے والا عادۃً بمشکل اپنی کمزوری کا ازالہ کر پائے گا ، کوئی فن یا کتاب وقت گذاری کے لئے رکھا گیا ، کسی بلاغت یا کتاب کی نا قدری اسی طالب علم کی صلاحیت سازی میں ضرور جھول پیدا کردے گی ، اجرت تدریس کے حرام ہونے یا عمل تدریس میں خیانت کا جرم ہماری گردن پر نہ آجائے۔

تمرین وتدریب

تمرین ، تمثیل کے بغیر کسی فن کو حاصل نہیں کیا جاسکتا ، درس نظامی میں شامل قدیم کتابیں تقریباً سبھی تمرینات ، اسباق کی حد بندی ، رموزِ املاء وغیرہ سے خالی ہیں ، چاہئے کہ اسباق کو ایام تعلیم پر تقسیم کرلیں ، ہوم ورک اور واجبات دراسیہ کو نوٹ کروائیں ، نحو وصرف میں کسی قدر ورک بک کی شکل میں بہت سی تمرینی کتابیں ہندو پاک میں منظر عام پر آچکیں

(۱) تحفہ مدارس ، افادات حضرت صدیق صاحب باندوی ، مرتب مفتی زید مظاہری : نعیمیہ بک ڈپو دیوبند

ہیں، فقہ، اصول فقہ، بلاغت، تفسیر پر شروحات تو کافی دستیاب ہیں؛ مگر نئی مثالیں، قواعد کو واضح کرنے والی تدریبات یہ (ہماری مطبوعات کے مطابق) روزمرہ کی مثالوں سے تفہیم کا کام عبداللہ عباس ندوی علیہ الرحمہ نے تفہیم المنطق میں اور محترم مفتی حسام الدین صاحب قاسمی (استاذ خیر المدارس، بوربنڈہ، حیدرآباد) نے تمرین المنطق میں کیا ہے، فقہ کے تمام ہی ابواب میں مفتی بہ اور معمول بہ قول کی وضاحت، قدیم اوزان کے ساتھ جدید اوزان کی تشریح، سلگتے مسائل ساتھ ہی غیر مقلدین کے اچھالے گئے غیر اہم فروعی مسائل کے جوابات، احادیث، مستدلات حقیقہ کو حفظ کروانا چاہئے متعلقہ فقہی باب کے جدید مسائل کا بیان بھی ایسے چیز نہیں ہے جس سے صرف نظر کرلیا جائے۔ اصول فقہ میں مزید فروعات کو پیش کیا جاسکتا ہے، اس موضوع پر تیار کئے گئے بڑے بڑے انسائیکلو پیڈیا اور موسوعے معاون بن سکتے ہیں، فقہ کا مقصد قانون سازی، اشباہ ونظائر پر مہارت، کلیہ سے جزئیات، جزئیات سے کلیہ تک پہونچنا آسان ہوجائے، بلاغت میں علي جارم، مصطفی امین کا (انداز النحو الواضح) البلاغۃ الواضحۃ بے حد مفید ہے، عربی تفاسیر سے وجوہ بلاغت، احادیث اور بلغاء کے کلام میں نکاتِ بلاغت کا استخراج ایک ایسا ہوم ورک ہے شروع کردیا جانا چاہئے، فن تفسیر میں جب نحو وصرف اور لغوی تحقیق مقصودہ ※ تب بھی اعراب القرآن کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں، مزید وجوہ اعراب، ترجمہ کا اختلاف ہوم ورک میں ہوسکتا ہے حضرت حکیم الامت کی بیان القرآن میں ذکر کردہ نحوی تراکیب اس موضوع پر ذہن چلا سکتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی کی (حکیم الامت: نقوش وتأثرات) تفسیر ماجدی کی تصنیف کے وقت طویل مکاتیب کو دیکھنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ ترجمہ قرآن کا کام کس قدر نازک اور حساسیت کا حامل ہے، جلالین، وغیرہ اسرائیلات، موضوعات تفسیر، گمراہ مفسرین، درجات مفسرین جیسے موضوع ُپر مشق ہونی چاہئے، دردمند، محنتی استاذ کے سامنے بہت سے اور کام بھی ہوسکتے ہیں، خلاصہ یہ کہ طلبہ مدارس کو ہر کتاب پر، فن پر تدریب وتمرین کا کام، تاریخ وار کلاس ورک، ہوم ورک کا نظام بتایا جانا چاہئے۔

اسباق کا مطالعہ

مطالعہ کرنا ہر استاذ پر ضروری ہے، یعنی استاذ سبق کو حل کرے، اگر فنی کتاب ہو تو اس کی شروحات دیکھ لے، الفاظ معنی ذہن نشیں کرے، مشکل الفاظ کا حل تیار کرے، بہر حال کیا پڑھانا ہے، اس کی مکمل تیاری کر کے جائے، اگر مطالعہ کرنے کا مضمون نہ ہو مثلاً قرآن قاعدہ وغیرہ تو کوئی واقعہ، قصہ یا کہانی پڑھ کر جائے، نیز قرآن یا قاعدہ پڑھانے والے کو تجوید کے قواعد کا استحضار ضروری ہے۔

بڑی اور فنی کتابوں کو بغیر مطالعہ کے پڑھانا بالکل جائز نہیں، بغیر مطالعہ کے پڑھانے سے پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، استاذ طلبہ کے سوالات کا جواب نہیں دے پاتا، طلبہ استاذ کے چہرہ کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے مطالعہ نہیں کیا ہے، اس سے استاذ کا رعب ختم ہو جاتا ہے، طلبہ سامنے تو ادبا خاموش رہتے ہیں؛ لیکن پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرتے ہیں۔

طلبہ کے لئے بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے، اگر استاذ مطالعہ کرتا ہو تو طلبہ بھی مطالعہ کر کے پڑھتے ہیں، استاذ کا فرض ہے کہ طلبہ کو مطالعہ پر زور دے، درجہ میں ہر طالب علم کو کتاب پڑھنے کا موقع دے، طلبہ کا مطالعہ تین طرح کا ہوتا ہے۔

اعلی، اوسط، ادنی، اعلی مطالعہ یہ ہے کہ سبق کو مکمل طور پر لغت اور شروحات کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرے اور درجہ میں سبق اس طرح سنائے جیسے آموختہ سناتے ہیں، اسلاف اسی طرح مطالعہ کرتے تھے، اسی سے صلاحیت بنتی ہے، اگر طلبہ اس طرح مطالعہ نہ کریں تو صلاحیت بننا بہت مشکل ہے، پھر بھی کوئی عبارت یا مسئلہ باقی رہ جائے، تو استاذ سے سمجھ لے، شروحات میں اس بات کا خیال رکھے کہ اگر کتاب عربی زبان میں ہو تو عربی حواشی وشروحات دیکھے، اردو شروحات ہرگز نہ دیکھے، اس سے دو نقصان ہوتے ہیں (۱) طالب علم کی صلاحیت نہیں بنتی (۲) پڑھی ہوئی بات یاد نہیں رہتی۔

اوسط طریقہ یہ ہے کہ کتاب کی عبارت پڑھ لے اور جتنی عبارت آسانی سے سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ورنہ درجہ میں استاذ سے سمجھ لے۔

ادنی طریقہ یہ ہے کہ کم از کم کتاب کی عبارت پہلے سے پڑھ کر آجائے، یہ مطالعہ نہ کرنے سے بہتر ہے۔

بہر حال انتظامیہ اور مہتمم اس بات کی بھرپور کوشش کریں کہ اس کے مدرسہ کے تمام اساتذہ وطلبہ تمام کتابیں مطالعہ کر کے پڑھیں اور پڑھائیں، اساتذہ طلبہ کا امتحان لے کر ان کی جانچ کرتے رہیں کہ انہوں نے مطالعہ کیا ہے یا نہیں، مثلاً اگلے سبق سے کوئی سوال کرے یا یہ پوچھ لے کہ آج کہاں تک پڑھوگے۔(۱)

فہم کتاب کے اجزاء اور اس کے درجے

نصاب میں داخل اکثر کتب کے سلسلہ میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ کثرت مباحث پر ختم ہوجاتا ہے، اور کتاب فہمی پر توجہ زیادہ نہیں رہ پاتی، دراصل کتاب کے سمجھنے میں جن چیزوں پر توجہ ہونی چاہئے وہ پانچ چیزیں درجہ بدرجہ یہ ہیں:

۱- حل عبارت: نحوی، صرفی اور لغوی یقینی معلومات کے ساتھ صحیح عبارت پڑھ سکنے کی کوشش کرنا، اس پر قدرت حاصل کرنا، اور علت کے ساتھ یہ جاننا کہ کسی حرف پر کوئی حرکت کیوں آرہی ہے؟ نیز صرفی ولغوی اعتبار سے کلمہ کی موجودہ شکل کیوں بن رہی ہے، پھر پورے یقین کے ساتھ پڑھنا۔

۲- صحیح ترجمہ: ترجمہ بڑا اہم کام ہے، حضرت الاستاذ مفتی امین صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند نے فرمایا: ترجمہ پر بہت توجہ دینے کی ضرورت ہے، ہر لفظ ہی نہیں؛ بلکہ ہر حرف کا صحیح ترجمہ ہونا چاہئے کوئی لفظ یا حرف بیکار نہیں لایا جاتا؛ بلکہ سب کا ایک مقصد ہوتا ہے۔

۳- مطلب یا مفہوم: عبارت سے ملتا جلتا مطلب سمجھنا کہ اتنی عبارت میں صاحب کتاب کیا کہنا چاہتے ہیں، مختصر جامع انداز میں کتاب سے ہٹ کر اپنی زبان میں سمجھ لینا، بعض طلبہ لمبی باتیں کہتے اور لکھتے ہیں، مگر مقصود عبارت حل نہیں ہو پاتا۔

---

(۱) مدرسہ تعلیم سے تعمیر تک: ۱/ ۴۷، ۴۸

۴- بین السطور اور حاشیہ دیکھنے اور سمجھنے کی عادت ڈالی جائے، اس کو صحیح سمجھا جائے، اس پر ذہن وفکر لگایا جائے؛ کیوں کہ حاشیہ و بین السطور میں مختصر الفاظ میں بڑی قیمتی باتیں ہوتی ہیں، اور اہم سوالات کے جوابات ہوتے ہیں، جب کہ وہ شروحات ہی کی باتیں ہوتی ہیں۔

۵- ان چاروں کاموں کے بعد ہی جتنا موقع ملے شروحات بالخصوص عربی دیکھی جائیں اور حتی الامکان اردو سے بچا جائے؛ مگر مجبورا کہیں کہیں، ورنہ سہولت پسندی کا مزاج بن جاتا ہے اور عربی کتب پڑھنے سمجھنے کا شوق کم ہوجاتا ہے یا ماند پڑ جاتا ہے۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ درسی کتابوں کے مطالعہ کے تعلق سے فرماتے ہیں:

ہمارے بڑوں میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ (جو مسلم فقیہ ہیں) کے بارہ میں لکھا ہے کہ ان کی صلاحیت کا مدار ہی اس بات پر ہے کہ انہوں نے کبھی بلا مطالعہ سبق پڑھا ہی نہیں، مطالعہ کے لئے چند ضروری باتیں حسب ذیل ہیں۔

۱- مطالعہ کرتے وقت سب سے پہلا کام حسب استطاعت بین السطور اور کچھ حاشیہ کی مدد سے عبارت حل کی جائے، ضرورت پڑے تو لغت بھی دیکھ لی جائے، پھر ترجمہ اور عبارت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس عبارت میں مصنف کہنا کیا چاہتے ہیں؟۔

۲- پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے؛ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی مشکل اور اہم کتاب کے مطالعہ میں زیادہ وقت لگایا جائے اور آسان میں کم۔

۳- وقت نکال کر ان حواشی کو بھی پڑھنے کی کوشش کی جائے جن میں حل عبارت کے علاوہ کچھ جزئیات اور علمی باتیں بھی ہوتی ہیں، بسا اوقات کوئی حاشیہ سمجھ میں نہیں آئے گا، استاذ کے پڑھانے کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے، ورنہ کبھی کبھار پوچھا بھی جاسکتا ہے۔

۴- کوئی لفظ، جملہ یا عبارت جلدی سمجھ میں نہ آئے تو صیغوں اور ترکیبی کیفیت بدل کر

دوسرے احتمال پر حسب موقع غور کر کے خود سمجھنے کی کوشش کی جائے، پھر سمجھ میں نہ آئے تو دوسرے سے نہیں پوچھنا چاہئے؛ بلکہ یوں ہی چھوڑ کر درس کے حوالہ کر دیا جائے۔

۵- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لفظ اپنے معنی کے اعتبار سے مشکل یا حرکات وسکنات کے اعتبار سے غیر مشہور آجاتا ہے، تو طالب علم پریشان ہو کر لغت وغیرہ دیکھنے لگتا ہے جس کی وجہ سے مطالعہ میں زیادہ وقت لگتا ہے، جب کہ قریب ہی عبارت میں یا بین السطور میں یا حاشیہ میں خود اس کی تشریح موجود ہوتی ہے۔

طلبہ کے لئے فہم کتاب کے اسباب

بہت سے طلبہ سمجھنا چاہتے ہیں، صلاحیت بنانے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور محنت بھی کرتے ہیں مگر خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا ہے؛ کیوں کہ محنت بے تکی ہوتی ہے، بعض ضروری امور چھوڑ دیتے ہیں اور بعض غیر ضروری امور اپنا لیتے ہیں۔

۱- مطالعہ: سبق میں حاضر ہونے سے پہلے مطالعہ، اس کی حیثیت فرض کی ہی سے ہے، سب سے اہم چیز ہے، اس میں بالعموم کوتاہی ہوتی ہے، بغیر مطالعہ کے طالب علم باصلاحیت ہوجائے بہت مشکل ہے، فقیہ الامتؒ نے فرمایا: میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جو طالب علم ایک روز مطالعہ نہ کرے، اس سے ۴۰ روز کی قوت مطالعہ کم ہوجاتی ہے۔(۱)

۲- سبق میں حاضری: کسی واجب سے کم نہیں؛ طلبہ گھر جا کر بغیر کسی معقول وجہ سے کے تاخیر کرتے ہیں اور کبھی مدرسہ میں رہ کر معمولی بہانوں سے حاضر نہیں ہوتے، بڑی محرومی کی بات ہے، سبق میں حاضری کی عجیب برکت ہے۔

۳- تکرار و مذاکرہ: اس کو سنت مؤکدہ سمجھ لیں، جب ان امور کی پابندی ہوگی تو کچھ دنوں کے بعد کبھی ایسا ہوگا کہ اکثر سبق اور کبھی پورا سبق طالب علم خود سمجھ لے گا،

(۱) ملفوظات فقیہ الامت: ۴۷

بسا اوقات استاذ سے خود چوک ہو جاتی ہے ایسے موقع پر باادب اظہار کرنا چاہئے، مطالعہ کا عادی ہوگا، اسباق میں حاضری کی پابندی ہوگی تبھی کچھ کہنے کی ہمت ہوگی۔(۱)

درسی کتب کے مطالعہ کے چند اصول

۱- جہاں تک سبق ہونے کا اندازہ ہے، پہلے اتنی عبارت کم از کم تین بار پڑھئے؛ تا کہ عبارت خوب رواں دواں ہو جائے۔

۲- عبارت کو باآواز پڑھئے، نہ کہ منہ ہی منہ میں خاموشی کے ساتھ۔

۳- صحیح اعراب کے ساتھ عبارت پڑھئے، نحو وصرف کے قواعد کی رو سے عبارت درست کیجئے۔

۴- غور کیجئے کہ آپ نے جس لفظ کا جو اعراب پڑھا ہے، کیا وہی اعراب ہونا چاہئے، یا دوسرا؟۔ اور جو عراب بھی وہ کیوں ہو؟

۵- مبتدا، خبر، فعل، فاعل، مفعول، جار، مجرور، حروف مشبہ بالفعل، افعال ناقصہ وغیرہ کے اسم وخبر، حال وتمیز، باب اور واحد وجمع وغیرہ۔

۶- پھر ان ساری باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے عبارت کا لفظی ترجمہ کیجئے۔

۷- یاد رکھئے! عبارت کا لفظی ترجمہ، عبارت کے مقصود ومطلب تک بہت جلد پہونچا دیتا ہے۔

۸- جس لفظ کا ترجمہ نہ آتا ہو فورا لغت اٹھا کر دیکھئے، بغیر ترجمہ جانے آگے نہ بڑھئے، بار بار لغت کا دیکھنا بہت مفید ہوتا ہے، بعض الفاظ کا صحیح تلفظ بھی لغت ہی سے معلوم ہوتا ہے، اس کے لئے بھی لغت دیکھئے۔

۹- اگر کسی عبارت پر کوئی حاشیہ ہو یا بین السطور کچھ لکھا ہو تو اسے ضرور پڑھئے۔

۱۰- نحو وصرف کے کسی قاعدہ کے بارے میں شک وشبہ ہو تو نحو وصرف کی کتابیں اٹھا کر

(۱) طلب علم منزل بہ منزل، ''ضروریات وہدایات، مدرسہ عربیہ سعیدیہ، یحی پور، پرتاب گڑھ

دیکھئے، نحو وصرف کی اس قسم کی اردو کتابیں مستقل اپنے پاس رکھنا چاہئے، علم النحو، علم الصرف، تسہیل النحو، تسہیل الصرف، تمرین النحو، تمرین الصرف وغیرہ۔

۱۱- کوشش کیجئے کہ یہ یا اس قسم کی لغات بھی آپ کے پاس رہیں، مصباح اللغات، القاموس الجدید، القاموس الاصطلاحی، فیروز اللغات وغیرہ۔

۱۲- پوری عبارت کے ساتھ اس پورے عمل کو کم از کم تین بار دہرائیے، انشاء اللہ عبارت کا اعراب، ترجمہ، مطلب سب آپ کے سامنے واضح ہوجائے گا، یا پھر بہت حد تک قابو میں آجائے گا اور استاذ کے ذرا بتانے سے پوری بات سمجھ میں آجائے گی۔(۱)

اعدادیہ

دارالعلوم دیوبند میں طریق کار شروع سے یہ ہے کہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد اور عربی کے شروع کرنے سے پہلے طالب علم کو ایک پانچ سالہ نصاب سے گزارا جاتا تھا، جو ''درجہ فارسی وریاضی'' کے نام سے موسوم تھا، اس درجے میں اردو، فارسی، دینیات، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اس قدر معیاری تعلیم دی جاتی تھی کہ ان مضامین میں ایک عالم دین کو جتنی واقفیت ضروری ہے، ایک طرف وہ تمام تر حاصل ہوجاتی تھی اور دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس درجے پر اپنی تعلیم ختم کرنے پر مجبور ہوجائے تو وہ دین ودنیا کی اتنی بنیادی معلومات حاصل کرچکا ہوتا تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اچھی زندگی گذار سکے۔

یہ درجہ عربی اور اسلامی علوم کے لئے ایک بہترین بنیاد کا کام دیتا تھا، اور جب طالبعلم اس درجے سے فارغ ہوکر عربی اور اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہوتا تو وہ اردو اور فارسی میں تحریر وانشاء کی اچھی صلاحیت کا حامل ہوتا تھا جو اس کو عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں بہت مدد فراہم کرتی تھی۔

---

(۱) طلبہ مدارس دینیہ کی رہنمائی، ۶۰، مولانا مفتی جمیل احمد نذیری، مکتبہ صداقت، نوادہ، مبارک پورہ، اعظم گڑھ، یوپی

یہ درجہ موجودہ دینی مدارس میں عرصے سے یا تو ختم ہو چکا ہے یا اس نے گھٹتے گھٹتے ایک سال کے درجہ اعدادیہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم جب عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل شروع کرتا ہے تو عام طور پر اس کی تحریر خراب، املاء اور انشاء ناقص اور بنیادی معلومات کمزور ہوتی ہیں، اس میں عربی ونحو، ادب اور فقہ وغیرہ کے اہم مضامین کو کما حقہ سمجھنے اور انہیں اچھی طرح ہضم کرنے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی اور یہ مضامین اسے دشوار معلوم ہوتے ہیں۔اور جب بنیاد کمزور ہو جائے تو اس کمزوری کا اثر اگلے درجات تک پڑتا ہے۔

لہٰذ یہ بات ہماری نظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق درجہ اعدادیہ کی مدت بڑھائی جائے اور اس میں اردو، فارسی، دینیات، سیرت ، تجوید وحساب، ریاضی ، اور جغرافیہ وغیرہ کی اتنی معیاری تعلیم دی جائے جو اگلے مضامین کے لئے مناسب بنیاد فراہم کر سکے۔(۱)

نصاب میں اردو ودینیات کی اہمیت

کسی بھی قوم اور حکومت کی وسعت اور کشادگی، اس کی تہذیب وتمدن کے پھیلاؤ اور ترویج واشاعت میں زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، کیوں کہ کوئی بھی زبان اس قوم کی تہذیب وروایات اور اس کے مذہب وتمدن کو اپنے اندر ضم کئے ہوئے ہوتی ہے، اس لئے اقوام اپنے تہذیبی شعار کو باقی اور برقرار رکھنے کے لئے اپنی زبان کی ترویج واشاعت کے لئے کوشش کرتے ہیں۔اس کے لئے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

آج کل کسی بھی قوم کے بقاء کے میدا میں زبان کا مسئلہ نہایت اہم شمار کیا جاتا ہے، ہندوستان کا ہندی ہندی زبان کی ترویج کے لئے ،عیسائی انگلش کے لئے ، ایرانی فارسی کے لئے ،افغانی پشتو کے لئے ،حجازی عربی کے لئے جان توڑ محنت کر رہا ہے، اس میں سے ہر ایک قوم سمجھ چکی ہے کہ ان کی قومی روایات، اس کا مخصوص تمدن ومعاشرت اور بالفاظ دیگر قومیت کا

(۱) ہمارا نظام تعلیم: ۹۸

تحفظ صرف ان کی زبان کے بقاء میں مضمر ہے

اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ جب کوئی کسی دوسری قوم کو اپنے اندر ضم کرنا چاہتی ہے، یا بالفاظ دیگر اسے فنا کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی زبان اور لغت کے رائج کرنے پر زور دیتی ہے، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لغت کا اثر متأثر قوم کے اخلاق، عادات، روایات اور مذہب ومعاشرت پر ضرور پڑتا ہے، پھر یا تو وہ مکمل اس قوم میں مل کر اسی کے اخلاق وعادات کو قبول کر لیتی ہے یا کم ازکم اپنی مخصوص قومیت اور شعائر سے بیگانہ ہوکر ایک مخلوط (ملی جلی) قومیت پیدا کر لیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ٹمل زبان والا، کنٹر زبان والا اپنی زبان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑ رہا ہے، چین اپنے ملک میں انگریزی کو داخل ہونے نہیں دیتا، فرانس اپنی زبان کی ترویج کے لئے کروڑوں روپیئے خرچ کر رہا ہے۔ اس لئے عربی زبان کی اہمیت تو مسلم ہے ہی، ساتھ ساتھ اردو جو ہماری مادری زبان ہے اس پر مہارت وعبور کی سخت ضرورت ہے، چونکہ اردو زبان بھی اسلامی شعائر اور اسلامی محاورات اور اسلامی تہذیب وتمدن کی زبان ہے،

اردو میں اسلامی ذہنیت کا اندازہ عربی زبان کی مکمل چھاپ اور خصوصا اسلامی طرز حیات وزندگی کے مختلف مواقع سے بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے مثلا:

اچھے کام ابتداء پر "بسم الله" من چاہے کام ہونے پر "الحمد لله" تعجب پر "سبحان الله" قدافزائی پر "ماشاء الله"، برائت کے اظہار کے لئے "معاذ الله" افسوس پر "إنا لله وإنا إليه راجعون" ندامت پر "استغفر الله" قسم کے لئے "والله والله" توقع پر "انشاء الله" بچاؤ پر "الله الله" شکریہ پر "جزاک" اظہار عظمت کے لئے "لا إله إلا الله" برے کام کو دیکھ کر "لا حول ولا قوة إلا بالله" پیغمبر ﷺ کا نام آنے پر "صلى الله" جوش پر "الله اکبر"۔

اس لئے اردو زبان یہ اسلامی تہذیب اور خود ہمارے ملک کے مسلمانوں کی قومی

زبان ہے، اس کا تحفظ اور اس بقاء مسلمانوں کی زندگی کا ضروری حصہ ہونا چاہئے، انگریزی زبان کا اثر اس قدر ہے کہ بہت سے خالص اردو الفاظ غیر مفہوم ہو چکے، مرعوبیت کی وجہ سے بے جا انگریزی کا استعمال ہو رہا ہے، اردو زبان میں صحت املاء کے ساتھ لکھنا یا گنتی بولنا مشکل ہو گیا، فارغین حفاظ و علماء کرام کی درخواستِ تدریس میں شرمناک غلطیاں پائی جاتی ہیں، اگر دار العلوم دیو بند کا دینیات کا نصاب روبعمل لایا جائے تو اول عربی میں کمزوری نہیں ہوتی، مگر طالب اعدادیہ یا حفظ سے اسی نقص کے ساتھ آتا ہے پھر دورہ تک اس کی طرف توجہ دینے یا توجہ ہو جائے تو نہیں ملتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہندوستان جیسے ممالک میں دینی مدارس سے ہی باقی ہے، اگر یہاں بھی خاطر خواہ توجہ نہ ہو تو کہاں ہو، اگر اس کمزوری کے ساتھ طالب علم آگے بڑھ گڑا تو آئندہ جماعتوں کا متعلقہ کام کیا کریں اور پچھلے کی تلافی کیا۔

اردو کی ایک مفید کتاب

نئی نسل و پود کے لئے حضرت مولانا محمد اسماعیل خان صاحب رحمہ اللہ نے پانچ حصص پر مشتمل جو ''اردو زبان کی کتاب'' نامی نصاب تیار فرمایا تھا، اس کی گوں نا گوں خصوصیات، محاسن و محامد پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کوئی شخص اسے '' گلہائے رنگا رنگ کا حسین گلدستہ'' نام دے گا تو کوئی اس کو ''کشکول معلومات'' یا ''اردو ادب کا انسائیکلو پیڈیا'' کہے گا، مگر اس کو '' گلستان اردو'' کا نام دیا جاتا ہے تو شیخ سعدی کی '' گلستان'' جہاں فارسی زبان کا معجزہ ہے، وہیں یہ کتاب اردو زبان کا کلام معجز ہے، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب نے یہاں جامعہ ڈابھیل ہی میں کسی صاحب سے استفسار پر کہ گلستان اور بوستان اپنے علو مرتبہ کے تقاضے سے عربی کے منتہی طلبہ کو پڑھائی جانی چاہئے، حالاں کہ ہمارے مدارس میں یہ کتابیں بالعموم فارسی کے مبتدی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہیں، حضرت نے جواب میں فرمایا تھا کہ '' لڑکپن میں پڑھو اور بڑے ہو کر سمجھو'' حضرت کا یہ ارشاد گرامی مولانا میرٹھی کی اس کتاب پر بھی سوفی صد صادق آتا ہے کہ درحقیقت یہ کتاب بچوں سے زیادہ بڑوں کے کام یعنی ان کے پڑھنے اور برتنے کی چیز ہے، کیوں کہ یہ کتاب انسانی زندگی کے سارے احوال

وشئون کو محیط ہے، اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے وابستہ لوگوں کی ضرورتوں کا خیال رکھا گڑا ہے، ان کی دلچسپیوں اور تفریح طبع کا سامان ہے، مختلف پیشوں اور حرفتوں کا تعارف بھی ہے۔

الغرض یہ اعلی ادبی شاہکار ہے، اس کے نثری وشعری مضامین دل کو چھو لینے والی کسی بھی سبق کو لے لیں تو علم وحکمت کا خزینہ ہوگا، ادب اور شائستگی کی تربیت ہوگی، ہر سبق کا لطف اور مزہ ہوگا، چاشنی اور شیرینی ہوگی، علوم ہمت اور بلند حوصلگی ہوگی، اخلاقی پاکیزگی ہوگی، زبان کی صفائی ہوگی اور ذوق کی نفاست بھی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تو کوئی اعتقادی گندگی ہے اور نہ ہی اخلاقی خرابی، اگر اس کی طرف سے کسی کمزوری، عیب یا نقص کا انتساب ہوتا تو صرف اس بات کا کہ اس کی زبان کہیں کہیں مشکل ہے اور جس کی توضیح وتشریح بھی کی گئی ہے۔

کسی بھی مصنف اور ادیب اور انشاء پرداز کے لئے کسی بھی فن میں موٹی موٹی جلدوں میں کسی کتاب کا تیار کرنا آسان اور سہل ہوا کرتا ہے، جب کہ اس کے مخاطبین بڑی عمر کے اور تعلیم یافتہ ہو، مگر کم سن اور سادہ لوح بچوں اور ابتدائی عمر کے طلبہ کے لئے کوئی چھوٹا رسالہ بھی لکھنا بڑا دشوار گذار اور مشکل ہوتا ہے، کیوں کہ اس کام کے لئے اس مصنف کو اپنے بلند و بالا معیار سے بہت نیچے اتر کر بھولے بھالے معصوم بچوں کی ضعیف عقل اور ناتمام شعور کے مطابق ہی باتیں کرنا اور انہیں سمجھانا ہوتا ہے۔ یہ کمال بہت کم مصنفوں کو میسر ہے، انہیں باکمال مصنوں میں مشہور نام ور مصنف، ادیب، اور ممتاز شاعر حضرت مولانا اسماعیل صاحب میرٹھی بھی ہیں، جن کی کتاب دار العلوم اور دیگر مدارس میں داخل نصاب بھی ہے، بہر حال یہ کتاب علم وحکمت کا خزینہ، اخلاق ومعلومات گلستاں ہے، جس میں ہر طرح کی خوبیاں یکساں جمع ہیں، جو بچے کے اخلاق وکردار اور اونچی اٹھان اور پروان کے نہایت مفید تر ثابت ہوسکتی ہے، مصنف کی پیدائش ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ کے محلہ مشائخان میں ہوئی، موجودہ نام اس محلے کا ''اسماعیل نگر'' خان صاحب کے نام پر بہ طور یادگار رکھا گیا ہے، آپ کی کئی ایک تصانیف ہیں، آپ نے کامیاب تدریسی خدمات بھی انجام دی ہیں، خان صاحب کی ان

اردو کتابوں کو بڑے بڑے ادباء جیسے علامہ شبلی، شمس العلماء منشی ذکاء اللہ، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، بابائے اردو مولوی عبدالحق رحمہ اللہ نے بھی اس کو خوب سراہا ہے، مولوی عبداللہ عباس ندوی نے بھی اس پر گراں قدر کلمات کہے ہیں، حضرت مولانا حکیم عبدالحی رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ''گل رعنا'' میں فرماتے ہیں: ''اردو زبان کی نظم ونثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو، تمدنی، اخلاقی، سیاسی ہو قدیم وجدید ہر ایک طرز میں (خان صاحب مولوی محمد اسماعیل) بلند پایہ رکھتے ہیں، اور سررشتہ تعلیم کے تعلق سے اردو ریڈرس ان کی اسکولوں میں بسبب کمال سادگی اور سلاست کے مقبول ہوچکی ہیں، ان سے بہتر درسی کتابیں گورنمنٹ کا سررشتہ تعلیم آج تک نہیں لکھوا سکا''۔(۱)

نظام محفوظات

خیر القرون اور آج کل عرب ملکوں میں احادیث اور متون معتبرہ کے حفظ کا کافی اہتمام ہے، حافظین صحیحین، حافظ بخاری وغیرہ شام، سعودیہ میں آج بھی مل جاتے ہیں، مراکش وغیرہ میں خواتین بھی اس کا ذوق رکھتی ہیں۔

احکام کی احادیث، اخلاق سے متعلق کلام نبوی بالخصوص حفظ کرنے کا مستقبل نظام بننا چاہئے، اخروی سعادت، مستحق سفارش ہونے کے علاوہ استدلال میں سہولت، کسی قدر کتب سے استغناء پیدا ہوجاتا ہے، خارج میں اس کا مسابقہ یا امتحان ہوتو اس طرف یہ توجہ بہت مفید ہوگی۔

تاریخ اسلاف میں حافظہ کا غیر معمولی استعمال اور حیرت انگیز قوت یاداشت کے واقعات موجود ہیں، یہ فطری اصول ہے کہ جس صلاحیت کا جیسے بینائی وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے، اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اور جس صلاحیت کو استعمال نہ کریں وہ ختم یا کمزور ہوجاتی ہے، بالکل کنویں کی طرح جب تک پانی نکالتے رہے تو پانی باقی رہتا ہے؛ لیکن اگر چھوڑ دیا جائے تو سوکھ جاتا ہے۔

(۱) ازمقدمہ، اردو زبان کی تیسری چوتھی

اس سلسلے میں مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) نے خود ایک سلسلہ محفوظات ترتیب دیا ہے، ذیل کے حضرت والا کے مقدمہ نے اہمیت، نصاب اور طریقہ کار کو بخوبی واضح کردیا:

''اللہ رب العزت نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے ذریعہ انسانوں کے لئے جو ہدایت بھیجی ہے، اس کے دو حصے ہیں، قرآن پاک کو متن کی حیثیت حال ہے اور احادیث شریفہ اس کی شرح ہیں اور مدارس عربیہ کی غرض وغایت انہی دو کی تعلیم ہے، جس میں کامیابی اس پر موقوف ہے کہ طالب علم ان کا معتد بہ حصہ محفوظ ہو، اس کے علاوہ بھی محفوظات کے متعدد فوائد ہیں، مثلا:

۱- محفوظات سے عبارت خوانی کی استعداد پیدا ہوتی ہے، مبصرین کا خیال ہے کہ ایک جملہ حفظ کرنے سے دس جملے پڑھنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

۲- محفوظات سے عبارت خوانی کی استعداد پیدا ہوتی ہے، مبصرین کا خیال ہے کہ اس کو بہتر طریقہ پر سمجھا جا سکتا ہے۔

۳- محفوظات مسئلہ کی تفصیلات یاد رکھنے میں مددگار بنتے ہیں؛ کیوں کہ مسئلہ کی بنیاد محفوظ ہونے کے بعد تفصیلات ذہن سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

۴- محفوظات کا بڑا فائدہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب طلبہ فارغ ہو کر تعلیم وتربیت اور دعوت واصلاح کے میدان میں قدم رکھتے ہیں، اس وقت اگر عالم وداعی کو وہ آیات قرآنی اور احادیث شریفہ شریفہ جو دین کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہیں یاد ہوں تو وہ اس کے لئے بڑا سہارا بنتی ہیں۔

الغرض محفوظات کے گوناگوں فوائد ہیں، مگر ہندوستان میں عام طور پر اس کا رواج نہیں ہے؛ مگر کام کی بات جہاں بھی ملے اور جب بھی ملے اس کو اپنا لینا ہی دانشمندی ہے، عرب ممالک میں عام طور پر محفوظات پر بہت زور دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے عرب علماء بے تکلف آیات واحادیث گفتگو میں پیش کر سکتے ہیں، مگر ہمارے طلبہ جو دین سیکھنے میں یقینا

عربوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں، عام طور پر اس خوبی سے محروم ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ عرب طلبہ کو زبان کی سہولت حاصل ؛ مگر یہ ایسی بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ہمت ہار دی جائے ، ہمارے بچے جب بغیر سمجھے قرآن پاک حفظ کر سکتے ہیں، تو سمجھ کر یاد کرنا تو آسان ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ارباب مدارس ، ومربیان امت اس طرف توجہ فرمائیں اور ہر درجہ میں محفوظات کا سلسلہ جاری رکھیں۔

یہ اس مبارک سلسلہ کی کڑی پہلی کڑی ہے، اور عربی کے سال اول کے طلبہ کے لئے ہے، اس درجہ میں چونکہ طالب علم کی استعداد ابتدائی مرحلہ میں ہوتی ہے؛ بلکہ بعض جگہ پر تو یہ سال اعدادی کی درجہ ہوتا ہے ، اور اس میں زیادہ تر فارسی پڑھائی جاتی ہے ، اس لئے محفوظات کی مقدار بہت کم رکھی گئی ہے:

۱- سال کے آخر میں جب تعلیم کے دو مہینے باقی رہیں یہ محفوظات شروع کرائے جائیں، اس وقت بچوں میں اتنی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تحمل کر سکتے ہیں۔

۲- عام طور پر بچوں کو تفصیل سے نہ سمجھا جائے ، پورا زور حفظ پر رکھا جائے ؛ البتہ مفردات فہمی کی جاسکتی ہے، یعنی ہر ہر لفظ کے معنی علحدہ کر کے سمجھائے جاسکتے ہیں ؛ بلکہ ایسا کرنا مفید ہوگا۔

۳- محفوظات مع ترجمہ یاد کرائے جائیں۔

۴- روزانہ کے سبق کے ساتھ خواندہ چار اسباق ملا کر سنے جائیں۔

۵- تازہ سبق کچھ کچا رہ جائے تو صرفِ نظر کی جائے ؛ مگر دوسرے دن کچا آئے تو نکیر کی جائے۔

۶- ہر جمعرات کو شروع سے محفوظات ترجمہ کے ساتھ سنے جائیں۔

۷- واضح تلفظ سے سنا جائے جلدی جلدی نہ پڑھنے دیا جائے۔

۸- ہر بچے سے نیا سبق کہلوایا جائے اور ہر ایک سے سنا بھی جائے ، جماعت بڑی ہو تو اجتماعی طور پر پڑھایا جاسکتا ہے ، اور سبق سننے کے لئے گروپ بنائے

جا سکتے ہیں۔

۹- اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود استاذ کو یہ محفوظات یاد ہونے چاہئے، اگر استاذ کو یاد نہ ہوگے تو طلبہ کی نفسیات پر برا اثر پڑے گا۔

۱۰- طلبہ کو حفظ کرنے کا طریقہ بتایا جائے کہ لمبی عبارت ایک ساتھ نہ پڑھیں؛ بلکہ دو تین کلمات اس طرح یاد کریں، پھر دونوں کو ملا کر یاد کریں، اسی طرح آگے بڑھتے رہیں، اگر کوئی شخص مشکل زبان چڑھے تو اسے زور دے کر چند بار کہیں ان شاء اللہ یاد ہو جائے گا۔

جو طلبہ از خود حفظ کرنا چاہیں وہ چند باتیں یاد رکھیں:

۱- حفظ کرنے کا جو طریقہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور کام شروع کر دیں۔

۲- یومیہ سبق کی ایک مقدار متعین کر لیں، بے اندازہ نہ چلیں، ورنہ تھک جائیں گے۔

۳- اپنے کسی ساتھی کو روزانہ کا سبق چار خواندہ اسباق کے ساتھ ملا کر سناتے رہیں۔

۴- یہ محفوظات صرف سال اول کے طلبہ ہی کے لئے نہیں ہیں، کسی بھی سال کا طالب علم اگر اسے یہ محفوظات یاد نہ ہوں تو اسے یاد کرنے چاہئیں''۔(۱)

محفوظات حصۂ دوم کے مقدمے میں مفتی سعید احمد صاحب فرماتے ہیں:

''بہ توفیق الٰہی محفوظات کا دوسرا حصہ پیش ہے، یہ حصہ عربی درجات کے سال دوم کے لئے ہے، اس درجہ میں بھی چونکہ طلبہ کی استعداد قوی نہیں ہوتی؛ اس لئے آسان آیات واحادیث منتخب کی گئیں ہیں، عام طور پر ایک ایک جملہ سے زائد نہیں ہیں، نیز لغت وترکیب اور مضمون کے اعتبار سے بھی آسان ہیں، بچے خوب سمجھ سکتے ہیں اور آسانی کے ساتھ یاد کر سکتے ہیں۔

محفوظات کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ بچوں کو ایک مضمون یاد ہو جاتا ہے؛ بلکہ اس

(۱) محفوظات: ۱/ ۳، ۵۴، مفتی سعید احمد پالن پوری

کے جلو میں بچوں کو لغات وترکیب اور اسلوب بیان سے بھی حظ وافر حاصل ہوتا ہے، محفوظات کی واقعی قدر بچوں کو بڑے ہو کر معلوم ہوگی۔

اساتذہ سے اساتذہ کرام سے جو باتیں سال اول کے محفوظات کے مقدمہ میں عرض کی گئی تھیں ان کی یاددہانی کراتے ہوئے مزید عرض ہے:

۱۔ سال دوم کے محفوظات ایک سہ ماہی کے بعد یا نصف سال کے بعد شروع کرادیئے جائیں تو بہتر ہے؛ البتہ اگر بچوں کو سال اول کے محفوظات یاد نہ ہوں تو شروع سال میں سال اول کے محفوظات یاد کرائے جائیں، پھر سال دوم کے شروع کرائے جائیں، اور ترجمہ کے ساتھ یاد کرائیں جائیں۔

۲۔ جو بچے سال اول کے محفوظات گذشتہ سال یاد کر چکے ہیں، ان سے سال اول کے محفوظات سن لئے جائیں، پھر سال دوم کے شروع کرائیں جائیں۔

۳۔ جو بچے حافظ ہیں، ان کو بھی آیات پاک یاد کرائیں جائیں، اور ان کو صاف لہجہ میں معنی ذہن میں رکھ کر پڑھنے کی ہدایت کی جائے۔

۴۔ اس درجہ میں بھی عام طور پر بچوں کو سمجھا یا نہ جائے حفظ ہی پر زور دیا جائے، البتہ ترجمہ بھی کرنی چاہئے یعنی ہر ہر لفظ کے معنی بتانے چاہئیں، تحت اللفظ ترجمہ بتانا چاہئے اور ترکیب کی طرف ہلکا اشارہ کرنا چاہئے، اس سے حفظ میں سہولت ہوگی۔

۵۔ حفظ مکمل ہونے کے بعد اگر موقعہ ہو تو آسان جملوں کی ترکیب اور سادہ طریقہ پر حل لغات کرانا چاہئے

۶۔ حفظ مکمل ہونے کے بعد تمرین نہایت ضروری ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ بچوں سے سوال کیا جائے۔

''بتاؤ نمازوں کے اہتمام کے سلسلہ میں اللہ پاک کا ارشاد ہے'' بچے جواب دیں، اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ''حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى''

دوسرا سوال: کھانا اکٹھا کھانا چاہئے یا الگ الگ؟ بچے جواب دیں، اکٹھا کھانا

چاہئے ، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : " **كلوا جميعا ولا تفرقوا ؛ فإن البركة مع الجماعة**"، اسی طرح جتنی تمرین ہوگی مفید ہوگی۔

۷۔ اور آخری بات یہ ہے کہ استاذ صاحب کو محفوظات یاد ہونے چاہئیں (ترجمہ یاد ہونا ضروری نہیں) ورنہ طلبہ کی نفسیات پر برا اثر پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ ہمت ہار دیں۔

طلبہ سے جو طلبہ از خود یاد کرنا چاہیں ان سے گذارش ہے کہ یہ محفوظات صرف عربی دوم کے بچوں کے لئے نہیں ہیں، جسے بھی یہ محفوظات یاد نہ ہوں ان کو یاد کرنے چاہئیں اور تمرین اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کرنی چاہئے اور کوئی مضمون سمجھ میں نہ آئے تو کسی استاذ سے سمجھ لینا چاہئے"۔(۱)

بجائے کتاب کے "فن" کی تعلیم

مدارس کے نصاب میں جو کتابیں شامل ہیں جن میں فنون سے زیادہ لفظی بحثوں، ترکیبوں، دور از کار اشکالات اور ان کے جوابات وغیرہ پر توجہ دی گئی ہے، ہلکی پھلکی بات بتانے کے لئے بھی مشکل پیرایہ کا استعمال کیا گیا ہے اور جن مسائل کو ٹھیٹ الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے ان کے لئے بھی ایسی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے کہ عبارت اور بھی ژولیدہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہاں اس سلسلے میں حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ جیسے دوررس، زمانہ شناس اور مصلحت آشنا نگاہ رکھنے والے کا ایک اقتباس نقل کئے دیتے ہیں:

> "مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم رائج ہے، حدیث وفقہ کی چند کتابوں کو مستثنی کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہیں، جہاں سے صحیح معنوں میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا، قدماء امت کی وہ تالیفات جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں نہ دور از کار ابحاث جن کے پڑھنے سے صحیح

(۱) محفوظات حصہ دوم: ۱، ۲، مفتی سعید احمد پالن پوری

معنوں میں دل ودماغ متأثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا، لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا؛ لیکن وقت ودماغ اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا، بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق وغامض ہو جس کے لئے شرح وحاشیہ کی ضرورت ہو، کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے، میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہنچا، بطور مثال اسلامی علوم میں اصولِ فقہ لیجئے جو علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین اور اہم ترین فن ہے، جو قرآن وسنت سے نئے نئے استنباطات کے لئے سب سے اہم راستہ تھا، جس کی با قاعدہ تدوین کا فخر دولت عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ، امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے، اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد ابن ادریس الشافعیؒ کی کتاب ''الرسالۃ'' ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں ''کتاب الام'' کے نام کے ساتھ چھپ چکی ہے، اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب وتاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے، اسی فن میں امام ابوبکر رازی جصاص نے کتاب ''الفصول فی الأصول'' لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتاب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل نے حاصل کیا، پھر۔ ہندوستان وپاکستان آئی، امام فخر الدین بزدوی نے ''کتاب الأصول'' لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبد العزیز بخاری نے کی ہے، جو ترکی کے

سابق دارالخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی، اور محیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عمید الدین اتقانی کی ''الشامل'' دس جلدوں میں دار الکتاب المصریۃ قاہرہ میں موجود ہے، اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے؛ لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جز کا نقص ہے، اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی آ چکی ہے، امام شمس الائمہ السرخسی نے ''کتاب الاصول'' لکھی جس کے نسخے ترکی و مصر میں موجود ہیں، اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ و نافع کتابیں ہیں، اس کے علاوہ اس فن میں امام ابوزید دبوسی کی کتاب ''تقویم الادلۃ'' بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرہ روزگار کتابوں کی جگہ امام ابن ہمام کی ''تحریر الاصول'' اور ابن حاجب کی ''مختصر الاصول'' اور بیضاوی ''منہاج الاصول'' یا ابو البرکات النسفی کی ''منار الاصول'' یا صدر الشریعۃ کی ''التیسیر'' اور قاضی بیضاوی کی ''منہاج'' کی شرح الاسنوی کی ہو تو یہ چیستانیں امت کے کیا کام آسکتی ہیں؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق ولطیف ان کے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں؛ لیکن دوسری طرف امہات جس کی تعبیر میں ادا ہوئی ہیں وہ کوئی علمی روح پیدا کرنے کے لئے مفید نہیں ہوسکتی'' (۱)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

''ہر زمانہ کا ایک خاص مزاج اور خاص ذوق ہوتا ہے، جب علم کی صحیح ترقی ختم ہوگئی، یا رک گئی یا یوں کہئے کہ معراج کمال تک مبادی علوم کا معیار جب بلند ہوا تو طبعی طور پر علوم اسلامیہ کا انحطاط لازمی تھا، اس

(۱) ماہنامہ الفرقان، بابت ماہ فروری ومارچ ۱۹۷۵ء

کا سارا زور وکمال، تالیف کا معیار، قواعد کی تلخیص، مسائل کی تنقیح، عبارت آرائی، متن نویسی وایجاز طرازی، اختصار کے نئے نئے اسلوب لفظی موشگافی وغیرہ قرار پایا، علمی مسابقت کا میدان بھی گیا، منظوم قواعد تیار ہونے لگے، مبادی ومسائل مقاصد بن گئے، علوم عربیہ کا مقصد قرآن وحدیث کی تراکیب اپنی جگہ رہیں، خود ان کتابوں کے مسائل وعبارات پر توجہ بن گئی، ابن حاجب کی کافیہ کو لیجئے جس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں، پھر ''شرح ملا جامی'' جو ان شرحوں میں سے ایک شرح ہے، اس کے حواشی اور شروح کے لئے ایک دفتر چاہئے، اس پر شرح عبدالغفور کو لیجئے، پھر اس کا ''تکملہ عبدالحکیم سیالکوٹی'' اور ان دونوں کی شرح، اور ان میں سے ''شرح اشمونی'' اور پھر اس کی شرح ''عبان'' سات ضخیم مجلدات میں دیکھئے کہ ساری عمر ان ہی کے مطالعہ کی نذر ہوجائے، آخر غور کیا جائے کہ کیا یہ مبادی واقعی اتنی توجہ کے مستحق تھے، بہر حال جو کچھ ہوا ایک خاص دور کا تقاضا تھا، اور ذوق طلب تھا جو پورا ہوگیا، اسی طرح بقیہ علوم وبقیہ کتب کی حالت کو قیاس کر لیجئے، اب تو طبائع میں وہ جولانی رہی اور نہ وہ جفا کشی محنت وعرق ریزی کی صلاحیت دماغوں میں رہی، نہ وہ فرصت وطمانیت رہی اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ اس کی حاجت رہی، مشکل پسندی سے فکر اکتانے لگی، جدید کتابیں لکھی گئیں، ادب وانشاء کا طرز واسلوب بدل گیا، قدماء کی کتابیں پریس میں آنے لگیں، اہل عصر نے ہمت کر کے ذوقِ عصری کی تشنگی کے لئے جدید سانچوں میں ضیافت طبع کی خاطر عمدہ تصنیفات پیش کیں، اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم مسائل پر جمے رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے توجہات ہٹ جائیں گی،

اور ہمارا یہ طرزِ عمل ہمارے اکابر وسلف کی اس ''تراث فاخر'' اور اس علمی ثروت وسرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا، یہ درحقیقت علم کی خیر خواہی ہی نہیں؛ بلکہ نادان دوست کا طرز عمل ہوگا، کیا فقہ اسلامی میں ''کنز الدقائق'' ''وقایہ'' ''نقایہ'' اور شرح وقایہ کے بہترین بدل اسلاف ہی کی کتابوں میں موجود نہیں کیا؟ جامع صغیر، جامع کبیر وغیرہ براہ راست ۔۔۔۔امام محمد بن حسن الشیبانی کی کتابیں ہر حیثیت سے جامع نہیں ہیں؟ ان میں جو علم وبرکت ہو وہ ان متاخرین کی کتابوں میں کہاں سے ملے گی؟۔میرے ناقص خیال میں کتب فقہ میں نور الایضاح قدوری اور ہدایہ کے علاوہ سب قابل تبدیل ہیں۔(۱)

نصابی کتابوں پر بعض ضروری کام

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت ہمارے نصاب میں جو کتابیں داخل ہیں وہ اصل میں عام استفادہ کے لئے لکھی گئی تھیں، شاید مصنف کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ ہو کہ یہ ان کی کتاب بھی داخل نصاب ہوگی؛ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جیسے سلف صالحین نے شروح وحواشی کے ذریعہ ان کتابوں کی خدمت کی ہے، نصابی نقطۂ نظر سے آج ان پر کچھ کام کیا جائے۔

اور وہ کام یہ ہے کہ

۱) ذیلی عناوین قائم کئے جائیں۔

۲) فقروں کی ترقیم کی جائے۔

۳) پیراگراف متعین کیا جائے۔

۴) کتاب کو مضمون کے اعتبار سے دروس میں تقسیم کیا جائے۔

۵) ہر درس کے ختم پر تمرینی سوالات تحریر کئے جائیں۔

---

(۱) ماہنامہ الفرقان:٦٦،٦٥

۶) کتاب پر ایک مختصر ایسی تعلیق لکھی جائے جس میں شخصیات، کتب، مقامات اور نسبتوں پر مختصر نوٹس لکھے جائیں۔

۷) کتاب کے شروع میں مؤلف کے حالات۔

۸) کتاب کی خصوصیات۔

۹) موضوع کتاب کا تعارف اور اس کتاب کے طریقۂ تدریس سے متعلق مختصر اصفحہ دیڑھ صفحہ کے نوٹس مرتب کر دیئے جائیں۔

اگر ہماری متداول نصابی کتب پر اس طرح کا کام کیا جائے تو یہ ''کار'' نہیں ''کارنامہ'' ہوگا اور اساتذہ وطلباء کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، نیز اس سے طریقہ تعلیم میں بھی مفید اور مثبت تبدیلی ہوگی۔(۱) چنانچہ اس میں لکھنو کے فرنگی محل نے ڈابھیل گجرات کے ادارۃ الصدیق نے اور پاکستان کے مکتبۃ البشری اور جامعہ اکل کواں وغیرہ نے غیر معمولی پیش رفت کی ہے، انفرادی طور پر بھی بعض مصنفین نے مختلف نصابی کتابوں پر تحقیق وترتیب کا کام کیا ہے، ان خوشنما، عصری ذوق کے مطابق طبع شدہ نسخوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

(۱) دینی وعصری درسگاہیں: تعلیمی مسائل: ۱۰۴

نصاب کے تین مرحلے

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری فرماتے ہیں:

میرا ناقص تجربہ شاہد ہے کہ نصابِ تعلیم میں زیادہ تغیر وتبدل کرنا اس درجہ مفید نہیں جس درجہ ''طریقہ تعلیم'' تبدیل کرنا مفید ہے، اور اساتذہ کرام کو خود عملی نمونہ بننا اور طلبہ کے اخلاق واعمال کی تربیت واصلاح کی جانب توجہ فرمانی تو مفید تر ہے؛ لہٰذا اساتذہ کی خدمت میں چند معروضات اور بعض امور متعلقہ طریق تعلیم عرض کئے جاتے ہیں، اگر ان پر عملا التزام کیا گیا تو انشاء اللہ قوی امید ہے کہ طلبہ کو علوم وفنون اور کتابوں سے بہت جلد مناسبت اور استعداد پیدا ہو جائے گی، نیز ان کی عملی اور اخلاقی حالت بھی سدھر جائے گی:

۱۔ دینی تعلیم مع اپنے مبادی کے عبادت وطاعت ہے، اور اس کا ثمرہ آخرت میں اجر عظیم ہے، لہٰذا تمام اساتذہ عبادت وطاعت اور اجر وثواب ہی کی نیت سے دینی تعلیم کو اپنا فریضہ سمجھیں اور معاشی ضروریات تنخواہ وغیرہ کو اس کے حصول کا وسیلہ وذریعہ خیال فرمائیں۔

۲۔ اساتذہ تعلیم وتدریس کے علاوہ طلبہ کی دین داری اور اعمال واخلاق کی نگرانی کو بھی اپنا فرض سمجھیں اور حسب ضرورت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بھی ادا کریں اور بوقت ضرورت زجر وتوبیخ سے بھی کام لیا کریں، خصوصا زیّ صلحاء (نیک لوگوں کا سا لباس اور ہیئت) نماز با جماعت، ابتداء بالسلام اور جواب سلام کی خود بھی پابندی کریں اور طلباء سے بھی پابندی کرائیں اور داڑھی منڈانا یا کتروانا،

انگریزی وضع کے بال رکھنا اور لباس پہنا، سگریٹ نوشی وغیرہ منکرات کو قطعا روا نہ رکھیں جو طلبہ اس سے باز نہ آئیں ان کو فورا مدرسہ سے خارج کر دیں، اسی طرح فاسد العقیدۃ طالب علم کا وجود بھی مدرسہ کے لئے سخت مضر ہے، اگر افہام وتفہیم کے باوجود باز نہ آئے تو اس کو بھی مدرسہ سے نکال دیں۔

۳۔ اساتذہ اپنے مطالعہ کے وقت اپنے ذہن میں ہر ہر سبق کی ایسی ترتیب قائم کرلیا کریں جسے طلبہ کے ذہن بآسانی قبول وضبط کرسکیں اور پڑھاتے وقت وضاحت اور سہولت کا خاص طور پر لحاض رکھا کریں، الزامی جواب کے بعد تحقیقی جواب بھی ضرور دیا کریں۔

۴۔ اگر طالب علم کوئی معقول بات کہے اس کو مان لیں، اگرچہ اپنی تحقیق یا تقریر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ کم محنت اور بدمحنت طلبہ سے محنت کرانے اور یاد کرانے کا بھی ایسا احسن طریقہ اختیار کریں کہ طالب علم محنت کا عادی اور تحصیل علم وہنر کا شائق بن جائے۔

۶۔ ہر کتاب کے شروع میں اس فن کے مبادی ثلاثہ (حد، موضوع، غایت) اور ترجمہ مصنف اور کتاب کی خصوصیات اور طرز تعلیم بھی طلبہ کے ذہن نشیں کرا دیا کریں۔

تعلیمی حیثیت سے کتب درسیہ کے تین طبقے قرار دیئے گئے ہیں، اولی، وسطی، علیا

اولی: میزان الصرف سے کافیہ تک۔

وسطی: شرح جامی سے ہدایہ اولین تک۔

علیا: تفسیر جلالین سے دورہ حدیث شریف تک

ہر طبقہ سے متعلق طریقہ تعلیم درج ذیل ہے۔

طریقہ تعلیم طبقہ اولی

۱۔ اس طبقہ میں حتی الوسع ترجمہ لفظی اور مطلب خیز، تقریر مختصر اور ذہن نشیں، اندازِ بیان سادہ اور سہل، تفہیم مضمون آسان الفاظ میں ہونا چاہئے، نفس مسئلہ طالب علم

کے ذہن نشیں کرانے کے بعد اس کی زبان سے اعادہ بھی کرانا چاہئے، سبق سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو اپنی نظروں کے سامنے بٹھلا کر سبق یاد کرایا جائے، دوسرے دن پچھلا سن کر اگلا سبق پڑھایا جائے، اور روزانہ حسب حال زبانی اور تحریر سوالات کر کے جوابات دینے کی بکثرت مشق کروائی جائے؛ تاکہ ٹھوس استعداد پیدا ہوسکے۔

۲۔ ''میزان الصرف'' کو خوب اچھی طرح سمجھا کر تھوڑا تھوڑا ترجمہ پڑھا دیا جائے، اور اس کے ساتھ ''علم الصرف'' حصہ اول مصنفہ مولانا مشتاق احمد چرتھاولی سبقا سبقا یاد کرا دیا جائے، اس طرح کہ ''میزان الصرف'' کی ترتیب کے موافق صیغوں اور گردانوں کے نام خوب یاد ہوجائیں، اسم ظرف، اسم تفضیل مذکر ومؤنث میں تصغیر کے صیغے بڑھا دیئے جائیں اور بحث اسم آلہ میں اسم آلہ صغری، وسطی، کبری کے ۱۲ صیغے ''ابواب الصرف'' کی ترتیب کے موافق یاد کرائیں جائیں، اور صحیح ابواب کے صیغے نکالنے اور بتلانے کی خوب مشق کرائی جائے، اس مشق کے لئے تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) سے مدد لی جائے۔

۳۔ ''منشعب'' میں سے صرف ۲۴ باب ۶ ثلاثی مزید، ۴ رباعی مجرد ومزید فیہ کی صرف صغیر جدید بامداد ''تیسیر الأبوب الجدید'' مع نام وعلامتِ باب خوب یاد کرائی جائے، یا بجائے ''منشعب'' کے ''تیسیر الأبواب'' ہی کو خوب یاد کرا کے مشق کرادی جائے، یہ بھی کافی ہے، بعد ازاں ''میزان الصرف'' کی ترتیب پر صرف کبیر مع ترجمہ یاد کرائی جائے اور ''عربی صفوۃ المصادر'' کی مدد سے صحیح ابواب کی صرف صغیر وکبیر گردانوں کی خوب مشق کروائی جائے، اس لئے سال اول میں صرف ایک کتاب ''میزان ومنشعب'' نصاب میں رکھی گئی ہے۔

۴۔ ''علم الصرف'' حصہ سوم میں ہفت اقسام کی صرف صغیر وکبیر با ترجمہ ''عربی صفوۃ المصادر'' کی مدد سے نیز تعلیلات کی خوب اچھی طرح مشق کرائی جائے ''صرف

میر'' اور'' علم الصیغہ'' میں بھی اس کی مشق کو جاری رکھا جائے۔

تنبیہ: صرف کے تمام اسباق ایک ہی استاذ کے پاس ہونی چاہیئے، جو کہنہ مشق اور آزمودہ کار ہو، نو آزمودہ مدرس کے یہ کام ہرگز نہ سپرد کرنا چاہیئے۔

۵۔ ''نحو میر'' میں مسائل زبانی یاد کرانے کے ساتھ ساتھ ہر ہر جملہ کی ترکیب بھی کرائی جائے، نیز کتاب کی مثالوں پر اکتفا ہرگز نہ کیا جائے؛ بلکہ قرآن وحدیث نیز دیگر کتب ادب سے بکثرت مثالیں دی جائیں اور ترکیبیں کرائی جائیں کہ تکثیر امثلہ اس باب میں بے حد مفید ہے، انواع اعراب کو خصوصا خوب ہی یاد کرا جائے ، اور'' عوامل النحو منظوم فارسی' حفظ کرادی جائے۔

۶۔ ''شرح مائۃ عامل' میں ایک دن صرف عبارت مع ترجمہ ومطلب پڑھائی جائے، دوسرے دن ترکیب کرائی جائے اس طرح کہ نوع اول تک اولا چھوٹی ترکیب ہو، ثانیا اسی کی بڑی ترکیب ہو، نوع اول سے نوع ثانی تک صرف بڑی ترکیب ہو، اور نوع ثانی سے آخر تک صرف چھوٹی ترکیب، ہاں اسی اثناء میں گاہے گاہے بڑی ترکیب کا بھی امتحان لیتے رہیں۔

۷۔ ''روض الأدب'' میں یا کسی بھی آسان ادبی کتاب میں تر ترجمے اور صیغوں کی مشق کے ساتھ ترکیب نحوی بھی کراتے رہیں اور عربی تحریر وبول چال کی بھی مشق کرائی جائے۔

۸۔ ''ہدایۃ النحو'' اور'' مرقات'' میں اصطلاحی الفاظ کی تعریفات اصل عربی میں یاد کرائی جائیں اور مسائل اردو زبان میں خوب حفظ کرائیں جائیں اور شب وروز کی گفتگو میں مسائل منطق ان کے لئے اجنبی چیز نہ رہے۔

۹۔ ''نور الایضاح'' اور'' قدوری'' میں مسائل جزئیہ آسان الفاظ میں طلبہ کے ذہن نشیں کرا کے سوال وجواب کے طرز پر ان سے اعادہ کرایا جائے اور سبقا سبقا سنا جائے۔

۱۰۔ ''تہذیب'' کو اس طرح وضاحت اور سادگی سے پڑھایا جائے کہ بغیر کسی پیچیدگی اور دشواری کے ''شرح تہذیب'' کے تمام مباحث آجائیں اور اس کے پڑھنے کی ضرورت نہ رہے۔

طریق تعلیم طبقہ وسطی

۱۔ عبارت بقدر ضرورت ایک ایک مسئلہ کی پڑھوائی جائے، لفظی اور اعرابی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے، لفظ یا اعراب غلط پڑھنے کی وجہ سے مطلب اور معنی میں جو نقص یا اہمال پیدا ہوتا ہے، اس کو خوب واضح کیا جائے؛ تاکہ طلبہ کو عبارت غلط پڑھنے کی قباحت وشناعت کا احساس ہو، حتی الامکان طالب علم سے خود الفاظ یا اعراب صحیح پڑھوایا جائے، جب طالب علم تصحیح سے عاجز ہوجائے تو استاذ غلطی اور اس کی وجہ سمجھائے، اور عبارت صحیح پڑھوایا جائے، جب طالب علم تصحیح سے عاجز ہوجائے تو استاذ غلطی اور اس کی وجہ سمجھائے اور عبارت صحیح کرائے، جو طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے، دوسرے طلبہ سے کہا جائے کہ جہاں یہ لفظ یا عبارت غلط پڑھے تم ٹوکو اور عبارت کی تصحیح کرو، روزانہ ایک ہی طالب علم سے عبارت نہ پڑھوائی جائے، اور نہ باری مقرر کی جائے؛ بلکہ خود استاذ جس طالب علم کو مناسب سمجھے عبارت پڑھنے کے لئے کہے، کمزور طلبہ سے زیادہ عبارت پڑھوائی جائے، اسی طرح جو طلبہ عبارت پڑھنے سے بچتے ہیں، ان سے ضرور عبارت پڑھوائی جائے، یہ اور اس کے علاوہ جو بھی مناسب تدبیریں طلبہ کو مطالعہ دیکھنے اور عبارت صحیح پڑھنے کا عادی بنانے کی ہوسکتی ہیں اختیار کی جائیں، عبارت میں صرف ونحو سے متعلق جو لفظی اشکالات ہوں ان کو سمجھا کر ان کا حل پوری وضاحت کے ساتھ بتلایا جائے، دفع دخل مقدر کی تقریر کر کے کتاب کے جواب کو واضح الفاظ میں منطبق کیا جائے، اس طرح مسئلہ کی تقریر کر کے عبارت باترجمہ اور مسئلہ کا انطباق خود طالب علم سے کرایا جائے، اور ایسے طرز پر مطالعہ دیکھنے کی تاکید کی جائے کہ طلبہ خود مطالعہ میں ان امور کے حل

کرنے کے عادی ہوجائیں، اگرچہ اس طریق پر پڑھانے سے سبق کی مقدار کچھ کم ہوگی؛ مگر یہ چند روز کی بات ہے، اس کے بعد خود طلبہ عادی ہوجائیں گے اور علمی استعداد پختہ ہوجائے گی اور تلافی مافات ہوسکے گی، آغاز سال میں کم از کم یہ طریق ضرور اختیار کی جائے، کبھی کبھی گذشتہ سبق کے متعلق بھی اچانک سوال کیا کریں؛ تاکہ طلبہ پڑھے ہوئے سبق کے اعادہ اور تکرار پر مجبور ہوں۔

اس طبقہ کے طلبہ کے مطالعہ کی طرح تکرار کا عادی بنانا بھی نہایت ضروری ہے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ استاذ طلبہ کو بتلائے کہ ہمارے بزرگوں نے سبق کے اعادہ کے لئے تکرار کا طریقہ اس لئے جاری کیا ہے کہ طالب علم میں علمی استعداد کے ساتھ ساتھ تفہیم وتدریس کی صلاحیت بھی آہستہ آہستہ نشو ونما پاتی رہے، بالفاظ دیگر یہ تکرار درحقیقت مدرسی کی تربیت ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ نہایت آسانی سے نہ صرف مدرس؛ بلکہ کامیاب مدرس بن کر نکلتے ہیں، تکرار کی اس افادیت کو سن کر انشاء اللہ تعالیٰ طلبہ میں تکرار کرنے کرانے کا شوق ضرور پیدا ہوگا، ہر استاذ اپنے سبق کے طلبہ کو دو دو یا تین تین جماعتوں پر تقسیم کردے اور باری باری ہر طالب علم کو تکرار کرانے کی تاکید کرے؛ تاکہ تکرار کا فائدہ تمام طلبہ کو یکساں طور پر پہنچے، نیز استاذ خود تکرار کے اوقات مقرر کرے، اور گاہ بگاہ ان اوقات میں خود جاکر بھی نگرانی کرے؛ تاکہ طلبہ تکرار کے بجائے گپ بازی میں وقت ضائع نہ کریں۔

۲۔ ''کنز الدقائق''، ''اصول الشاشی'' وغیرہ فنی کتابوں میں فن کی اصطلاحات اور الفاظ اصطلاحیہ کی تعریفات تو اصل عربی الفاظ میں یاد کرائی جائیں، اور مسائل کو اس طرح ذہن نشیں اور یاد کرایا جائے کہ اصل فن سے مناسبت پیدا ہوجائے۔

۳۔ ''ترجمہ قرآن عظیم'' میں علوم ومعارف قرآن کے بجائے ''عربیت'' پر زیادہ توجہ کی جائے، ''صرفی ونحوی'' امور کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے مفردات کے لغوی اور مرادی معنی اور محل اعراب کو بتلایا جائے، پھر ''سادہ اور مطلب خیز لفظی ترجمہ'' کرایا

جائے، شانِ نزول اور بیانِ واقعات وقصص میں قدر ضروری پر اکتفا کیا جائے، ربطِ آیات پر ضرور توجہ کرنی چاہئے، اور ''سادہ مطلب خیز ترجمہ'' تو خوب ہی رٹایا جائے۔

۴۔ ''ہدایہ اولین'' کامل تحقیق وتدقیق وعرق ریزی کے ساتھ اس طرح پڑھایا جائے کہ اور ہر مسئلہ اور اس کی دلیل کا عقلی مآخذ جو''اصول کلیہ'' میں سے ہو، طالب علم کے ذہن نشیں کرایا جائے، پھر اس مسئلہ کو متفرع کیا جائے؛ تاکہ طالب علم کے اندر اصل کلی معلوم کرنے اور اس پر مسئلہ کو متفرع کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔

۵۔ علوم وفنون عقلیہ میں ہر علم وفن کی اصطلاحات کو''بعبارتھا'' یاد کرایا جائے، اور اس کے مادی اصول موضوعہ سے آگاہ کر کے مسائل کو اس طرح ذہن نشیں کرایا جائے کہ اس علم وفن سے مناسبت اور استخراج مسائل کا ملکہ پیدا ہو جائے۔

طریقۂ تعلیم طبقہ علیا

۱۔ اس طبقہ کی بیشتر کتابیں علوم وفنون کی آخری اور منتہی کتابیں ہیں، بسا اوقات طلبہ کو اس کے بعد کی کتابیں پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملتا، اس لئے اساتذہ کو پوری محنت وکاوش کے ساتھ نہ صرف کتاب کا؛ بلکہ اس کے مستند حواشی وشروح نیز اس علم وفن کی دیگر محققانہ معاون کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے، اور پڑھاتے وقت صرف کتاب کے حل پر اکتفاء نہ کرنا چاہئے؛ بلکہ اپنے طویل وعریض مطالعہ میں فن کی ضروری اور اہم تحقیقات ومسائل پر بھی نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالنی چاہئے؛ تاکہ ایک طرف کتاب بھی پوری ہو جائے، اور دوسری طرف طالب علم کے کان فن کی اہم اور ضروری تحقیقات سے بھی آشنا ہو جائیں، اور مستند کتابوں کے نام بھی اسے معلوم ہو جائیں، تاکہ فارغ ہونے کے بعد جب وہ خود اس فن یا اس کے مسائل کو پڑھانے بیٹھیں یا کوئی مقالہ یا مضمون لکھنے کا قصد کریں تو ان مآخذ کی مراجعت کر سکیں، نیز عہد حاضر کے دینی مسائل پر ضرور تبصرہ فرمائیں،

تاکہ طلبہ کو فارغ ہونے کے بعد جب ان مسائل سے سابقہ پڑے تو وہ خالی الذہن اور بے خبر نہ ہوں، اور اساتذہ کے بتلائے مآخذ کی مراجعت کرسکیں، نیز عہد حاضر کے دینی مسائل پر بھی ضرور تبصرہ فرمائیں، تاکہ طلبہ کو فارغ ہونے کے بعد جب ان مسائل سے سابقہ پڑے تو وہ خالی الذہن اور بے خبر نہ ہوں، اور اساتذہ کے بتلائے ہوئے مآخذ کی مراجعت کرکے ان کے جواب دہی کرسکیں مثلاً:

۲۔ ''تفسیر جلالین'' پڑھانے کے وقت کتاب کے حل کرنے کے لئے تو ''حاشیہ جمل'' یا کم از کم ''صاوی'' کا اور ربط آیات اور دیگر علوم ومعارف قرآن کے لئے تفسیر ''بیان القرآن'' اور ''سبق الغایات'' کا اور اصول تفسیر سے آگاہ کرنے کے لئے اور ''تفسیر الاتقان'' کا اور تفسیر قرآن کے سلسلہ میں احادیث ومسائل فقہ کی تحقیق کے لئے ''تفسیر مظہری'' کا حسب ضرورت مطالعہ کرتے رہا کریں۔

۳۔ علم اصول حدیث، حدیث کا اہم ترین موقوف علیہ ہے اور نصاب میں صرف ''مقدمہ مشکوۃ'' اور ''شرح نخبہ'' یا ''خیر الاصول'' کو رکھا گیا ہے، حضرات اساتذہ کو چاہئے کہ وہ ان کتابوں میں سے مصطلحات حدیث کو خوب حفظ کرائیں، مگر خود ''مقدمہ ابن صلاح'' یا ''تدریب الراوی'' کا مطالعہ کریں، اور حسب ضرورت وموقع فن کے اہم مسائل پر ان کتابوں کی مدد سے سیر حاصل تبصرہ کریں۔

۴۔ ''مشکوۃ شریف'' پڑھاتے وقت سادہ اور مطلب خیز حدیث کا ترجمہ کرانے کے بعد ہر حدیث سے مستنبط فقہی مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کے اقوال ومذاہب مع ادلہ تو نہایت اختصار کے ساتھ اور حنفی مذہب اور اس کے دلائل ذرا تفصیل وتحقیق کے ساتھ بیان کریں اور اگر حدیث بظاہر مذہب حنفی کے خلاف ہو تو اس کا آخری اور تحقیق جواب بصورت ترجیح یا تطبیق توجیہ وتاویل ضرور بیان کریں، اس سلسلہ میں ابن رشد کے ''بدایۃ المجتہد'' سے مدد لیں اور ''لمعات شرح مشکوۃ'' یا ''التعلیق الصبیح'' کا بالالتزام مطالعہ کریں۔

۵۔ دورہ حدیث شریف کی کتب عشرہ بالخصوص ''بخاری شریف'' پڑھانے کے وقت ''فتح الباری'' ''عینی'' ورنہ حواشی حضرت مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے ''الابواب والتراجم'' کا بالالتزام مطالعہ کریں۔

اور ''جامع ترمذی'' پڑھانے کے وقت ''معارف السنن'' یا ''الکواکب الدری'' کا اورسنن ابی داؤد پڑھانے کے وقت ''بذل المجہود'' کا۔

علی ہذا القیاس باقی کتب پڑھانے کے وقت ان کے حواشی وشروح کا ضرور مطالعہ کریں ؛ مگر ان طویل وعریض شروح میں سے اہم ترین مباحث نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں، تاکہ کتاب بھی ختم ہوسکے اور جس کتاب حدیث کو بھی شروع کرائیں اول بطور مقدمہ تاریخ تدوین حدیث، حجیت حدیث، اصحاب صحاح وسنن کے تراجم اوران کے شرائط ومراتب اور خصوصیاتِ کتب عشرہ پر اجمالا اور زیر درس کتاب اور مصنف سے متعلق امور مذکورہ پر تفصیلا محققانہ تبصرہ کریں، اس کے بعد کتاب شروع کرائیں، اور نہایت متانت ووقار اور احترام کے ساتھ ایک ایک باب وحدیث کے لفظی ومعنوی حل طلب امور اوراس سے مستنبط احکام ومسائل پر سیر حاصل تقریر کریں، اور مختلف فیہ مسائل میں ائمہ مجتہدین کے اقوال ومذاہب اوران کے مستدلات نہایت عزت واحترام کے ساتھ بیان کرکے مذہب حنفی اوراس کے دلائل پر انتہائی محققانہ مگر منصفانہ بحث کریں اور وجوہ ترجیح بیان کریں، مناظرانہ اور مجادلانہ طرز پر ہرگز نہ اختیار کریں، اور اختلاف کو حتی الامکان ختم یا کم کرنے کی کوشش کریں، نہ کہ حدیث کو مذہب کے مطابق کرنے کی، کہ اصل حدیث ہے اور مذہب اس سے ماخوذ ومستنبط، حدیث میں تاویل اور صرف عن الظاہر کرنے کے بجائے رجال وسند پر محققانہ کلام کرنا زیادہ مفید اور بہتر ہے، اس لحاظ سے امام طحاوی رحمہ اللہ کی ''شرح معانی الآثار'' حنفیہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے، اختلافی مسائل پر کلام کرتے وقت اس کو اور ''مؤطا امام محمد'' کو پیش نظر رکھنا حنفیہ کے لئے از بس ضروری ہے۔

قدیم ''فرق زائغہ'' اور زمانہ حال کے ''فرق باطلہ'' کی محققانہ تردید کریں،

اور ’’اعلاء کلمۃ الحق‘‘ کا فرض ادا کریں، اسی کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ’’تصحیح عقائد ونیات‘‘ اور ’’تزکیہ اخلاق واعمال‘‘ کی بھی ترغیب دلائیں؛ تاکہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا فرض بھی اداء ہو، اس باب میں استاذ کو ورع وتقوی اور خوف وخشیت الٰہی کا عملی نمونہ ازبس ضروری ہے، اور محدث کے شایانِ شان بھی یہی ہے۔

نیز اپنی بحث وتحقیق کو متعارف اخلاقی مسائل ومباحث تک محدود نہ رکھیں؛ بلکہ علوم ومعارف حدیث علی صاحبہا التحیۃ والتسلیم‘‘ کو ایسی تحقیق ووضاحت کے ساتھ بیان فرمائیں کہ طلبہ کے ذہنوں میں حدیث کی شایانِ شان اہمیت اور دین میں اس کا حقیقی مرتبہ ومقام راسخ ہوجائے؛ تاکہ وہ عہد حاضر کے ’’عظیم ترلادینی فتنہ انکارِ حدیث‘‘ کی جواب دہی اور بیخ کنی پر پورے طور پر قادر ہوجائیں۔

عام طور پر حدیث پڑھانے والے اساتذہ سال کا بیشتر حصہ صرف ارکان اربعہ کے مسائل اختلافیہ کی بحث وتحقیق پر صرف کردیتے ہیں، اور آخر میں کتاب کی تلاوت رہ جاتی ہے، اور اس کے باوجود بھی بیشتر کتابیں ختم نہیں ہوتی، یہ طریقہ سخت مضر اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کرنے کے باب میں تقصیر کے مترادف ہے، أعاذنا اللہ منہ، اس لئے استاذ کو روز اول سے کتاب کے ختم کرنے کو پیش نظر رکھنا چاہئے، خود بہت کچھ دیکھنا اور مطالعہ کرنا چاہئے اور طلبہ کے سامنے کم سے کم مگر بے حد ضروری اور اہم باتیں علی وجہ البصیرہ بیان کرنی چاہئے۔

۶۔ حدیث کی طرح اس طبقہ کے بقیہ علوم وفنون کے اساتذہ کو بھی اسی طریق کار کے مطابق اپنا مطالعہ زیر درس کتاب تک محدود نہ رکھنا چاہئے، مثلاً ’’ہدایہ اولین‘‘، اخیرین‘‘ پڑھاتے وقت ’’فتح القدیر‘‘ اور ’’حاشیہ مولانا احمد حسن سنبھلی‘‘ ورنہ کم ازکم ’’عنایہ کا اور ’’شرح عقائد‘‘ پڑھاتے وقت ’’اشارات المرام للبیضاوی‘‘ ورنہ کم ازکم ’’حاشیہ مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ کا اور ’’متنبی‘‘ پڑھاتے وقت ’’شرح برقوتی‘‘ ورنہ ’’حاشیہ مولانا اعزاز علیؒ‘‘ ضرور زیر مطالعہ رہنا چاہئے۔

۷۔ سیرت وتاریخ وہ جدید علوم ہیں جو اسی سال وفاق نے نصاب تعلیم میں اضافہ کئے ہیں، ان کے اساتذہ کو درسی کتابیں شروع کرانے سے پہلے ہر دو علموں کی وسیع معلومات کا ذخیرہ مہیا کر لینا چاہیے، تاکہ پڑھاتے وقت ہر دو علموں کے اہم ترین مباحث کی طلبہ کو نشان دہی کر سکیں اور یاد کرا سکیں، ہر دو علموں پر عربی اردو دونوں زبانوں میں مستند محققین کی تصانیف موجود اور دستیاب ہیں، مثلاً ''سیرت مغلطائی'' کے ساتھ ''سیرت ابن ہشام''، ''نور الیقین''، ''اتمام الوفاء'' کا اور ''تاریخ أبو الفداء'' کے ساتھ ''محاضرات خضری'' (عہد بنو امیہ، بنو عباس) کا مطالعہ کرنا چاہیے، اردو میں ''اوجز السیر''، ''تاریخ خلافت راشدہ'' مصنفہ عبد الشکور لکھنوی، اور خضری کی محاضرات کا اردو ترجمہ اور اس کے علاوہ جو بھی کتابیں تاریخ وسیرت کی میسر آئیں، ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

تاریخ وسیرت کے استاذ کے لئے عہدِ رسالت، عہد خلافت راشدہ، عہد بنو امیہ، عہد بنو عباس، اور عہد حاضر کے اسلامی ممالک کے جغرافیئے، خواہ عربی میں ہوں خواہ اردو میں، جس طرح ممکن ہو حاصل کر کے اس میں بصیرت حاصل کر لینی چاہیے، اس لئے کہ وفاق کے مجوزہ نصاب میں تاریخ کے ساتھ جغرافیہ بھی لازمی مضمون ہم، مدرسہ کو اس سلسلہ میں مدرس کی پوری امداد کرنی چاہیے کہ اس کے بغیر مدرس ان نئے علموں کو نہ حقہ پڑھا سکتا ہے اور نہ امتحان کی تیاری کرا سکتا ہے۔

۸۔ علم کلام اور علم اخلاق بھی جدید علوم ہیں، ان کے پڑھانے والے استاذ کے لئے متعلقہ کتاب شروع کرانے سے قبل علم اخلاق میں امام غزالی کی ''احیاء علوم الدین'' کا ورنہ کم از کم ''کیمیائے سعادت'' کا اور علم کلام جدید میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی ''حجۃ الاسلام''، ''انتصار الاسلام''، ''قبلہ نما'' کا اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تصانیف کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

اس طبقہ کے استاذ کو چار سے زیادہ اسباق ہرگز نہ دیئے جائیں ورنہ وہ

کتاب اورفن کا حق ہرگز ادا نہ کرسکیں گے، اور طلبہ تشنہ کام اور ادھورے رہ جائیں گے، اور مدرس کا اس میں کچھ قصور نہ ہوگا، خصوصا علوم جدیدہ، کہ ان سے تو عموما مدارس عربیہ کے اساتذہ خود ونا آشنا ہیں، درحقیقت استاذ کو پہلے خود پڑھنا پڑے گا اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ان کتابوں کے حواشی اور شروح بھی نہیں۔(۱)

فنون پر علمی تبصرہ

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مقالات فراہی سمینار بعنوان علامہ حمید الدین فراہی حیات وافکار میں تمام علوم وفنون کے تئیں فرماتے ہیں:

> ''اس کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ بارہویں صدی کے ایک جلیل القدر عالم اور نقاد علامہ شوکانی نے جو اپنی مجتہدانہ تصنیف "نیل الأوطار" کے ذریعہ سے روشناس ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مفسر بھی ہیں اور فتح القدیر کے مصنف بھی ہیں، انہوں نے ایک بات لکھی ہے، بڑے نکتے کی، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کی چار قسمیں ہیں: ایک علم وہ ہے جو پکا اور جل گیا، ایک علم وہ ہے جو پکا لیکن جلا نہیں، اور ایک علم وہ ہے کہ جو نہ پکا نہ جلا، تو جس علم کہتے ہیں "نَضَجَ وَاحۡتَرَقَ" جو پکا اور پختگی کو پہنچا اور جل گیا، یہ مذمت کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ اس کے کمال کا اظہار ہے کہ اپنے نقطہ ارتقاء کو وہ پہونچ گیا، وہ تو علم نحو ہے اور علم حدیث کو بھی غالبا (اگر میرا حافظہ کوتاہی نہیں کرتا تو) اس میں شامل کیا کہ اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے، نحو میں اب قیل وقال گنجائش نہیں ہے، نحو پر اتنا کام ہوگیا ہے کہ اب اس میں کوئی یہ کہے کہ یہ اصول غلط ہے، یہ اصول ہونا چاہیے، اور یہ قیاس صحیح نہیں اور یہ قیاس ہونا چاہئے اور یہ

(۱) تحفۃ المدرسین یعنی مثالی استاذ بن کر آپ تدریس ایسے کریں::۹۹۔۱۰۹، ادارۃ الرشید، کراچی

مسئلہ نحو کا غلط ہے، عربوں کا کام تھا، اہل زبان کا کام تھا، اور پھر اہل زبان کے بعد جو اپنے وقت کے عبقری ترین انسان تھے، ان میں سے میں سیبویہ کا نام خاص طور پر لوں گا، انہوں نے اس کا کو ختم کر دیا، جہاں تک حدیث وروایات کا تعلق ہے رجال کا تعلق ہے وہ بھی اس میں شامل ہے، پھر اس کے بعد کہتے ہیں: وہ علم جو پکا لیکن جلا نہیں، وہ علم فقہ ہے، اور صحیح کہا ہے کہ جب تک نسل انسانی باقی ہے اور دنیا میں تغیر کا عمل جاری ہے، اور جب تک انسانی زندگی میں تنوع اور انسانی زندگی کے مطالبات غیر محدود ہیں، اس وقت تک فقہ کو مکمل نہیں کہہ سکتے کہ فقہ میں تمام مسائل کی تدوین ہو چکی، اور ہر چیز کا جواب کھلا رہے گا، پھر انہوں نے کہا ہے کہ وہ علم جو پکا بھی نہیں جلا بھی نہیں وہ علم تفسیر ہے، اور یہ الفاظ ڈرتے ہوئے میں نے ادا کئے ہیں؛ اس لئے کہ اس سے بھی یہ نہ سمجھا جائے کہ علم تفسیر پر کوئی کام نہیں ہوا، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس کی نسبت اللہ تبارک وتعالی کے علم وکلام سے ہے، اور انسانی زندگی سے ہے، اور اس کی تحدید نہیں کی جا سکتی کہ اس کا پورا جواب دیا دے گیا اور اس کو مدون کر دیا گیا تو واقعہ یہ ہے کہ علم تفسیر میں برابر اس کی گنجائش رہی کہ لوگ پیدا ہوتے رہے اور اضافہ کرتے رہے“۔(۱)

مقصد یہ ہے کہ دینیات، ناظرہ حفظ یا اعدادیہ کے نام سے شروع کی جانے والی ابتدائی جماعتوں میں اردو زبان پر عبور، فارسی زبان سے ضروری واقفیت پیدا ہو جانی چاہئے، ورنہ فراغت اور فراغت کے بعد تک یہ مرض رسوا کن اور پریشان کرتا رہتا ہے۔

---

(۱) مقالہ ابوالحسن ندوی، مقالات فراہی نمبر: علامہ حمید الدین فراہی حیات وافکار: ۲۲-۲۳، مرتبہ عبداللہ فراہی، ناشر، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی: ۲۰۱۶

فن صرف

میزان الصرف یا علم الصرف

۱) صرف کے آغاز میں گردانیں یاد کرانا ناگزیر ہے، گردانیں اس طرح یاد ہونی چاہئے کہ وہ خودبخود زبان پر چڑھ جائیں اور کسی جگہ اٹکاؤ یا جھجک باقی نہ رہے۔

۲) لیکن عموماً اساتذہ صرف گردانوں کے رٹوانے پر اکتفاء کر لیتے ہیں اور جب طالب علم کو کوئی گردان اچھی طرح حفظ ہو جائے تو آگے منتقل ہو جاتے ہیں اور صیغوں کی شناخت کی طرف توجہ نہیں دیتے؛ حالانکہ طالب علم کو گردان کا یاد ہونا جس قدر ضروری ہے اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ وہ ہر صیغے کو فوراً پہچان کر اس کا صحیح مطلب اور اس کا محل استعمال اچھی طرح سمجھ لے، لہٰذا استاذ کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ گردان یاد کرانے کے بعد مندرجہ ذیل کام کرے اور جب تک ان کاموں کی تکمیل اطمینان بخش طریقے پر نہ ہو، اگلے درس کی طرف منتقل نہ ہو۔

(الف) ہر ہر صیغے کے بارے میں یہ پہچان کہ وہ کون سا صیغہ ہے؟ مذکر ہے یا مؤنث، واحد یا تثنیہ یا جمع؟ اس کے لئے دو طرفہ مشقیں زبانی طور پر کرانی ضروری ہیں، یعنی طالب علم سے مختلف صیغوں کے بارے میں یہ پوچھا جائے کہ وہ کونسا صیغہ ہے؟ مثلاً ''فَعَلَتْ'' یا ''ضَرَبَتْ'' کون سا صیغہ ہے؟ دوسرے مختلف صیغوں کے نام لے کر وہ صیغے بنوائے جائیں مثلاً: ''ضَرَبَ'' سے ماضی واحد مؤنث حاضر وغیرہ، دونوں قسم کی مشقیں اتنی کثرت سے کرائی جائیں کہ صیغوں کی یہ دو طرفہ پہچان طالب علم کے

ذہن نشین ہوجائے اور ہر طالب علم سے اوسطاً ہر صیغے کے بارے میں متعدد سوالات ہوجائیں، اس کام میں اگر ایک دو سبق پورے بھی ہوجائیں تو اس کی پرواہ نہ کی جائے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ ہر صیغے کے صحیح معنی طالب علم کے ذہن نشین ہوں اور صیغہ سنتے ہی اس کے معنی اس کی سمجھ میں آجائیں، اس کے لئے بھی دو طرفہ مشقوں کی ضرورت ہے، ایک طرف عربی صیغہ بول کر طالب علم سے اس کے معنی دریافت کئے جائیں اور دوسرے اردو بول کر اس کا ترجمہ طالب علم سے کرایا جائے، یہ دو طرفہ مشقیں بھی اتنی کثرت سے ہونی چاہئے کہ صیغوں کے صحیح معنی اور ان کا صحیح محل استعمال ذہن میں پیوست ہوجائے۔

(ج) میزان میں تمام گردانیں ''فعل'' کے مادے پر مبنی ہیں، اور وہی یاد کرائی جاتی ہیں، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مادوں سے وہی گردانیں طالب علم سے نکلوائی جائیں مثلاً: ''قَرَأَ''، ''فَتَحَ''، ''سَجَدَ'' وغیرہ اور ان کے معانی بھی ذہن نشین کرائے جائیں۔

(د) جن مشقوں کا ذکر اوپر (ب) اور (ج) میں کیا گیا ہے، وہ زبانی طور پر کرانے کے علاوہ تحریری طور پر کرانا بھی لازمی ہے، یعنی اردو میں ایسے جملے دیئے جائیں جن کا ترجمہ طلبہ اپنے پڑھے ہوئے افعال کے مختلف صیغے بنا کر کر سکیں، مثلاً مندرجہ ذیل جملوں کا ترجمہ کرایا جائے۔

ان عورتوں نے سجدہ کیا، (مردوں) نے کھایا، اور ان دو عورتوں نے پڑھا، وھکذا، ان مشقوں میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ تمام صیغے استعمال ہوجائیں۔

یہ تمام کام ماضی، مضارع، امر اور نہی کی تمام گردانوں میں کرائے جائیں۔

۳) تحریری مشقوں میں شروع ہی سے طالب علم کو اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ وہ صاف ستھرے انداز میں سلیقے سے لکھے جہاں حاشیہ چھوڑنا ضروری ہو وہاں حاشیہ چھوڑے، سطریں سیدھی رکھے، تحریر اور ترتیب میں توازن ہو۔

۴) جو طالب علم تحریری کام کر کے نہ لائے اور اس کے پاس کوئی معقول عذر نہ ہو، اس کو مناسب تنبیہ کی جائے۔

۵) جو طلبہ حافظے یا ذہن کے اعتبار سے کمزور ہوں، انہیں ہر روز کا سبق یاد کرانے کی ذمہ داری جماعت کے ذہین اور اچھے طلبہ پر لگائی جائے، اور جن طلبہ سے تمام اسی طرح کی کوششوں کے باوجود مایوسی ہو جائے، ان کی رپورٹ ناظم تعلیمات کو کی جائے اور اگر مایوسی حق بجانب ہو تو اس کو تعلیم کے بجائے کسی اور مشغلے میں لگانے کے لئے فارغ کر دیا جائے۔

۶) صرف صغیر میں اگرچہ گردان کا صرف ایک صیغہ طالب علم کو یاد کرایا جاتا ہے، لیکن استاذ کو چاہئے کہ وہ اس سے کبھی کبھی اس بحث کی پوری گردان سنے مثلا: باب استفعال کی صرف صغیر میں مضارع کا وہ صرف "یَسْتَنْصِرُ" یاد کرے گا؛ لیکن اس سے "یَسْتَنْصِرُ" کی پوری گردان نکلوائی جائے اور پھر اس میں بھی مندرجہ ذیل مشقیں جاری کی جائیں۔

۷) تعلیلات کے بیان میں صرف تعلیلات کے قواعد یاد کرانے کو کافی نہ سمجھا جائے؛ بلکہ ہر قاعدے کو بہت سی مثالوں سے سمجھایا جائے اور طالب علم سے مثالوں میں ان قواعد کا اجراء کرایا جائے)۔(۱)

آسان صرف

❁ علم صرف کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے، اس وقت بچوں میں عربی کی استعداد نہ ہونے کے درجہ میں ہوتی ہے، اس لئے میرا یہ طریقہ ہے کہ

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۷، ۸، ۹، ۱۰

جب عربی کے سبق میں فعل ماضی کا استعمال آتا ہے تو میں بچوں کو فعل ماضی کی گردان لکھ کر دیتا ہوں اور اتنا رٹاتا ہوں کہ وہ بچوں کو یاد ہو جاتی ہے، یوں رفتہ رفتہ کافی گردانیں ان کو کتاب کے بغیر یاد کرا دیتا ہوں، پھر میزان شروع کراتا ہوں اور ساری گردانیں بالترتیب یاد کراتا ہوں۔

''کتاب الصرف'' بچوں کے لئے ابتداء میں مشکل ہے کیوں کہ وہ مسائل فن کی جامع کتاب نہیں ہے، اور ''علم الصرف'' نسبتا آسان ہے؛ مگر اس میں قواعد اشعار میں بیان کئے گئے ہیں، جو ابتداء میں مناسب نہیں۔

اس رسالہ میں اس بات کی رعایت رکھی ہے کہ بچوں پر ابتداء ہی سے قواعد کا بہت بوجھ نہ پڑے، نہ بہت زیادہ تمرینات دی ہیں، یہ سب باتیں حصہ دوم میں آئیں گی، حصہ اول میں بہت سادہ انداز میں ضروری قواعد سمجھا کر گردانیں دی گئی ہیں۔(۱)

خاصیات ابواب

علم صرف کا علوم عربیہ میں اہم مقام ہے وہ زبان کی کلید ہے، وہ ترکیب میں واقع ہونے سے پہلے کلمات کی ذات کا تعارف کراتا ہے، وہ ایک مادہ لے کر اس کو مختلف صورتوں میں ڈھالتا ہے اور اس میں متنوع اور مختلف خاصیات پیدا کرتا ہے۔

اس فن کا خلاصہ تین ابواب ہیں (۱) تصریفات (۲) تعلیلات (۳) اور خاصیات

❁ تصریفات (گردانیں) نسبتا آسان ہیں، ان سے مشکل تعلیلات ہیں اور سب سے اہم مشکل خاصیاتِ ابواب ہیں، طلبہ بہت آسانی سے صحیح سے گردانیں یاد کر لیتے ہیں، مگر جب ہفت اقسام کی گردانوں اور ان کی تعلیلات کا نمبر آتا ہے تو ان کی ہمت جواب دینی لگتی ہے، لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اس پرخار وادی کو بھی پار کر لیتے ہیں؛ مگر جب آخری مرحلہ (خاصیات ابواب) کا نمبر آتا ہے تو وہ اس پر بس سرسری گذر جاتے ہیں، حالانکہ عربی زبان میں اسی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، اس

(۱) آسان صرف: ۱؍۲، مکتبہ حجاز

میں مہارت کے بغیر نہ تو قرآن فہمی ممکن ہے نہ حدیثوں کو کما حقہ سمجھا جا سکتا ہے۔
علم صرف کی تمام اہم کتابوں میں خاصیات کا بیان کتاب کے آخر میں ضمنی طور پر آتا ہے اور نصاب میں سب سے آخر میں خاصیات والا حصہ پڑھایا جاتا ہے؛ مگر وہ بہت مختصر ہے اور بہت سی خاصیات کی تو مثالیں تک نہیں دی گئی ہیں، اسی لئے اساتذہ کو بھی سخت دشواری پیش آتی ہے: ضرورت اس بات کی تھی کہ خاصیات پر کوئی آسان اور جامع رسالہ سامنے آتا جس سے خاصیات ابواب کو قابو میں کرنا سہل ہوتا۔(۱)

❁ اس حصہ (آسان صرف حصہ ۲) میں میزان ومنشعب کے مضامین مکمل دیدیئے ہیں، گردانیں یاد کرنے کے بعد یہ حصہ آسان ہے، اساتذہ کرام کو چاہئے کہ اس حصہ میں قواعد کی طرف پوری توجہ دیں اور گردانوں اور تمرینات کے ذریعہ ان کو خوب ذہن نشیں کرائیں۔
ہفت اقسام کی گردانیں اس حصہ میں بھی نہیں دی گئی ہیں؛ کیوں کہ ان کے ساتھ قواعد تعلیل کو جاننا ضروری ہے اور ابھی بچے اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، ہفت اقسام کی گردانیں حصہ سوم میں آئیں گی۔
یہ حصہ بھی اور آسان صرف حصہ اول بھی سال اول ہی میں پڑھایا جائے حصہ اول ختم ہونے کے بعد اس کو مکمل سن لیا جائے، پھر یہ حصہ شروع کرادیا جائے اور اس حصہ میں خصوصی توجہ اسمائے مشتقہ کے قواعد کی طرف دی جائے اور ایک خاص بات یہ عرض کرنی ہے کہ قواعد کا اجراء ضروری ہے (دوسری عربی کتابوں میں صرف کے قواعد بار بار پوچھے جائیں اور کہیں کہیں صرف صغیر یا صرف کبیر بھی کرائی جائے اس طرح قواعد ذہن نشیں ہو جائیں گے اور گردانوں کی خوب مشق ہو جائے گی۔(۲)

(۱) آسان خاصیات ابواب: ۴، مفتی سعید صاحب، مکتبہ نعیمیہ
(۲) از مفتی سعید احمد صاحب، آسان صرف: ۳، ص: ۲، مکتبہ وحیدیہ

❁ فہم القرآن کے لئے علوم عربیت کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت ہے، ان علوم میں مہارت کے بغیر فہم القرآن کا دعوی مضحکہ خیز ہے، ان علوم عربیت میں ''علم صرف'' بنیادی حیثیت رکھتا ہے، قدماء ومتأخرین نے ہر دور میں عمدہ سے عمدہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، لیکن متأخرین کی تصانیف میں دو کتابیں بے نظیر ہیں (۱) صرف میر (۲) علم الصیغہ، قوانین زرّاری، دستور المبتدی، تصریف زنجانی، وشافیہ ابن حاجب وغیرہ فارسی، عربی اس کا عربی مقابلہ نہیں کرسکتی (علم الصیغہ) متحدہ ہندوستان کے درس نظامی کی اہم درسی کتاب ہے اور نصاب میں داخل ہے۔(۱)

علم صرف کے لئے درس نظامی میں چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں علم الصیغہ سب سے زیادہ جامع اور بے نظیر کتاب ہے، اپنے مصنف کی ایک کرامت کا درجہ رکھتی ہے، اب چونکہ فارسی زبان تقریبا متروک ہوگئی تو اب مبتدی طلباء پر دوہری مشقت ہوگئی کہ پہلے کتاب سمجھنے کے لئے فارسی زبان سیکھیں، پھر اس کے ذریعے عربی کا علم صرف حاصل کریں، اس لئے ضرورت عرصے سے محسوس ہورہی تھی کہ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں جو فارسی زبان میں ہیں ان کو سلیس اردو میں منتقل کردیا جائے۔(۲)

''علم الصیغہ'' ہمارے نصاب میں صرف کی آخری کتاب ہے، اس اس میں اہم ترین حصہ قواعد، تعلیلات کا ہے، یہ قواعد اس کے بعد کہیں طالب کے سامنے نہیں آئیں گے، لہٰذا ان کو خوب یاد کرا کے ازبر کرا دینا اور ان کا اجراء استاذ کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

اس طرح ''خاصیات'' کا بیان پہلی اور آخری مرتبہ صرف ''فصول اکبری'' ہی میں طالب علم کے سامنے آئے گا، ان خاصیات کو بھی نہ صرف ذہن نشیں؛ بلکہ اچھی طرح یاد کرنا لازمی ہے (درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھے اور پڑھائیں)

حضرت مفتی صاحب اپنی اس کتاب میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

---

(۱) از مفتی رفیع عثمانی، علم الصیغہ: ۵، زم زم بکڈپو

(۲) علم الصیغہ: ۷، زم زم بکڈپو

''ابتدائی درجات کے نصاب میں صرف ونحو کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ اس کی بہت سی مثالیں دے کر قاعدے کو ذہن نشیں کرایا گیا ہو، اور پھر تمرینات کے ذریعے طلباء کن ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو، عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوئی ہیں، مثلاً نحو وصرف کے ابتدائی اور متوسط درجے کے لئے ''النحو الواضح'' اور اعلی درجات کے لئے ''النحو الوافی'' وغیرہ ان کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے''۔

❁ صرف کی کتابوں میں ابتداء ہی گردان کو رٹانے پر طلبہ کو بالکل مصروف نہ کیا جائے یہ بے حد مضر ہے؛ بلکہ اولا صیغوں کی وضع اور بناء اچھی طرح سمجھائی جائے اور غائب وحاضر، مذکر ومؤنث، واحد وتثنیہ اور جمع کا فرق خوب سمجھایا جائے۔

جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اولا ۱۴ صیغوں کو تین قسموں پر منقسم کیا جائے، ۶ صیغے غائب کے، ۶ رصیغے حاضر کے اور ۲ رصیغے متکلم کے پھر ۶ رصیغوں کو دو پر تقسیم کئے جائیں: تین مذکر، تین مؤنث پھر تین کو واحد، تثنیہ اور جمع پر۔

اسے سمجھایا بھی جائے اور اسی طرح لکھوایا جائے اور یاد کرنے اور سنانے میں بھی تین تین صیغوں پر سکتہ کرتے ہوئے سنائیں: بلکہ لکھنے میں دو تین کلر سے لکھوائے جائے تو زیادہ مفید ہے، اور حد فاصل کے طور پر سطر چھوڑ کر لکھوائے جائیں، اس کے لئے دو تین دن صرف کئے جائیں؛ لیکن خوب سمجھا لیا جائے پھر اتنا رٹا دیا جائیں کہ پختہ ہو جائے۔

جب گردان پختہ ہو جائے تو پھر دوسرے مادوں سے اسی وزن کی دوسری پانچ سات گردانیں بلوائی جائیں، پھر مختلف صیغوں کا عربی سے اردو، اور اردو سے عربی ترجمہ کی مشق خوب کرائی جائے، صیغوں کی ہیرا پھیری سے ذہن عادی بن جائے گا۔

تعلیل کا حال

تعلیل میں بھی طلبہ کو قواعد لکھنے کا حکم دیا جائے اور انہیں سمجھایا جائے، پھر رٹایا جائے۔
جب سمجھ کر یاد کر لیں تو اس میں پختگی لانے کے لئے اسی وزن پر دوسرے مادوں کو لے کر اسی قاعدہ کو طالب علم سے بلوا کر قاعدہ کا اجراء کروایا جائے، اور صرف صغیر سے بھی کسی بحث سے پوری گردان کرالی جائے۔

فن صرف کے دوسرے سال میں مصادر اور جمع بھی زیادہ بتائے جائیں، اہل ادب واہل عرب جدا جدا مصادر و جمعوں کو استعمال کرنے کے عادی ہیں:

فن صرف میں صرفی کثیر الاستعمال اصطلاحات مثلاً ہفت اقسام کی اچھی جانکاری طلبہ میں پیدا کی جائے اور ثلاثی ورباعی، مجرد و مزید فیہ کی معرفت اور مطلق و ملحق اور ان کے ابواب کی معرفت مثلاً ثلاثی مزید مطلق کی دو قسمیں (۱) باہمزۂ وصل کے سات ابواب (۲) بے ہمزۂ وصل کے پانچ ابواب اور پھر ثلاثی مزید ملحق کی دو قسمیں (۱) ملحق برباعی مجرد کے صیغے۔

نوٹ: تمام فنون کی تمام کتابوں میں عربی دوم عربی سوم تک اپنے اپنے طرز سے اسباق کی کاپیاں بنوائی جائیں؛ بلکہ بعض چھوٹی کتابوں میں تو دو دو کاپیاں ہونی چاہیے وہ ادب کی ہو کہ صرف کی اور چھوٹی جماعتوں میں ہفتے دس دن کے اسباق کا دور ضرور کرایا جائے اور انہیں کہا جائے کہ وہ اچھی طرح یاد کر لیں اور سمجھ لیں۔

دور ''نظر ثانی'' اس لئے کوئی بھی چیز صرف ایک مرتبہ پڑھنے سے پختہ نہیں ہوسکتی جب تک اس پر بار بار نظر نہ کی جائے؛ لہٰذا دور ضرور کرایا جائے۔

طلبہ کو اس کا بھی پابند بنایا جائے کہ کم از کم ایک سبق کو تین دن تک اور زیادہ سے زیادہ پانچ دن تک زیر نظر رکھیں، یہ عمل صلاحیت بنانے کی ضمانت ہے اگر کوئی کرے۔(۱)

صرف پڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ گردانوں کو خوب رٹایا جائے، فعل ماضی کی گردان

(۱) فن تدریس کے اصول: ۱۷۲

اتنی رواں ہوجائے کہ ایک سانس میں طالب علم تین بار گردان پڑھ سکے جو افعال ادبی کتابوں میں آتے ہیں بچوں سے ان کی گردان کرانی چاہئے اور گردان مع ترجمہ وصیغہ اور بلا ترجمہ لکھائی جائے۔

- عربی ادب کی کتابوں سے عربی اور اردو ترجمہ کی مشق کرائی جائے۔
- اس کی اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمہ کی مشق کرائی جائے۔
- صحیح کی گردان یاد ہونے پر ہفت اقسام مثلاً مہموز، معتل وغیرہ کی خوب مشق کرائی جائے، نیز ماضی، مضارع امر کی گردانوں کی مشق خوب کرانی ضروری ہے، لغت دیکھنے پر اس کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔(۱)

علم صرف کی تعلیم عربی کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے، اس وقت بچہ میں عربی کی استعداد صفر کے درجہ میں ہوتی ہے اور علم صرف، علم نحو سے بھی زیادہ مشکل فن ہے، گردانوں کے متشابہات، قواعد کی صعوبت، تعلیلات کی بھول بھلیاں اور خاصیات ابواب کی سنگلاخ وادی سے بچوں کے لئے گذرنا مشکل ہوتا ہے، کچھ بچے ہمت مردانہ سے کام لے کر پار ہوجاتے ہیں اور زیادہ تر آبلا پائی کے شکار ہوجاتے ہیں، اردو میں علم صرف کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی تدریج کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے یا تو قواعد اشعار میں بیان کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے کریلا اور نیم چڑھا کا مصداق ہوگئی ہیں۔آسان صرف کے تین حصے اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں بس برائے نام قواعد دے کر گردانیں یاد کرائی گئی ہیں اور ابواب کی اجمالی فہرست دی گئی ہے، حصہ دوم میں ابواب کی صرفِ صغیر اور ہفت اقسام سے روشناس کرایا گیا ہے اور آخری حصہ میں تصریفات، تعلیلات اور خاصیات کے بارے میں ضروری باتیں بیان کی گئی ہیں، اساتذہ کرام یہ نصاب بھی ضرور ملاحظہ فرمائیں۔(۲)

---

(۱) مدرسہ تعلیم سے تعمیر تک: ۳۳

(۲) آسان صرف: ۱/ ۴۰

فن نحو

بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے، چنانچہ میرے پاس ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں جو پاؤں دھونا فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن میں تو پیروں کے واسطے مسح کا حکم ہے؟ میں نے کہا کہ قرآن میں کہاں ہے؟ کہنے لگے: شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے، پھر وہ مترجم قرآن ''اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملے اپنے سروں کو اور پیروں کو ٹخنوں تک'' شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاورہ موافق کردیا، ورنہ بعض تراجم میں فعل ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے ''اور دھووٴ اپنے پیروں کو ٹخنوں تک'' اس ترجمے پر کچھ اشکال نہیں ہوسکتا؛ مگر شاہ صاحب کے ترجمے میں ان صاحب کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لئے بھی مسح کا حکم ہے، میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ہے، اب اگر میں ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا، میں نے کہا: افسوس یا تو علماء اتنے ایماندار ہیں کہ اگر وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہہ دیں تو سچے اور یا اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو مضمر (پوشیدہ) کہیں تو جھوٹے اس پر وہ چپ رہے، اس طرح کے بہت سے اشکالات ہیں جن کے جوابات علوم آلیہ پر موقوف ہیں۔

بالجر بھی آیا ہے اور اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں ''اَرْجُلَكُمْ'' کا عطف ''وُجُوْهَكُمْ'' پر ہے اور ''وُجُوْهَكُمْ'' اس صورت میں بظاہر اس کا عطف ''رُؤُوْسَكُمْ'' کے اوپر اور ''وَامْسَحُوْا'' کے تحت میں ہے، علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ اس میں جر جوار ہے، ورنہ حقیقت میں اس کا عطف ''فَاغْسِلُوْا'' پر ہے۔(۱)

(۱)　التبلیغ: ۲۱/۱۹۶ بحوالہ علوم وفنون نصاب تعلیم: ۸۲، مولانا اشرف علی تھانویؒ

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری فرماتے ہیں: جب میں نے اپنے لڑکے احمد سلمہ کو حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب کی مشہور کتاب ''علم النحو'' پڑھانی شروع کی تو پہلی فصل پوری کرتے ہی میں نے محسوس کیا کہ بچہ ان مضامین کو برداشت نہیں کررہا ہے؛ کیوں کہ اردو میں لکھی گئی نحو کی کتابوں میں عام طور پر تدریج ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے جب کہ یہ بات ضروری ہے، میں نے مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری کی ''کتاب النحو'' بھی دیکھی تو وہ اور بھی مشکل نظر آئی؛ اس لئے میں نے اپنے بچہ کی ضرورت سے ''آسان نحو حصہ اول'' مرتب کیا؛ تاکہ بتدریج اس کو فن کی تعلیم دی جائے، اس رسالے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بچے کے ذہن پر یکبارگی بہت زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے اور اس کو فن نحو بہت زیادہ مشکل نظر نہ آئے، چنانچہ ہر باب میں صرف ابتدائی ضروری باتیں اس رسالہ میں لی گئی ہیں، باقی باتیں حصہ دوم کے لئے اٹھا رکھی ہیں ------ یہاں یہ بات بھی عرض ہے کہ بچوں کو علم نحو کی کتاب عربی زبان شروع کرتے ہی فوراً شروع نہیں کرانی چاہئے، عربی کی تعلیم ''القراء'' (ریڈر) شروع کرانی چاہئے مثلاً ''منہاج العربیۃ'' اول ودوم پھر ''قصص النبیین'' اول دوم پڑھانی چاہئے۔

پھر جب بچے کو عربی کی شد بد ہو جائے تو آسان نحو حصہ اول شروع کرانی چاہئے، اس میں کل تینتیس سبق ہیں یہ رسالہ زیادہ سے زیادہ دو ماہ میں پورا ہونا چاہئے، اساتذہ کو چاہئے کہ اسے خوب یاد کرائیں اور بقدر ضرورت ہی سمجھائیں، حواشی اساتذہ کے لئے ہیں، جب یہ حصہ خوب مضبوط ہو جائے تو حصہ دوم شروع کرائیں۔(۱)

یہ دو حصے پڑھا کر بچے کو آسانی کے ساتھ عربی ''علم النحو'' کی کتاب شروع کرائی جاسکتی ہے اور بڑے درجات کے طلبہ جن کا فن نحو کمزور ہے وہ بھی از خود ان رسائل سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

اساتذہ اکرام اور ارباب مدارس یہ آسان نصاب ضرور ملاحظہ فرمائیں۔(۲)

---

(۱) آسان نحو حصہ اول: ۲ رمکتبہ حجاز (۲) آسان نحو حصہ اول: ۳۹

حصہ دوم آسان نحو میں حصہ اول کے مضامین کا اعادہ کر کے مزید ضروری باتیں بیان کی گئی ہیں، اور بہت کچھ عربی کتابوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے، حصہ دوم کے بعد شرح مائۃ عامل یا اس معیار کی کوئی اور کتاب شروع کرائی جا سکتی ہے۔

کتاب پڑھاتے ہوئے تین باتیں ملحوظ رکھی جائیں:

۱) کتاب میں مشقی سوالات ہیں ان کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔

۲) فن نحو میں درک پیدا کرنے کے لئے قواعد کا اجراء ضروری ہے؛ لہٰذا طلبہ سے عربی جملوں کی ترکیب کرائی جائے۔

۳) دورانِ ترکیب خواندہ قواعد بار بار پوچھے جائیں؛ تاکہ قواعد ذہن نشیں ہو جائیں۔

علم نحو

اس وقت دینی مدارس کے نصاب میں بہت سی ایسی کتابیں شامل ہیں، جن سے مضمون کا ذوق طالب علم میں پیدا ہونی ک ے بجائے اس کو لفظی پیچیدگیوں اور عبارت کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا جاتا ہے، اس وقت ہزاروں، یا شاید لاکھوں کی تعداد میں ایسے طلبہ موجود ہوں گے جو صرف ونحو کی باریکیوں اور شذوذ پر متاخر شارحین اور حاشیہ نویسوں کی موشوگافیوں سے تو خوب واقف ہوں گے، لیکن عام صرفی ونحوی اغلاط سے پاک چند فقرے لکھ لینے کی اہلیت سے عاری ہوں گے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحریر سنبٹ اور سوال کا بلی اور سوال باسولی کی عبارتیں رٹ لینے سے کون سا دینی یا دنیوی مقصد حاصل ہو سکتا ہے، اگر طالب علم ایک صفحہ کی صحیح عبارت لکھ لینے کی (اور اب تو پڑھ لینے کی بھی) اہلیت نہ رکھتا ہو۔

نحو کی کتابیں جو داخل نصاب ہیں، ان کتابوں میں کچھ ایسی ہیں جو زبان و بیان اور اسلوب تحریر کے لحاظ سے مشکل ہیں جیسے کافیہ، شرح جامی اور شرح مائۃ عامل وغیرہ، کافیہ تو ایسی مختصر اور مشکل کتاب ہے کہ اس کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کی درجنوں شرحیں لکھی گئی ہیں، شرح جامی تو کافیہ ہی کی شرح ہے، لیکن یہ بغیر حواشی کی مدد کے پورے طور پر سمجھ میں

(۱) آسان نحو: ۲/۲، از مفتی سعید صاحب پالن پوری، محاضرات تعلیم: ۲۷۲

نہیں آسکتی، یہ کتابیں جب طلباء پڑھتے ہیں تو ان کی عبارت فہمی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، اصل قواعد ان کے ذہن میں بہت کم بیٹھ پاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں بعض دوسری کتابیں النحو الواضح، شذور الذہب، تمرین النحو، تمرین الصرف، شرح ابن عقیل، المفصل زیادہ آسان اور قواعد سکھانے کے لئے زیادہ مفید ہیں۔(۱)

نحو میر یا علم النحو

اساتذہ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لئے علم نحو کی ٹھیک ٹھیک فہم اس کا مکمل اجراء اور اس کے قواعد کا صحیح استعمال ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا نحو کی تعلیم پر آنے والے ہر علم وفن کی تحصیل موقوف ہے، اگر یہ بنیاد کمزور رہ جائے تو دورہ حدیث تک کی پوری تعلیم کمزور بے اثر اور بے ثبات ہو جاتی ہے، اس لئے نحو کے استاذ کی ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے مندرجہ ذیل امور کی رعایت ناگزیر اور لازمی ہے:

۱) نحو کی تعلیم میں اصل مقصد کتاب کی عبارت یاد کرانا نہیں؛ بلکہ اس میں بیان کردہ قواعد و مسائل کو طالب علم کو اس طرح ذہن نشیں کرانا ہے کہ متعلقہ موقع پر طالب علم کو وہ قاعدہ یا مسئلہ یاد آجائے۔

۲) زیر درس کتاب میں عموماً ''کسی اصطلاح یا قاعدے کی تشریح کے لئے ایک مثال پر اکتفاء کیا گیا ہے؛ لیکن استاذ کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ ہر اصطلاح اور قاعدے کی تشریح کے لئے طلبہ کے سامنے از خود بہت سی مثالیں بیان کرے اور بہتر یہ ہے کہ یہ مثالیں عام گفتگو کے علاوہ قرآن کریم سے بھی اخذ کی جائیں؛ تاکہ قرآن کریم سے بھی مناسبت پیدا ہوتی جائے، اس غرض کے لئے استاذ کو چاہئے کہ ''مفتاح القرآن'' کو مستقل اپنے مطالعہ میں رکھیں۔

---

(۱) دینی مدارس: مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، ۱۳۱:۴، فضل بک سوپر مارکیٹ، کراچی

۳) خود بھی مثالیں دینے کے بعد طلبہ سے بھی مثالیں بنوانا اور مختلف مثالیں بول کر طلبہ سے ان کے بارے میں سوال کرنا ضروری ہے، یہ کام زبانی بھی ہونا چاہئے اور تحریری بھی۔

۴) اصطلاح یا قاعدے کی محض نظریاتی تفہیم کو ہرگز کافی نہ سمجھا جائے؛ بلکہ اس کے عملی اجراء پر زیادہ زور دیا جائے؛ چنانچہ جب پچھلا سبق طلبہ سے سنا جائے تو اس میں صرف قاعدہ ہی نہ پوچھا جائے؛ بلکہ مختلف مثالوں کے ذریعے سوال کر کے اس بات کا اطمینان کیا جائے کہ طالب علم میں اس قاعدہ کو عملی طور پر جاری کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟

مثلاً قاعدہ یہ ہے کہ غیر منصرف کا اعراب حالت جری میں فتحہ ہوتا ہے، اب صرف اس سوال پر اکتفا نہ کیا جائے کہ غیر منصرف کا اعراب کیا ہوتا ہے؟ بلکہ ایسے جملے اردو میں بول کر عربی میں ان کا ترجمہ کیا جائے، جن میں کوئی غیر منصرف لفظ حالت جری میں آیا ہو، یا ایسے عربی جملے بغیر حرکات کے تختہ سیاہ پر لکھے جائیں جن میں غیر منصرف لفظ حالت جری میں ہو اور ان پر حرکات لگوائی جائیں، یا ایسے غلط جملے طالب علم کو دیئے جائیں جن میں غیر منصرف کا اعراب صحیح نہ ہو اور پھر اس سے کہا جائے کہ وہ اسے صحیح کرے۔

۵) طالب علم جب بھی کوئی غلط جملہ بولے یا غلط پڑھے، اس کو فوراً روک کر جملہ درست کرایا جائے، عام طور سے طلبہ میں مضاف پر الف لام داخل کرنے، موصوف صفت اور مبتدا خبر میں مطابقت نہ کرنے وغیرہ کی غلطیاں شروع سے جڑ پکڑ جاتی ہیں، ان غلطیوں کو کسی بھی قیمت پر گوارا نہ کیا جائے؛ بلکہ طالب علم سے اصلاح کرائی جائے؛ تاکہ شروع ہی سے ان غلطیوں سے احتراز کی عادت پڑ جائے۔

۶) جو قواعد کثیر الاستعمال ہیں ان پر قلیل الاستعمال قواعد کے مقابلے میں زیادہ زور دیا جائے، سبق سننے کے وقت بھی اور امتحانات میں بھی کثیر الاستعمال قواعد کے بارے

میں زیادہ سوالات کئے جائیں؛ بلکہ قلیل الاستعمال قواعد کے بارے میں بتا بھی دیا جائے کہ ان کا استعمال کم ہوتا ہے، مثلاً "لا حول ولا قوّة إلا بالله" کی پانچ ممکنہ وجوہ اعراب میں طالب علم کو بتادیا جائے کہ راجح اور کثیر الاستعمال کونسی ہے؟

۷) اسم متمکن کی جو سولہ اقسام کتاب میں مذکور ہیں ان کو ذہن نشیں اور یاد کرانے اور ان کے عملی اجراء پر بہت زیادہ زور دیا جائے، مختلف الفاظ کے بارے میں طلبہ سے پوچھا جاتا رہے کہ یہ اسم متمکن کی کونسی قسم ہے؟ اور اس کا اعراب کیا ہے؟

۸) طلبہ کو ہر روز یا کم از کم تیسرے دن کوئی نہ کوئی تحریری مشق ضرور دی جائے اور مشقوں کا طریقہ وضع کرنے کے لئے استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ "عربی کا معلم"، "معلم الانشاء" اور "النحو الواضح للابتدائیہ" کو اپنے مطالعہ میں رکھے اور جو بحث پڑھائی گئی ہے اس کے متعلق ان کتابوں میں دی ہوئی مشقوں میں سے طلبہ کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھتے ہوئے مشقیں منتخب کر کے طلبہ کو ان کے تحریری جواب کا پابند بنائے۔

۹) "مائۃ عامل" کی تعلیم میں ہر عامل کے عمل کو ذہن نشیں اور مستحضر کرانے کے لئے مثالوں سے کام لیا جائے اور ان کی بھی زبانی اور تحریری مشقیں کرائی جائیں۔

ہدایۃ النحو

"ہدایۃ النحو" درس نظامی کے طلبہ کے لئے انتہائی ناگزیر ہے، بے حد مفید اور نہایت اہم کتاب ہے اور اسے نحو کی ریڑھ کی ہڈی سمجھنا چاہئے، علم نحو سے جو کچھ مناسبت پیدا ہوتی ہے وہ اسی کتاب میں ہوگی؛ لہٰذا اس کو پڑھاتے وقت مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے:

۱) اس کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ نحو کے بنیادی قواعد اور اس علم کا مرکزی ڈھانچہ آسان اور عام فہم انداز میں طالب علم کے ذہن نشیں ہوجائے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں عربی زبان میں نحو کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

۲) اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ استاذ صرف کتاب کے بیان کردہ مسائل کی تفہیم پر اکتفا کرے اور کتاب کی شروحات مثلاً ''درایۃ النحو'' وغیرہ میں جو غیر متعلق مباحث مذکور ہیں، ان کو درس میں نہ خود چھیڑے اور نہ طلبہ کو چھیڑنے کی اجازت دے، یہ نحو کی بنیاد رکھنے کا وقت ہے اور طالب علم کی پوری توجہ کتاب کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے اجراء پر مرکوز ہونی ضروری ہے، اگر ان کا ذہن خارج مباحث میں الجھا دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے اور کتاب کے مسائل اور ان کے اجراء پر طالب علم کی گرفت کمزور ہوجاتی ہے اور پھر یہ کمی آگے کہیں پوری نہیں ہوتی۔

۳) کتاب کے مسائل کو سمجھایا جائے، یاد کرانے اور ان کو اچھی طرح ذہن نشیں کرانے کے لئے ان تمام ہدایات کو یہاں بھی مدنظر رکھا جائے، جو ''نحو میر'' اور ''علم الصرف'' کی تدریس کے لئے بیان کی گئی ہیں، چنانچہ ہر اصطلاح اور ہر قاعدے کی تشریح میں اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ صرف کتاب کی دی ہوئی مثال پر اکتفاء نہ کیا جائے؛ بلکہ ہر اصطلاح اور ہر قاعدے کی بہت سی مثالیں اپنی طرف سے سوچ کر طلبہ کو بتائی جائیں، پھر ان سے نئی مثالیں بنوائی جائیں اور کوشش کی جائے کہ مثالیں زیادہ سے زیادہ قرآن کریم سے ماخوذ ہوں۔

مثلاً کتاب میں ''ما أضمر عامله علی شريطة التفسير'' کی صرف ایک مثال دی گئی ہے استاذ کو چاہئے کہ وہ قرآن کریم سے اس کی آسان مثالیں تلاش کر کے طالب علم کے سامنے بیان کرے اور ان میں متعلقہ قواعد کا اجراء کرائے۔ مثلاً:

''وَالسماء بنيناها، والأرض فرشناها، إنا كل شيء خلقناه بقدر، والقمر قدرناه منازل، والجان خلقناه من قبل''

۴) اس کتاب میں بھی زبانی اور تحریری تمرینات کا اسی طرح اہتمام کیا جائے جیسے نحو میر اور علم الصرف کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔

۵) ان مشقوں کے لئے ''النحو الواضح'' کے مختلف حصوں کو استاذ بالالتزام مطالعہ میں رکھے اور جو سبق پڑھائے اس کو اس کتاب میں پڑھ کر اس کی تمرینات اور اس میں دی ہوئی مثالوں سے استفادہ کرے۔(۱)

کافیہ

''کافیہ'' علم نحو کی وہ اہم کتاب ہے جس میں نحو کے اعلی درجے کے مسائل، بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں، اس کتاب کا مقصد نحو کے مبادی سے کماحقہ واقفیت کے بعد اس علم کے تفصیلی مسائل کے ذریعہ طالب علم میں فن کے ساتھ مناسبت پیدا کرنا اور اس کے ساتھ شواہد کی مدد سے مسائل نحو کے استنباط کا سلیقہ سکھانا ہے۔

لیکن ہمارے دور میں ان مقاصد کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ اس کتاب کا وہ طریق تدریس ہے جس میں سارا زور غیر متعلق چوں چرا پر صرف کر دیا جاتا ہے اور اس چوں چرا کی کثرت میں کتاب کے اصل مسائل گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور طالب علم کی توجہ ٹھیٹھ نحوی مسائل ومباحث کے بجائے اعتراض وجواب کی طرف لگ جاتی ہے لہٰذا:

۱) ''کافیہ'' سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ استاذ نفس کتاب کی تفہیم پر اکتفا کرے، البتہ اس تفہیم کا معیار ''ہدایۃ النحو'' سے اتنا بلند ہونا چاہئے کہ عبارت کے فوائد وقیود اور ایک ایک لفظ کا پورا پس منظر طالب علم کے سامنے بیان کیا جائے اور مصنف نے مختصر الفاظ میں جو مباحث سموئے ہیں وہ پوری تفصیل کے ساتھ طالب علم کے سامنے آجائیں؛ لیکن اس کے علاوہ ان فضول عقلی موشگافیوں اور لفظی مناقشات سے مکمل پرہیز کیا جائے جن سے براہِ راست نحو کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲) ''کافیہ'' کی سب سے بہتر شرح ''رضی'' شرح جامی اور عصام کو استاذ اپنے مطالعے میں رکھے؛ لیکن طالب علم کے سامنے ان میں سے صرف وہ باتیں منتخب کر کے پیش

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۱۴۔۱۵، مؤلف مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، مکتبہ زم زم

کرے جو کتاب سمجھنے کے لئے ضروری ہو، یا جن کا براہِ راست نحو سے تعلق ہو، ''تحریر سنبٹ'' کو اور اس قسم کی دوسری شروحات جو محض چوں وچرا پر مشتمل ہیں، استاذ چاہے تو اپنی دلچسپی کے لئے مطالعہ میں رکھے؛ لیکن اس قسم کے مباحث نہ طلبہ کے سامنے بیان کرے اور نہ طلبہ کو ایسی شروح دیکھنے کی اجازت دے مثلا ''الکلمة لفظ وضع لمعنی مفرد'' پر جس طرح کئی کئی دن خرچ کئے جاتے ہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں، اس جملے کے مطلب کے علاوہ الف لام کی قسمیں ،مفرد کا مطلب اور مفرد کی مختلف وجوہ اعراب اور ان سے حاصل ہونے والے معانی پر اکتفا کیا جائے؛ لیکن الف لام کی قسموں کو اتنی مثالوں سے سمجھایا جائے کہ ہر قسم کی پوری شناخت طالب علم کے ذہن نشیں ہوجائے اور پھر طالب علم سے بھی ان مختلف قسموں کی مثالیں نکلوائی جائیں۔

۳) اس قسم کے مباحث ترک کرنے سے جو وقت بچے گا، اس کو حقیقی نحوی استعداد پیدا کرنے میں صرف کیا جائے؛ چنانچہ کتاب کے مسائل کی خارجی مثالیں اور قرآن وسنت اور کلام عرب سے وہ شواہد پیش کئے جائیں اور طلبہ سے ایسے فقرے بنوائے جائیں جن میں وہ مسائل جاری ہوں۔

اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ ''کافیہ'' کا استاذ ''النحو الوافی'' کو بالالتزام اپنے مطالعہ میں رکھے، اس کتاب میں ''کافیہ'' کے معیار کے مسائل کو قرآن وسنت اور کلام عرب کے شواہد سے سمجھایا گیا ہے، اسی کتاب میں تمرینات بھی موجود ہیں، ان تمرینات سے مدد لے کر استاذ اپنے طلبہ کے لئے تمرینات خود مرتب کرے، جن کا مقصد ایک طرف یہ ہو کہ کافیہ کے مسائل کا اجراء ہوسکے اور دوسری طرف اس طرح عربیت کا ادبی ذوق بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوتا چلا جائے۔

دراصل بات یہاں بھی وہی ہے کہ کافیہ سے طالب علم کو صحیح فائدہ پہنچنے کا مدار استاذ کے اپنے نحوی اور ادبی ذوق پر ہے جسے ترقی دینے کی استاذ کو کوشش کرنی چاہئے، اور نحوی

اورادب کی معیاری کتابیں اپنے عام مطالعے میں رکھنی چاہئے۔(۱)

نحو سے خاص طور پر دو چیزیں مقصود ہیں:

۱) قواعد نحو کا استحضار اور قواعد کے بعد فورا جملے بنا سکنا اور جملوں کی ترکیب ''بذریعہ تحریر وتقریر'' میں جھجک ودقت کا ختم ہونا۔

۲) نحو مع صرف وادب، حل عبارت کا ملکہ پیدا کرنا اورادبی تاریخی کتابوں کو اپنے ملکے سے زیر کرنا اور مقصود حاصل کرنا۔

❁ نحو کا زیادہ تر مدار مرفوعات ومنصوبات ومجرورات اوراعراب کی نو اور معرب کی سولہ قسموں کو سمجھنے اور توابع اوران کا اعراب سمجھنے اور قدر مبنیات اوران کی قسمیں جاننے اوراسم کی طرح فعل مضارع (جو معرب ہے) کے اعراب اوروجوہِ اعراب کی معرفت حاصل کرنے پر ہے، اسی طرح مہموز فعل مضارع (جو معرب ہے) کے اعراب اوروجوہِ اعراب کی معرفت حاصل کرنے پر ہے، اسی طرح مہموز معتل وغیرہ ہونے سے اعراب کی بدلتی شکلوں کے اورتھوڑا سا معرب ومبنی کے فرق کو سمجھانے اور سمجھنے پر ہے اور یہی چیزیں طلبہ کے لئے پریشان کن ہوتی ہیں، انہیں پر خوب دھیان دیا جائے، ورنہ معرفہ ونکرہ تذکیر وتانیث واحد وتثنیہ وجمع وغیرہ کو طلبہ ٹھیک سمجھ لیتے ہیں، لہٰذا سابق الذکر وغیرہ کو الگ الگ طرز وانداز سے ذہن نشیں کرایا جائے؛ تاکہ طلبہ کو قواعد مستحضر ہوں اور بوقت ضرورت کام دیں اور غلطی سے احتراز کریں جو نحو کی غرض ہے۔

(ان قواعد کی مثالیں استاذ اپنی طرف سے بنا کر پیش کرے اور طلبہ سے اس کے تمرین ومشق کی تحریری مثالیں بنانے کا مطالبہ کرے، نحو کو زندہ کرنے کے لئے اچھا طریقہ ''ابتدائی اردو کتابوں کی پڑھائی میں'' یہ ہے کہ پہلے مثالیں دیں جائیں، بہت سی مثالوں سے قاعدہ مستنبط کروایا جائے، پھر قاعدے یاد کرائے جائیں، آج

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۲۰، ۱۲، ۲۲، مؤلف مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مکتبہ زمزم

برعکس ہے جس کا نقصان دیکھا جارہا ہے، آج طلبہ جس بحث کی عبارت پڑھتے ہیں انہی قواعد کے اغلاط کے شکار ہوتے ہیں، رفع کا بیان پڑھتے ہیں اور رفع نہیں دے سکتے یہ ان کی نحو کا حشر ہے، لہٰذا نحو کی کتابوں مثلاً ہدایۃ النحو و کافیہ میں دقیق بحثوں کو چھیڑنے کے بجائے یا عبارت زبانی کرانے کے بجائے نفس قواعد کے سمجھانے اور مثالوں سے یاد کرانے پر زور صرف کیا جائے)۔

مثلاً اعراب کی نوقسمیں صرف بالترتیب بتائے نہ جائیں جب نوقسموں کو مع امثلہ برابر سمجھ لیں اور یاد ہو جائیں تو اب ان کے اسماء مختصہ کو بالترتیب بتایا جائے، دوسری ترکیب اس کے برعکس کی ہے اس کے علاوہ بھی ترکیبیں ہیں اب کتاب کی عبارت اور ترجمہ پڑھایا جائے۔

اس کے لئے یہ ترکیب بھی مفید ہے کہ کم از کم انہیں اس کا پابند بنایا جائے کہ جو سبق پڑھانا ہے اس کے قواعد و اصطلاحات کو طلبہ دوسری اردو کتابوں سے یاد کر کے لاویں اگر وہ نفس درس کے مطالعے کے عادی نہ ہوں، مثلاً مرفوعات کیا کیا ہیں؟ اسماء افعال کیا کیا ہیں؟ اسباب منع صرف کیا ہیں؟ وغیرہ، بہر حال نحوی ضروری اصطلاحات طلبہ کو یاد بھی ہوں اور ان کے اجراء سے وہ اچھی طرح واقف بھی ہوں۔

❁ طلبہ کو پڑھانے میں پہلے عبارت کی تصحیح کا خوب اہتمام ہو، پھر ہر مسئلہ و قاعدہ کی علاحدہ عبارت ہو، پھر نفسِ قاعدہ آسان انداز میں سمجھایا جائے، پھر استاذ اپنی جانب سے چند مثالیں دے اور طلبہ سے بھی مثالوں کا بروقت مطالبہ ہو اور خارج میں قواعد کو اپنے مفہوم میں لکھ کر مثالیں دیں اور قرآن سے بھی تلاش کریں اور ترجمہ کے وقت مشکل الفاظ کی تصحیح وتشریح ہو اور تشریح میں ”دو قاعدوں میں پائے جانے والے فرق پر تھوڑا الگ سے زور دے کر سمجھانا ہو۔(۱)

(۱) فن تدریس کے اصول: ۱۶۹، ۱۷۰

عربی ادب کی ضرورت

بہت سے اشکالات قرآن میں پیدا ہوجاتے ہیں جن کا جواب ذوق لسان ہی سے ہوسکتا ہے، ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے: مجھے کچھ کہنا ہے؛ مگر اس آیت کا ترجمہ کردو ''ووجدک ضالا فھدی'' میں سمجھ گیا اور ترجمہ اس طرح کیا کہ ''پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا'' یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے، میں نے کہا: اب پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ کہنے لگے: تو وہ اشکال نہ رہا، میں نے کہا: کیا آپ کا خیال تھا کہ میں اس جگہ ''ضالا'' کا ترجمہ گمراہ سے کروں گا؟ اور وہ ترجمہ بھی غلط نہیں ہے مگر غلط فہمی زبان نہ جاننے سے ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ اردو میں تو گمراہ کا مفہوم یہی ہے کہ حق واضح ہوجانے کے باوجود اس کو قبول نہ کرے اور عربی میں ''ضالا'' اور فارسی میں ''گمراہی'' کا اطلاق عام ہے، اس معنی کو بھی اور عدم وضوح کو بھی پس ضال کے معنی گمراہ کے بھی ہیں اور بے خبری اور ناواقفی کے بھی ہیں۔(۱)

علمِ ادب کا مقصد

علامہ ابن خلدون علم وادب کے مقصود اور غرض وغایت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"وإنما المقصود منه ثمرته وهی الإجادة فی نفی المنظوم والمنثور علی أسالیب العرب ومناهجهم"

درحقیقت علم ادب سے مقصود اس کا ثمرہ ہے عرب کے طرز وانداز اسلوب کے مطابق

(۱) التبلیغ: ظ۲۱/ ۱۹۲، بحوالہ علوم وفنون نصاب تعلیم: ۸۰، اشرف علی تھانویؒ

فن نظم ونثر میں مہارت کا نام ہے۔

علوم ادبیہ

صاحب ''منتہی الأرب'' نے بارہ علوم علم ادب میں شامل کئے ہیں: جن میں آٹھ علوم یہ ہیں (۱) علم لغت (۲) علم صرف (۳) علم اشتقاق (۴) علم نحو (۵) علم معانی (۶) علم بیان (۷) علم عروض (۸) علم قافیہ (۹) علم رسم الخط (۱۰) علم قرض الشعر (۱۱) علم انشاء (۱۲) علم محاضرات (تاریخ) ہیں)۔(۱)

عربی کا معلم اور طریقہ جدیدہ: ۱۲ سے نیچے والا حصہ (۱۱۲) مکمل عنوان: درجہ ثانیہ کے تحت مذکور مراجعت کرلیں

❁ فن ادب سے مع ضروری نحوی صرفی قواعد چند چیزیں مطلوب ہیں:

(۱) ادب کے عربی اسلامی بڑے ذخیرے سے شناسا ہونا اور اس کی لجاجت ورعنائیوں سے لوگوں کی زندگیوں پر مثبت اثر ڈالنا اور غیر شرعی کردار کا قلع قمع کرنا۔

(۲) کلام الٰہی کے خطاب اور اس کی باریک حکمتوں سے لطف اندوز ہونا اور اپنے کو اس کے تابع کرنا اور احادیث نبویہ کے طویل وعریض بحر وسمندر سے محظوظ ہونا اور لوگوں کو دین اسلام سے مربوط کرنا اور قریب کرنا۔

(۳) عربی خطابت وکتابت پر قدرت۔

❁ عربی ادب کی کتابوں میں شروع سال میں چند دن کتاب کے ۳۰ یا ۴۰ صفحات صرف طلبہ کو عبارت ٹھیک کرنے کے لئے دیدئے جائیں، بیچ بیچ میں مدرس روزانہ دو دو صفحات پڑھوا کر جائزہ لے اور خود بھی تھوڑی عبارت پڑھ کر رہنمائی کرے؛ جس میں کلام کے مبدا ومنتہا پر خصوصی توجہ دلائے؛ کیوں کہ طلبہ ابھی معانی سے

(۱) درس مقامات حریری: ۱۷، مؤلف ابن الحسن عباسی

نا آشنا ہیں انہیں مبدا ومنتہا کا مطلقا علم نہیں "مثلهم كعابری سبیل" لیکن جب اس کی عادت ڈالی جائے گی تو بغیر معانی سمجھے وہ کلام کی ابتداء اور اسکے انتہا کی جگہوں سے مطلع ہو جائیں گے اور پڑھنے میں اس کا طرز ولہجہ بھی قابل اصلاح سمجھا جائے حتی کہ وہ اہل عرب کے لہجے اور خطیب جمعہ کے انداز میں پڑھیں چنانچہ جس میں سوالیہ کلام ہے تو سوالیہ انداز اختیار کریں رفتار میں نہ تیز روی ہو نہ سست روی، متوسط الاذہان طلبہ کو مدنظر رکھ کر متوسط روانی کے ساتھ پڑھائیں، ورنہ بعض ایک کلمہ کو دو دو مرتبہ پڑھ کر، اٹک اٹک کر پڑھ کر سال پورا کر دیں گے۔

یہ انتہائی افسوس کی بات ہے؛ لیکن ہے حقیقت کہ آج کل کچھ جگہ کے طلبہ سوم وچہارم تک ایسے آتے ہیں کہ ان کے ناظرہ کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؛ جس کی وجہ ان کے مکاتب کی کمزوری ہے، جو بڑی حرمانِ نصیبی کی بات ہے۔ لہٰذا مدرس خماسی سداسی کلمات اور متعبر الاداء جملوں اور مفردات کو مکرر پڑھ کر انہیں اس کا طریقہ تلقین کرے؛ کہ کس طرح انہیں ٹھیک کیا جاتا ہے۔ مثلاً مؤرخین کے نام "سِبَانِتُسُوس"، "هيرُوُتَس" اور "فُسيِفَسَّاء" سنگ مرمر وغیرہ۔ تاکہ طلبہ مانوس ہو کر تعلیم پر آمادہ ہو جائیں گے۔

❁ اب درس شروع کرنا ہے تو یہ بات یاد رکھیں کہ ایک ہی دن میں عبارت، ترجمہ اور لغات کے معانی وغیرہ نہیں بتانے ہیں؛ بلکہ ہر سبق پر تین دن گذارنے ہیں (والمُزاولةُ تُورثُ خلفها قوّة التدريس) جس تکرار سے طلبہ کو وہ درس یاد ہو جائے گا جس کی ترکیب وترتیب یہ ہے:

❁ ایک دن عبارت ہو جس میں شامل جدید غیر مانوس عربی مفردات کے اردو معانی ''لغوی واصطلاحی'' ان کا مادہ (مثلاً انتقام کا نقم) ضروری ابواب (جیسے استیعاب استفعال سے مادہ عوب) خاصیت ابواب (خرج لازم''، نکلا'' اخراج افعال متعدی''نکالنا'') ''لازم ومتعدی وغیرہ'' اور دو یا تین صلات (شغل عن اعراض کرنا؛ لیکن شغل فی رغبت رکھنا) جن کے بدلنے سے معانی بدل جایا

کرتے ہیں اوراس جگہ کا جومخصوص صلہ سے مخصوص معنی ہے اسے زور دے کر کاپیوں میں لکھوانے اور سمجھانے ہیں؛ تاکہ طلبہ ہمیشہ کے لئے اس لفظ اس صلہ سے مخصوص معنی کے استعمال سے مانوس ہوجائیں، ساتھ ہی ساتھ پورے درس میں دوتین مقام پرضروری (جیسے السِّوِسْرِیُّون اور " السِّوِسْرِیِّیْنَ حالت رفعی میں وجری وغیرہ) نحوی قاعدہ اورصرفی قاعدہ کی تشریح، مترادف (جیسے قدم وجاء رجع وأفاض اور ترک رفض، ہجر وغیرہ) الفاظ پرخصوصی توجہ، طلبہ کوان سے خوب روشناس کرائیں؛ کیوں کہ اہل عرب اس کے بہت عادی ہیں اور اگر کلمہ اسم ہے تو اس کے جمع وواحد اور ثلاثی مجرد کے مصادر (جیسے ذکر سے "ذُکراً، ذُکرا ذکری وتذکارا" جو غیر قیاسی ہیں؛ کیوں کہ اہل عرب علاحدہ علاحدہ مصادر کے استعمال کے عادی ہیں اس پر بھی توجہ دیں اور اخیر میں اچھی تعبیرات اورضرب الامثال کی جامعیت کی سیر کرائی جائے یہ بہت اہم ہے؛ یہ تو پہلے دن کا کام ہوا۔

- دوسرے دن اولا ذہین طالب علم سے غلطیوں کی اصلاح کرتے ہوئے ترجمہ کرائیں، پھراستاذ ایک مرتبہ مکمل ترجمہ اس طرح کرے پہلے چھوٹے چھوٹے جملے حل ہوجائیں، پھر پوری دوسطر کا محاوری ترجمہ، جب ایک پیراگراف کا ترجمہ ہوجائے، تو دوسرے ذہین طالب علم سے ترجمہ کرائے (اس سے طلبہ میں خودترجمہ کرنے کا سلیقہ پیدا ہوگا جس سے دوسرے طلبہ کو "انس کی وجہ سے" سبق یادکرنا آسان ہوگا)۔
- اورتیسرے دن کچھ طلبہ کا سبق سننا۔

اب یومیہ تین کام ہوگئے نئے سبق کی عبارت ومعانی وغیرہ لکھوانا (شروع میں کاپیاں کیسے بنائی جائیں اور لکھنے کا کیا طریقہ ہو وہ بھی ذرا سمجھا دیا جائے)، گذشتہ کا ترجمہ کرانا اور کرنا اور سننا، اس طرح ایک سبق کا تعلق ۳ دن تک رہے گا تو طلبہ میں اچھے نتائج

مرتب ہوں گے۔

❁ اور استاذ ابتداء میں گاہ گاہ کچھ عربی میں بھی کلام کرے، چھوٹے چھوٹے سوالات وجوابات سے سلسلہ شروع کر کے ترقی پر پہنچائے؛ تاکہ طلبہ سے عربی کی جھجک ختم ہو، فن ادب سے طالب علم عربی پر ڈھل جائے اور برجستہ کلام کرلے یہ بھی ہماری ایک غایت ہے، طالب علم جب ابتداء میں عربی بولنا شروع کرے تو نحوی وصرفی قاعدوں کی غلطیوں پر اس طرح نہ ٹوکے کہ اس کی ترقی موقوف ہوجائے؛ کیوں کہ کلام پہلے آیا قاعدہ بعد میں "ليس الكلام الصحيح مؤسسا على قواعد اللغة بل القواعد هي التي أسست على الكلام؛ لأن الكلام هو السابق في الوجود" ہدایۃ المدارس: ۲۲۶ (فخذوا ما آتاكم أهل اللسان) اور دوران درس اردو کے مشکل الفاظ استعمال نہ کرے، پھر رفتہ رفتہ مترادف الفاظ استعمال کرتے ہوئے مشکل اردو بھی استعمال کرے؛ تاکہ اردو ادب بھی زباں زد ہوجائے۔

❁ ادبی کتابوں کے شروع میں یہ بھی بتایا جائے کہ:

قال يقول کا ترجمہ صرف کہنا ہی نہیں؛ بلکہ اس کے دوسرے بھی معانی ہیں مثلا پوچھنا، حکم دینا، اظہار کرنا، اشارہ کرنا، آواز دینا اور قال لہٗ 'لام صلہ ہوتو' مخاطب ہونا خطاب کرنا وغیرہ جس طرح سئل کا معنی درخواست کرنا وعاجزی کرنا ہوتا ہے۔(۱)

شعبہ تمرین عربی

عربی طلبہ کے لئے اس شعبہ کے ذریعہ عربی میں گفتگو، خطوط نویسی، مضمون نگاری کا باقاعدہ اور مستقل انتظام ہے، عربی کے درجہ اول سے ہی تمرین کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔(۲)

---

(۱) فن تدریس کے اصول: ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵

(۲) تعلیم وتربیت کس طرح: ۱۵۲، مؤلف مہربان علی بڑوتوی

ہمارا نصاب اور عربی زبان دانی

عربی ادب کی تدریس کی صورت حال بھی دیگر علوم کی تدریس سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔

اول تو عربی ادب کی تدریسی کتب بہت قدیم شعرا کا کلام اور قدیم عربی ادب کی جھلک موجود ہے۔ جس سے طلبہ عربی زبان وادب کے قدیم مسائل سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر پاتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی زبان وادب کی تدریس کے لیے نصاب میں کتابوں کی بڑی تعداد نے نصاب کو بہت بھاری بنادیا ہے۔ نصاب کی تکمیل کے دباؤ میں عربی زبان وادب میں طلبہ وہ مہارت پیدا نہیں کر پاتے جو استعداد اس طویل دورانئے کی تعلیم میں پیدا ہوجانی چاہیے۔ مزید برآں، کتابیں اور طریقہ تدریس قدیم اور غیر دلچسپ ہونے کی وجہ سے زبان وادب پر عبور اور وہ ذہنی اور فکری صلاحیتیں پیدا نہیں ہو پاتیں جو عربی زبان وادب کی تدریس کا اصل مقصد ہے۔ (۱)

❁ کمزور عربی کا نتیجہ: عربی زبان وادب کی بنیاد کمزور ہونے کا منفی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ طلبہ، اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وحدیث سے براہ راست استفادہ نہیں کر پاتے۔ جس سے ان صلاحیتوں والے علماء کی روز بروز کمی ہوتی جارہی ہے، جو قرآن وحدیث کی روشنی میں امت کے مسائل کا حل تلاش کرسکیں، عصر حاضر میں ملت اسلامیہ جن نئے نئے مسائل سے دوچار ہورہی ہے، انھیں حل کرنے کے لئے مؤثر رہنمائی دے سکیں۔ دینی مدارس سے قوم کے دین دار طبقے کو امید تو یہی تھی کہ ملت کو مجتہد اور رہنما ملیں گے، لیکن ان مدارس پر چندے اور صدقات کے کروڑوں روپے خرچ ہونے کے باوجود ملت کے اہم ترین مسائل میں رہنمائی مل رہی ہے، بلکہ گہری دینی بصیرت اور دردمندی رکھنے والے علماء کی روز کمی بڑھتی جارہی ہے۔ (۲)

(۱) ہندستان کی دینی درسگاہیں، ص ۷۴-۵۵۔

(۲) دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل، امکانات: ۲۷۵، سلیم منصور خالد

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ صاحب فرماتے ہیں:

دینی مدارس کو جو عربی زبان سے خصوصی تعلق ہے وہ محتاج بیان نہیں، عربی زبان تمام دینی علوم کے لئے بنیادی زینے کی حیثیت رکھتی ہے؛ لیکن ہمارے مدارس میں عربیت کا ذوق اور عربی تحریر وتقریر کا ملکہ افسوناک حد تک نایاب ہے، اچھی استعداد رکھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ عربی کتابیں سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا کر لیتے ہیں؛ لیکن عربی تحریر وتقریر کی مشق سے ۔ الا ماشاء اللہ ۔ بالکل عاری ہوتے ہیں، اکثر متوسط درجے کے طلباء کی بھی عبارت خوانی درست نہیں ہوتی، اور عربی مضمون نگاری، تصنیف وتالیف یا تقریر وخطابت تو اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کے لئے بھی کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس میں عربی پڑھانے کا اصل مقصد کتاب وسنت اور ان کے علوم کے اصل مآخذ تک رسائی ہے، جس کے لئے تحریر وتقریر کا ملکہ ناگزیر ہے؛ لیکن اول تو اب مشاہدہ یہ ہے کہ تحریر وتقریر کی مشق کے فقدان کا اثر عبارت خوانی اور عبارت فہمی پر بھی پڑ رہا ہے، دوسرے عربی تحریر وتقریر کی مشق اگر مقصود نہ ہو تو کم از کم اس کے محمود ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور صرف ونحو اور بلاغت وادب کی اعلی کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی اگر یہ وصف محمود حاصل نہ ہو تو یہ کوتاہی کچھ کم نہیں، تیسرے عالم اسلام کے باہم مربوط ہونے کے کے ساتھ ساتھ اب اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے مدارس سے عربی تحریر وتقریر کی اعلی صلاحیت رکھنے والے افراد پیدا ہوں جو عالم عرب سے روابط رکھ سکیں، عرب ممالک میں دینی مدارس، ان کی دعوت اور ان کے پیغام کی صحیح نمائندگی کر سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان، پاکستان کے علماء نے جو عظیم الشان علمی اور دینی ذخیرہ اردو یا فارسی زبان میں چھوڑا ہے، اس سے عالم عرب کو روشناس کرا سکیں اور یہ مقصود عربی تحریر وتقریر کے اعلی ملکہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں عربی صرف ونحو، ادب اور بلاغت کی تدریس پر ایک معتد بہ وقت صرف ہوتا ہے؛ لیکن یہ سارے علوم خالص نظریاتی انداز سے پڑھائے

جاتے ہیں اوران کی عملی تربیت اور مشق کا کوئی اہتمام باقی نہیں رہا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک طالب علم نحو وصرف کے قواعد ان کے خود ساختہ فلسفے اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات وجوابات کی بحثیں تو شرح جامی، عبد الغفور اور عصام وغیرہ کی مدد سے یاد کرلیتا ہے لیکن اس سے کہا جائے کہ وہ چند سطریں عربی زبان میں لکھ دے تو یہ بات نہ صرف یہ کہ اس کے لئے سخت دشوار ہوتی ہے؛ بلکہ بسا اوقات انہی قواعد کے اطلاق میں غلطیاں کرتا ہے جن کا پورا فلسفہ اسے ازبر ہے اور اگر کوئی شخص نحو وصرف کی غلطیوں سے محفوظ رہ جائے تو اسلوب اور انشاء کی غلطیاں تو اس کی تحریر میں لازما ہوتی ہی ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں عربیت کی تصحیح وتحسین کی طرف پوری توجہ دی جائے اور مدرسے کی پوری فضا ایسی بنائی جائے جس میں عربیت رچی بسی ہوئی ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

(الف) ابتدائی درجات کے نصاب میں صرف ونحو کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ اس کی بہت سی مثالیں دے کر قاعدے کو ذہن نشیں کرایا گیا ہو اور پھر تمرینات کے ذریعہ طلباء کو ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو، عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوئیں مثلا: نحو وصرف کے ابتدائی درجات میں ''النحو الواضح'' اور اعلیٰ درجات کے لئے ''النحو الوافی'' وغیرہ، ان کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(ب) ادب کی تعلیم میں انشاء کے لئے مستقل وقت رکھ کر اس کی باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے، اس غرض کے لئے بھی اس وقت بہت سی کتابیں دستیاب ہیں، مثلا: ''الأسلوب الصحیح للإنشاء''، ''معلم الانشاء'' وغیرہ ان سے اس سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے، اسی طرح ''بلاغت'' کی تعلیم کے لئے ہمارے نصاب میں مختصر المعانی بالکل ناکافی ہے اور اس سے ''بلاغت'' کا اصل مقصد بالکل حاصل نہیں

ہوتا؛ لہٰذا اس کے بجائے یا اس کے ساتھ ''دروس البلاغۃ''، ''البلاغۃ الواضحہ'' اس طرح پڑھانے کی ضرورت ہے کہ اس سے بلاغت کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔

(ج) لیکن عربیت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ اہمیت جس بات کو حاصل ہے وہ مدرسے کی مجموعی فضاء میں عربیت کا چلن ہے، اس غرض کے لئے ہماری رائے میں تو درجہ رابعہ سے اوپر کے تمام اسباق عربی زبان میں ہونے چاہئے، لیکن اگر یکا یک یہ تبدیلی مشکل ہو تو کم از کم مدرسے کے تمام اعلانات دفتری اندراجات تمام دفتری کاروائی امتحانات کے پرچے اور انکے نتائج وغیرہ فوری طور پر عربی میں منتقل کرنے چاہئے، اور رفتہ رفتہ مدارس کے ماحول کو اس سطح پر لانا چاہئے کہ ان میں ذریعہ تعلیم مکمل طور پر عربی بن جائے۔

(د) اساتذہ اور طلبہ کے درمیان باہمی گفتگو میں عربی بول چال کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، اگر اساتذہ اور منتظمین اس بات کا اہتمام کریں کہ وہ آپس میں نیز طلباء سے صرف عربی میں گفتگو کریں گے تو بہت جلد عربیت کا ایک خوشگوار ماحول پیدا ہوسکتا ہے، عادت نہ ہونے کی بناء پر شروع میں شاید دشواری پیش آئے، لیکن اگر اس دشواری پر اہتمام کے ساتھ قابو پالیا گیا تو انشاء اللہ بہترین نتائج حاصل ہوں گے۔

(ہ) مہینے دو مہینے میں طلباء کے ایسے اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں جن میں طلبہ عربی میں تقریریں کریں اور مقالے پڑھیں۔(۱)

تمرین النحو کے مقدمہ میں علامہ ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے قدیم نظام تعلیم میں عربی صرف ونحو کی تعلیم سے پہلے فارسی قواعد واصول وزبان دانی کا جو طویل نصاب لازمی تھا، اس کی وجہ سے بچہ کی عمر اور ذہن دونوں اس مرحلہ پر پہنچ کر عربی صرف ونحو کی کتابوں کے سمجھنے اور مسائل کو اخذ کرنے کی استعداد وصلاحیت پیدا ہوجاتی مگر اب صورتحال مختلف ہے، زمانہ کی تیز رفتاری

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۹۶۔۹۷

اور طبیعت کی عجلت پسندی کسی ایسے طویل نصاب کی متحمل نہیں جو دنیوی ضروریات کے لئے زیادہ مفید اور دین کے لئے ضروری نہ ہو، اس لئے فارسی میں وقت صرف کئے بغیر براہ راست عربی کے حصول اور کم سے کم عمر میں اس کی تحصیل کا عام رجحان پایا جاتا ہے، جس رائج الوقت غیر دینی نظام تعلیم سے دینی تعلیم کا مقابلہ ہے، وہ کم سے کم وقت میں زبان کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی عملی مشق کراتا ہے، اس کے مقابلے کے لئے بھی ایسا نصاب کارگر نہیں جو زبان سے علاحدہ ہو کر قواعد کی نظری تعلیم پر اکتفا کرتا ہے اور عملی ضرورتوں میں اس کے قواعد و مسائل زیادہ کام نہیں آتے۔۔۔۔۔ مصر کو عربی زبان وادب کی ترقی واشاعت، اصول وقواعد کی از سر نو تدوین وطرز تعلیم کی اصلاح وتجدید کے سلسلہ میں جو امتیاز حاصل ہے، اس کا انکار کرنا زیادتی ہے، اسی سلسلہ کا ایک قدم یہ ہے کہ انہوں نے کم عمر طلباء کے لئے نحو وصرف کے قواعد، ومسائل کی تعلیم کے لئے نئی راہیں اختیار کی ہیں، اور اس کو زیادہ سے زیادہ فطری، سہل، دلچسپ اور عملی بنانے کی کوشش کی ہے، النحو الواضح ابتدائی تین حصے اور ''النحو الواضح'' عالی کے تین حصے اس کی شہادت ہیں''۔(۱)

اور علامہ ندویؒ مقدمہ ''معلم الانشاء'' میں عربی کے حصول اور اس کے تئیں ہماری کمی وکوتاہی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عربی زبان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک تو وہ قرآن وحدیث کی زبان ہے اور اس میں ہمارے دینی اصطلاحات والفاظ ہیں، اس سے واقفیت کے بغیر ہمیں اسلام کے نظام واحکام سے براہ راست واقفیت اور اس کے عظیم الشان علمی ذخیرہ سے جو اپنی تاریخ مساحت میں چودہ سو سال کی طویل مدت اور اپنے جغرافیائی وسعت میں عالم اسلام کے وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے، صحیح تعلق نہیں پیدا ہو سکتا اور ہم اس سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔

یہ حیثیت عربی زبان کی اولین اور اہم ترین حیثیت ہے اور ہماری وابستگی اور دلچسپی

(۱) تمرین، مقدمۃ ابوالحسن علی الندوی: ۴، مجلس نشریات اسلام، کراچی

کی اصل وجہ ہے، اس حیثیت سے ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس کو بے تکلف اور صحیح طور پر سمجھتے اور پڑھ سکتے ہوں، اور جن علوم و مقدمات پر اس مقصد کا حصول موقوف ہے ان سے ہم واقف ہوں۔

دوسری حیثیت یہ ہے جو اگرچہ ثانوی ہے؛ مگر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ یہ عربی زبان عہد رسالت اور ابتدائے اسلام میں بھی ایک زندہ زبان تھی، اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایک زندہ زبان رہی ہے اور اس زمانے میں بھی ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے جو تمام لسانی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اظہار خیال کا ذریعہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، اور جو قرآن کی بدولت اپنی اصلی شکلوں میں محفوظ ہے، اس حیثیت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ہمارا اس سے تعلق بھی ایک زندہ اور عملی تعلق ہو، ہم اس کو ایک وسیع انسانی زبان کی طرح جانتے ہوں، اس میں بے تکلف اظہار خیال کر سکتے ہوں، اس کو تقریر و تحریر میں استعمال کر سکتے ہوں، وہ ہماری تصنیفات، خط و کتابت اور مجالس کی زبان بن سکتی ہو، یہ ایک بڑی تعجب خیز اور نا قابل فہم بات ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اور اپنی ذہنی صلاحیتیں ان علوم و تصنیفات کے درس و مطالعہ میں صرف کرے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، لیکن اس زبان میں اظہارِ خیال سے بالکل معذور و قاصر ہو، زبانوں کے سلسلے کا یہ ایک بالکل انوکھا تجربہ ہے کہ جو صرف ہندوستان کے عربی مدارس اور علمی مجالس کی خصوصیت ہے۔

اس معذوری کی اہم وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو جس کی بدولت ہم اسلام سے علمی تعلق پیدا کرتے ہیں، کبھی زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی، اس کو بھی ایک نظری علم اور ایک کتابی فن کی حیثیت سے دیکھا گیا، اور صرف کتابوں کے سمجھنے کا ذریعہ سمجھا گیا، اس ذہنیت اور نقطہ نظر کا نتیجہ ہے کہ کبھی اس کی عملی مشق تحریر و انشاء کی طرف توجہ نہیں دی گئی، اور اس کا انجام یہ ہے کہ ہمارے بہت سے فضلاء مدارس اپنی دوسری صلاحیتوں کے ساتھ عربی زبان میں چند سطریں لکھ لینے یا چند منٹ گفتگو کر لینے پر قادر نہیں، خصوصا جب کہ یہ تحریر یا گفتگو عام زندگی یا روزمرہ کی ضرورت سے متعلق ہو اور خالص دینی یا

علمی بحث میں محدود نہ ہو، یہ کمی اہل نظر کو پہلے بھی محسوس ہوئی تھی، لیکن اب جب کہ عربی ممالک کے فضلاء سے اختلاط واجتماع کے زیادہ مواقع پیدا ہو گئے، اور دینی خدمت کا میدان زیادہ وسیع ہو گیا، یہ کمی زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی۔

اس کتاب میں انشاء وترجمہ کی تمرینات سے پہلے صرف ونحو کے ضروری قواعد بیان کئے گئے ہیں جن پر انشاء وترجمہ کی بنیاد ہے، پھر مختلف قسم کی مشقیں دی گئی ہیں، جن سے ایک طرف یہ قواعد ذہن نشیں اور راسخ ہو جاتے ہیں، دوسری طرف طلبہ کو صحیح جملے اور عربی عبارت لکھنے کی مشق ہوتی ہے، دراصل قواعد کی تعلیم کا بھی یہی فطری طریقہ ہے کہ ان کو مجرد قواعد ومسائل کی صورت میں صرف طلبہ کو سمجھا اور رٹا نہ دیا جائے؛ بلکہ جملوں اور عملی مثالوں کے ساتھ ان کو ذہن نشیں کیا جائے اور طلبہ سے عملی طور پر ان کا اجراء کرایا جائے،قواعد زبان سے الگ کر کے نظری طور پر سکھانا صرف متاخرین اہل عجم کی خصوصیت ہے، اس سے اہل زبان نا آشنا ہیں۔(۱)

مفتی شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی فرماتے ہیں:

ان میں ایک سے ایک بات یہ ہیکہ عربی صرف ونحواور ادب کی تعلیم کا مقصد چونکہ اصل مقصد عربی زبان پر عبور ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ایسی کتب کو اس میں جگہ دی جائے، جو اس مقصد میں زیادہ سے زیادہ معین ومفید ہیں، تا کہ طلباء میں عربی کی صحیح اور مضبوط استعداد پیدا ہو، عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ''درس نظامی'' کے اکثر فارغین عربی پر عبور نہیں رکھتے، یا کم از کم یہ بات ہے کہ وہ بے تکلفانہ طور پر عربی کی بول چال پر عبور نہیں رکھتے، ہوسکتا ہے کہ پہلے زمانے میں اس کی اس قدر ضرورت نہ رہی ہو اور جیسا کہ بعض حضرات نے کہا کہ ''درس نظامی'' کا اصل مقصد قرآن وحدیث کی فہم پیدا کرنے کے لئے فنی نہج پر پڑھا دینا ہو؛ مگر آج وقت اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک عالم عربی زبان میں نہ صرف فنی طور پر مہارت حاصل کرے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تقریر وتحریر کا بھی پورا سلیقہ پیدا کرے۔

---

(۱) مقدمہ معلم الانشاء، مولانا ابوالحسن علی الندویؒ، مجلس نشریات اسلام، کراچی

عربی مہارت نہ ہونے کی پہلی وجہ

اور مذکورہ خامی کا یک ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عربی زبان پڑھانے کے لئے جن کتابوں کو داخل نصاب رکھا گیا ہے ان میں سے بنیادی کتابیں : جیسے : ''میزان'' ''منشعب''، ''نحومیر'' و''صرف میر'' وغیرہ فارسی زبان میں ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ فارسی اورعربی دونوں زبانیں ہماری مادری زبانیں نہیں ہیں ہم بچے کوایک غیر مادری و بیگانہ زبان اور دوسری غیر مادری و بیگانہ زبان کے ذریعے سکھانا چاہتے ہیں،تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی ہندوستانی کوانگریزی زبان کی تعلیم فرانسیسی کے ذریعے دی جائے، اس صورت میں طالب پر وہ بے گانہ زبانیں سیکھنے کا بار پڑتا ہے،جس کا نتیجہ وہی رونما ہوتا ہے اور ہونا چاہئے کہ اصل مقصد سے طالب علم رہ جاتا ہے؛ لہٰذا عربی سکھانے کے لئے مادری زبان کو واسطہ وسیلہ بنانا چاہئے ، الحمد للہ اس سلسلے میں بعض عمدہ اور اچھی کتابیں منصۂ شہود پر رونما ہوچکی ہیں،جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر علماء نے اس کو کیوں داخل نصاب کیا؟ کیا ان کی نظر اس کی طرف نہیں گئی؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتابیں نصاب میں داخل کی گئیں، وہ دور اس کے بعد بھی ایک زمانے تک فارسی یہاں کی مادری زبان تھی، اس لئے اس وقت یہی مناسب تھا؛لیکن جب یہ ہماری مادری زبان نہیں رہی،تو اس کونصاب میں باقی رکھنا مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگا۔

عربی پر مہارت نہ ہونے کی دوسری وجہ

اور دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان بنیادی کتابوں کی تعلیم میں وہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جو تخصص کے شعبے یا تحقیقی ادارے کے شایان شان ہے، جیسے'' کافیہ''اور''شرح جامی'' کے سبق میں ان کتابوں کے سارے اسراری رمزو مباحث ، ان کے مالہ و ما علیہ کے ساتھ اس طرح بیان کئے جاتے ہیں، کہ وہ درس نحو کے بجائے درس فلسفہ کہے جانے کا مستحق نظر آتا ہے، اوران میں لفظی موشگافیوں ،عبارتی تعقیدات ہی کو سب کچھ اور نقطہ عروج خیال

جاتا ہے، یہ طرز تعلیم مفید ہونے کے بجائے طالب علم کی استعداد میں فتور کا سبب بن جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ مباحث اس کی استعداد وضرورت دونوں سے آگے کی چیز ہے۔(۱)

عربی کا معلم اور طریقہ جدیدہ

(۱) ''عربی کا معلم'' پڑھانے کا مقصد بیک وقت نحو وصرف کا اجراء طالب علم کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا اور عربی تحریر کی بتدریج صلاحیت پیدا کرنا ہے، لہٰذا اس کی تعلیم میں ان تینوں امور کو مدنظر رکھا جائے۔

(۲) ''عربی کا معلم'' کی تمرینات میں ''عربی سے اردو'' والا حصہ زبانی کرانے پر اکتفا کیا جاسکتا ہم،لیکن ''اردو سے عربی'' والا حصہ لازماً تحریری ہونا ضروری ہے، طلبہ ان مشقوں کے لکھ،ے کا پابند بنایا جائے۔

(۳) ''طریقہ جدیدہ'' اور ''الطریقۃ العصریۃ'' کا اصل مقصد ''بطریق مباشر'' عربی سکھانا ہے؛ لہٰذا اسے حتی الامکان عربی ہی میں پڑھایا جائے۔

(۴) تمام الفاظ طلبہ سے کہلائے جائیں اور ان میں تلفظ کی صحت کا اہتمام کیا جائے ،تلفظ کا لہجے میں بھی الرکوئی غلطی ہو تو طالب علم کو ٹوک کر اس کی اصلاح کرائی جائے۔

(۵) تمام تمرینات پہلے زبانی کرائی جائیں ، پھر تحریر ''طریقہ جدیدہ'' کی تمرینات کا مقصد یہ ہے کہ عربی الفاظ کے تلفظ کے ساتھ طالب علم کی زبان پر چڑھیں، اور رفتہ رفتہ اس کے عربی بولنے میں روانی پیدا ہوجائے ،بعض اوقات اساتذہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان تمرینات میں سوال ہی کے الفاظ کو طالب علم سے دہران کی مشق کرائی گئی ہے،جس سے طالب علم کے ذہن پر کوئی خاص زدنہیں پڑتا، اس لئے وہ تمرینات کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں،لیکن یہ طرز عمل درست نہیں، ان تمرینات سے طالب علم کو رعربی جملے بولنے کی رفتہ رفتہ عادت پڑجاتی ہے، لہٰذا وہ بہت ضروری ہے۔

---

(۱) اسلامی مدارس نظام ونصاب: ۱۳=۱۴، مفتی شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم ،مکتبہ مسیح الامت، بنگلور

(٦) چونکہ ’’طریقہ جدیدہ‘‘ اور ’’الطریقہ العصریہ‘‘ کا اصل مقصود طالب علم کو عربی بولنے کا عادی بنانا ہے، اس لئے ان کتابوں کے درس میں حتی الامکان عربی بولنے کا التزاز ضروری ہے، اگر طالب علم شروع میں پورے جملے نہ سمجھ پائے تب بھی کچھ حرج نہیں، اس کی وجہ سے عربی میں گفتگو ترک نہ کی جائے انشاءاللہ رفتہ رفتہ عربی الفاظ کے عادی بنتے جائیں گے، اور یہ رکاوٹ دور ہونی شروع ہوجائے گی، لیکن اگر نہ سمجھ، ے کے ڈر سے شروع ہی میں عربی بولنا ترک کردیا گیا تو اس درس کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا، پھر عربی بولنے میں مشق کبھی نہیں ہوسکے گی۔

زادالطالبین، القراءۃ الراشد اور معلم الانشاء

ان کتابوں کا مقصد ’’عربیت‘‘ کا ذوق اور ادبی جملوں کی فہم پیدا کرنا، نیز ان میں نحو وصرف کے قواعد کا اجراء اور بالآخر خود صحیح عربی بولنے اور لکھنے کی مشق کرنا ہے، لہٰذا ان کتابوں کا صرف ترجمہ کرانے پر اکتفا کیا جائے:

۱) ترکیب اور نحوی قواعد کے اجراء پر زور دیا جائے۔

۲) نئے الفاظ کی لغوی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا محل استعمال بتایا جائے، اور ان الفاظ کے محل استعمال کو بیان کرنے کے لئے از خود مثالیں دی جائیں، اور پھر طلبہ سے ان الفاظ کو جملوں میں استعمال کرایا جائے۔

۳) تمام تمرینات زبانی اور تحریری دونوں طریقے سے اہتمام کے ساتھ طلبہ سے کرائی جائیں، اور تحریری کام کرکے نہ لانے والے طالب علم کو تنبیہ کی جائے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عربیت کا ذوق پیدا کرنے میں کتاب سے زیادہ استاذ کو دخل ہوتا ہے، اگر استاذ میں خود ذوق ہے، تو کتاب خواہ کتنی اچھی ہو طالب علم کے اندر یہ ذوق پیدا ہونا مشکل ہے، لہٰذا استاذ کو چاہئے کہ وہ خود اپنے ذوقِ عربیت کو ترقی دینے کی فکر کرے، ادبی کتابیں اپنے عام مطالعے میں رکھے اور خود اپنی تحریر وتقریر کی مشق کو خارج اوقات میں بڑھاتا رہے۔

نفحۃ العرب

اس کتاب کا مقصد ہلکی پھلکی ادبی نثر کے ذریعہ رفتہ رفتہ عربی ادب تک طالب علم کی رسائی پیدا کرنا ہے، لہٰذا اس کتاب کا صرف ترجمہ کرانے پر اکتفا نہ کیا جائے؛ بلکہ مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا جائے:

۱) نئے الفاظ کے لغوی اور مستعمل معنی اور افعال کے باب اور اسماء کے جمع ومفرد کا بیان اور ان کا محل استعمال۔

۲) نئے انداز کے جملوں کی نحوی ترکیب۔

۳) قواعد نحو وصرف کا اجراء۔

۴) نئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کرنے کی مشق۔

۵) ادب کی ہر کتاب سے یہ مقصد بھی ضرور حاصل کرنا چاہئے کہ عربی الفاظ اور عربی جملے طلبہ کی زبانوں پر چڑھیں اور عربی بولنے کی جھجک دور ہو، اس غرض کے لئے ہر درس کے آخر میں استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی درس کی حکایت کے بارے میں طلبہ سے عربی میں سوالات کرے اور عربی میں ہی طالب علم ان کا جواب دے۔(۱)

مقامات حریری

یہ کتاب ایک خاص دور کی ادبی نثر کی نمائندگی کرتی ہے جس میں قافیہ بندی اور سجع کے اہتمام، استعارات وتشبیہات کی کثرت اور محسنات بدیع کے پرتکلف استعمال کو پسند کیا جاتا تھا۔لیکن یہ ذوق ایک خاص دور کا تھا نہ اس دور سے پہلے اس کا رواج تھا نہ اس کے بعد باقی رہا، لہٰذا اب اس کتاب کی تدریس کا منشاء یہ نہیں ہے کہ طالب علم اپنی تحریر وتقریر میں اس اسلوب کی پیروی کریں؛ بلکہ اس کا منشاء ایک تو اس دور کی نثر سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے دوسرے طالب علم کے ذخیرہ الفاظ کو اتنا بڑھانا ہے کہ اس میں ہر دور کی ادبی نثر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۲۲، ۲۳، مؤلف تقی عثمانی مدظلہ، مکتبہ زمزم

مقامات حریری کا مسجع اسلوب اگرچہ اب متروک ہو چکا ہے؛ لیکن اس کا ذخیرہ الفاظ تمام تر متروک نہیں ہوا؛ چنانچہ مقامات کے بیشتر الفاظ اب بھی اعلی ادبی تحریروں میں مستعمل ہیں، انھی جیسے الفاظ سے جدید مفاہیم کی تعبیریں اور جدید اسالیب کلام وجود میں آئے ہیں، اس میں استعمال ہونے والی کہاوتیں آج بھی ادبی تحریروں کی جان ہیں؛ لہٰذا استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور سے واقف ہوکر یہ کتاب اس طرح پڑھائے کہ اس سے۔

۱) طالب علم کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو۔
۲) اگر وہ لفظ قرآن کریم یا کسی مشہور حدیث میں آیا ہے تو اس کا قرآنی مفہوم معلوم ہو۔
۳) اس کو الفاظ کا صحیح محل استعمال معلوم ہو۔
۴) ان الفاظ کو اگر کسی جدید مفہوم کی تعبیر کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے تو اس کا علم حاصل ہو۔
۵) کتاب کی ضرب الامثال کی حقیقت اور ان کا موقع و محل سمجھ میں آئے۔
۶) ایک جیسے الفاظ کے درمیان معانی کا اگر کوئی فرق ہے تو وہ واضح ہو۔

ان مقاصد کے لئے استاذ کو مندرجہ ذیل امور کا اہتمام لازما کرنا چاہئے:

۱) الفاظ کی لغوی تحقیق میں بہت زیادہ پھیلاؤ سے اجتناب کرے، بعض جگہ معمول یہ ہے کہ لفظ کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے اس کے تمام مشتقات اور تمام ابواب کا ذکر ضرور کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اس اصل لفظ کے معنی ہی کو بھول جاتا ہے؛ لہٰذا لغوی تحقیق میں اس توسع کے بجائے ہر لفظ کے صرف وہ معنی بتائے جائیں جو اس جگہ مراد ہیں اگر وہ فعل یا شبہ فعل ہے تو اس کا باب اور اسی مادے میں مجرد کے ابواب کے اختلاف سے یا صلے کے استعمال سے کوئی فرق آتا ہے تو وہ فرق بیان کیا جائے اور اگر اسم ہے تو مفرد کی جمع اور جمع کا مفرد بیان کرنے پر اکتفا کیا جائے۔

۲) لغوی تحقیق میں مذکورہ بالا توسع کے بجائے اس لفظ کا محل استعمال ذہن نشیں کرانے پر زور دیا جائے یعنی یہ بتایا جائے کہ یہ لفظ آج کل مستعمل ہے یا نہیں؟ اگر مستعمل ہے تو کن معانی میں؟ اس کا حقیقی استعمال کس طرح ہوتا ہے؟ اور مجازی استعمال کس طرح؟ اگر کوئی اسم ہے تو اس کی صفت مبالغہ کیا استعمال ہوئی ہے؟ اور پھر ان تمام استعمالات کو خود بھی مثالوں سے سمجھایا جائے اور طلبہ سے بھی اس کی مثالیں بنوائی جائیں۔(۱)

دِیوان المُتَنَبّی

یہ کتاب شعراء مولدین کے زمانے کی شاعری کا نمونہ پیش کرنے کے لئے نصاب میں رکھی گئی ہے، اس کی تدریس میں ان تمام امور کا اہتمام کیا جائے جو مقامات حریری کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں مزید باتیں یہ ہیں:

۱) اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ طلبہ کو شعر پڑھنے کا صحیح طریقہ آئے، جو طلبہ شعر کو پڑھتے وقت اسے وزن سے خارج کر دیتے ہیں انہیں اس غلطی پر ہمیشہ ٹوک کر اصلاح کی جائے۔

۲) حکمت پر مبنی اشعار زبانی یاد کرائے جائیں۔

۳) ترکیب کے اختلاف سے معانی میں تبدیلی کی نشان دہی کی جائے۔

۴) اشعار میں جو محسنات بدیع آتے ہیں ان کی نشان دہی کی جائے۔

۵) بلاغت کے دوسرے نکات بھی واضح کئے جائیں۔

۶) کتاب کے اردو ترجموں اور شرحوں کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔(۲)

مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمۃ، عربی ادب سے لگاؤ

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ادب وہ پہلا موضوع تھا جس

---

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۲۶-۲۷-۲۸، مکتبہ زم زم

(۲) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۳۱، مؤلف: مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب، مکتبہ زم زم

سے حضرت والد محترم کو خصوصی دلچسپی ہوئی، اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ کی عربی تعلیم کا آغاز شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہ کے ہاتھوں ہوئی اور ان کی حسن تعلیم و تربیت کے نتیجے میں آپ مختصر سی مدت میں اشعار کہنے شروع کر دیئے، ادھر دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی جو عربی کے بلند پایہ ادیب تھے آپ پر بہت مہربان تھے، کبھی آپ سے کوئی مضمون لکھوا دیا، کبھی کسی جلسے میں آپ کو سپاس نامہ لکھنے یا خیر مقدمی نظم کہنے کا حکم دیا، اسی طرح آپ کی مشق سخن میں اضافہ ہوا، پھر حضرت شاہ صاحبؒ کے زیر صدارت "نادیة الأدب" کا جو ہفتہ واری اجتماع ہوتا اس میں والد صاحبؒ سرگرمی سے حصہ لیتے رہتے۔

آپ کی تدریس کی ابتداء بھی عربی نحو و ادب سے ہوئی، اسی دوران آپ نے نفحۃ الیمن کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا، جو شائع ہو چکا ہے، سالہا سال آپ نے مقامات حریری دیوان متنبی، حماسہ اور سبع معلقات کا درس دیا، خاص طور سے آپ کا مقامات حریری کا درس اتنا مشہور ہوا کہ دوسرے مدارس سے مدرسین اس درس میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ حضرت والد صاحبؒ کا معمول یہ تھا کہ جو کتاب بھی پڑھاتے تھے، مطالعہ کے دوران صرف اسی کے حواشی و شروحات پر اکتفا نہ کرتے؛ بلکہ اس علم و فن کی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کر کے اس علم کے مزاج کو پہچاننی کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ مذکورہ کتب کی تدریس کے دوران آپ نے مختلف شعراء کے دواوین، ادب عربی کی تاریخ اور ادب کی بنیادی کتابوں کو مطالعہ میں رکھا جس کی وجہ سے عربی میں بالخصوص عربی شاعری کا بڑا ستھرا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔

شعراء عرب کے اشعار

والد صاحب کو مختلف شعرائے عرب کے اتنے اشعار یاد تھے کہ انہیں سن کر حیرت ہوتی تھی، عربی سے واقفیت کے بعد احقر کو تقریباً بیس سال حضرت والد صاحب کی آغوش شفقت میسر آئی اور مختلف مواقع پر آپ سے بیشمار اشعار سنے، اس کے باوجود آخر عمر میں

آپ کی زبان سے بسا اوقات ایسے اشعار سننے میں آئے جو پہلے کبھی نہیں سنے تھے، شعراء جاہلیت میں خاص طور پر امراء القیس، زہیر، اوراعشی، شعرائے اسلامیین میں حضرت حسان، کعب بن زہیر، ذو الرمہ، فرزدق اور حماسیین، اور شعراء مولدین میں متنبی، ابو تمام اور ابوالعتاہیہ کے اشعار آپ سے بکثرت سنے جس سے ان شعراء کے ساتھ خصوصی مناسبت کا اندازہ ہوتا تھا۔(۱)

حضرت مولانا اسعد صاحبؒ کا ذوق ادب

مظاہر العلوم میں عروض وادب کا عروج

آپ کی جدت آفرین طبیعت نے اوائل عمر ہی میں آپ کو فن عروض کی تدریس کی طرف اس طرح مائل کیا کہ جامعہ مظاہر العلوم کی تدریس میں فن عروض بھی شامل ہوگیا، آپ سے پہلے فن عروض با قاعدہ داخل نصاب نہ تھا، آپ نے مدتوں فن عروض کی تعلیم دی اور آپ کی مساعی سے اس فن میں بہت سے حضرات نے مکمل مہارت حاصل کی، آپ نے ادبی کتب مقامات، السبع المعلقات، متنبی، حماسہ، قصیدہ بردہ، اور قصیدہ بانت سعاد جملہ ادبی کتابیں بڑے اہتمام وانہماک سے ایک عرصہ تک پڑھائیں، گومؤخر الذکر دونوں قصیدے داخل نصاب نہ تھے، مگر ادبی ذوق ودلچسپی کی وجہ سے آپ نے یہ کتابیں پڑھائیں، اور فن ادب کو مظاہر العلوم میں بام عروج تک پہنچایا۔(۲)

عربی زبان کیسے سیکھیں؟

۱۔ ابتدائی مرحلے میں طلباء عربی زبان کے الفاظ (مفردات) کا ایک خاطر خواہ ذخیرہ یاد کریں، الفاظ کے انتخاب میں ان کلمات کو ترجیح ہونی چاہئے، جو عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں، سالانہ ایک مقدار متعین ہو، جو کم از کم ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ہو، یہ کام آپ پانچ سال تک کریں، گویا پانچ ہزار الفاظ کا ایک ضروری ذخیرہ آپ

---

(۱) میرے والد میرے شیخ اوران کا مزاج ومذاق: ۱۶۔۱۷، مفتی تقی عثمانی صاحب، فرید بک ڈپو دہلی

(۲) حیات اسعد: ۹۴۲۸

کی کاپی میں موجود ہونا چاہئے۔

۲۔ درسی وغیر درسی جو چیزیں بھی آپ پڑھیں، ان سے اچھے جملے اور عمدہ تعبیرات اخذ کر کے اپنی کاپی میں یکجا کریں۔

۳۔ عربی زبان کے ادبی شہ پارے باقاعدہ سمجھ کر یاد کریں۔

ترتیب حسب ذیل ہوسکتی ہے:

۱۔ قرآن کریم کے آخری تین پارے مع حل لغات اور فہم آیات کے ساتھ حفظ کریں۔

۲۔ کلام نبوت میں سے دس خطبے اور جوامع الکلم اور بیس ایسی احادیث جو" امثالِ نبوی" پر مشتمل ہو یاد کریں۔

۳۔ نامور خطباءِ عرب کی چند مشہور تقریریں اپنی کاپی میں نقل کریں اور ان کے بعض نمونے یاد کریں

۴۔ تقریباً دوسو مشہور ترین اشعار جمع کریں اور انہیں دہراتے رہیں۔

۵۔ آپ اپنے معاشرے میں جہاں کہیں بھی ہوں ، اپنے ذہن کو سوالی بنایئے ، اور اپنے اردگرد کی پھیلی ہوئی دنیا میں جس شے کو بھی دیکھئے، ذہن پر زور دینے کے باوجود معلوم نہ کرسکیں تو اپنی لغت کی کاپی یا اپنے اساتذہ کی طرف رجوع کیجئے۔

۶۔ عربی بولنے کی مشق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمت سے کام لیں، اور اپنے طلباء ساتھیوں کے ساتھ عربی میں مافی الضمیر ادا کرنے کی امکانی کوشش کریں، خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ ہوں، اگر بہت زیادہ شرمیلے واقع ہوئے ہو تو" خود کلامی" کی عادت ڈالیں، یعنی خود ہی سوال اور خود ہی جواب دینے کی کوشش کریں۔

۷۔ زبان وادب کے نام سے درس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، صرف ان ہی پر تکیہ نہ کرلیں؛ بلکہ جو کتابیں اس مقصد کے لئے نہیں پڑھائی جاتی، ان سے بھی عربی سیکھ سکتے ہیں۔

۸۔ زبان وادب کی جو درسی کتابیں آپ پڑھتے ہیں، ان کا صرف ترجمہ جان لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ آپ کو باریک بینی سے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری زبان کی تعبیر کو عربی زبان میں کیسے اور کس طرح ادا کیا گیا ہے؟ ہر زبان کا بیان اور اظہار جداگانہ اور اپنا مخصوص مزاج لئے ہوئے ہوتا ہے۔

۹۔ دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی صلات سے واقفیت حاصل کرنے کا کوئی مسلم قاعدہ نہیں پایا جاتا، افعال کے صلات کا علم آپ کو کثرتِ مطالعہ اور خاصی مشق ومزاولت کے بعد ہی ہوگا، دورانِ درس ومطالعہ اور حل لغات کے وقت اس جانب دھیان رہنا چاہئے۔

۱۰۔ درسی کتابوں کے مالہ وماعلیہ کے سمجھنے کی جہاں کوشش ہو، وہاں یہ کوشش بھی ہونی حائیے کہ آپ ان کی عبارت خوانی بآواز بلند مخارج کی صحت اور اعراب کی درستگی کے ساتھ بار بار کریں۔

۱۱۔ عربی جلسوں میں ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کرتے رہئے، اور ہر بار نئے موضوع پر تقریر کی عادت ڈالئے، بہتر ہوگا کہ اپنی کی جانے والی تقریر کی عبارت خوانی کسی استاذ کے پاس کر لیجئے، نیز رٹنے سے پہلے اس کے مفہوم ومدعا کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔

۱۲۔ اردو کی طرح عربی عجلت کے ساتھ ادا کی جانے کی متحمل نہیں ہو پاتی، یہاں ہر حرف کو مکمل ادا کیا جاتا ہے، جب کہ اردو کے بہت سے حروف بوقتِ ادائیگی کھا لئے جاتے ہیں، دونوں زبانوں کے مزاج وادائیگی میں بہت فرق ہے۔

کیا پڑھیں؟ اور کیسے استفادہ کریں؟

''کیا پڑھیں''؟ کا جواب قاری کی ذہنی سطح اور علمی معیار وقابلیت کے سامنے رکھے بغیر دینا بے حد مشکل ہے، تاہم ذیل میں مرحلہ وار مطالعہ کے لئے چند کتابوں کی جانب اشارہ کئے دیتے ہیں، آپ اپنی علمی بساط وذہنی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خود اپنے لئے

بہتر انتخاب کر سکتے ہیں۔

پہلا مرحلہ

قصے، کہانیوں، آپ بیتیوں، روز ناموں، انبیاء کے قصے، دینی لطیفوں اور اخلاقی چٹکلوں کے مطالعے سے گفتگو والی زبان بہت سیکھی جا سکتی ہے، لہٰذا ابتدائی مرحلے میں آپ سبق آموز کہانیوں اور سنجیدہ اور تعمیری ناولوں کا مطالعہ کیجئے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل کتابوں اور ان کے مصنفین سے مدد مل سکتی ہے:

(الف) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تالیف ''قصص النبیین'' اگر آپ نے درس میں پڑھی ہو، تب بھی زبان شناسی کے نقطہ نظر سے دوبارہ مطالہ کیجئے۔

(ب) احمد امین مصری کی کتاب ''حیاتی'' پڑھئے اور اس کے سہل، شگفتہ اور رواں اسلوب کو اپنانے کی کوشش کیجئے۔

(ج) مصطفی لطفی منفلوطی کی مترجم کتابوں میں ''ماجدولین'' اور ''الشاعر'' کا مطالعہ کیجئے او ران کے بعض نمونوں کو اپنی کاپی میں نقل کیجئے۔

(د) آپ کا جو بھی ذہنی اور علمی معیار ہو، اپنے فارغ اوقات میں ''القراءۃ الراشدہ'' کے تینوں حصے ''القراءۃ الرشیدۃ'' کے چاروں حصے اور ''القراءۃ الواضحۃ'' کے تینوں حصے مطالعہ کر جائیے (''کسرۃ من الخبز'' اور ''المنارۃ تتحدث'' کے اسلوب نگارش کو اپنائیے)۔

(ھ) ''کلیلہ ودمنہ'' صدیوں سے عالمی ادب میں ایک شاہکار ہے، آپ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیجئے اور اس کے موضوع اور ہیئت دونوں سے بھر پور فائدہ اٹھائیے۔

(و) ''الف لیلہ'' پڑھئے اور اس کی ٹکسالی عربی کو اپنے ذہن ودماغ میں سموئیے۔۔

(ز) عبدالرحمن رأفت باشا کی کتاب ''**صور من حیاۃ الصحابہ**'' اور ''**صور من حیاۃ التابعین**'' کے سارے حصے ضرور مطالعے میں رکھیں۔

(ح) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شاہکار تصنیف ''**الطریق إلی المدینۃ**''

کا اسلوب نگارش نہایت دلکش، یگانہ اوردل آوزیز وسرورانگیز ہے،عقیدت کی نگاہ سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔

دوسرا مرحلہ

اس مرحلے میں مندرجہ ذیل ادباءاور نامور اہل قلم کی تخلیقات کا مطالعہ مفید ہوگا:

نمبر	کتب وتصنیفات	مصنف
۱	۱:النظرات ۲:العبرات	مصطفی لطفی منفلوطی
۲	۱۔صور وخواطر ۲۔قصص من التاریخ ۳۔رجال من التاریخ	علی طنطاوی
۳	۱۔إذا ھبت ریح الإیمان ۲۔مذکرات السائح فی الشرق الأوسط ۳۔مسیرۃ الحیاۃ	أبو الحسن علی ندوی
۴	الإسلام علی مفترق الطرق	محمد اسد
۵	شھداء الإسلام	احمد متعال
۶	۱۔زعماء الإصلاح ۲۔فیض الخاطر	احمد أمین
۷۔	عبقریات	عباس محمود العقاد
۸	منھج الفن الإسلامی	محمد قطب
۹	نور اللہ	نجیب کیلانی

۱۰	۱۔علی ہامش السیرۃ ۲۔شجرۃ البؤس ۳۔الأیام ۴۔وعد الحق	طٰہٰ حسین
۱۱	۱۔لا تحزن ۲۔مقامات عائض القرنی ۳۔الاسطورۃ	عائض القرنی

تیسرا مرحلہ

اب ایک حد تک آپ کے اندر علمی پختگی، ذہنی بالیدگی اور بالغ نظری پیدا ہو رہی ہے، مندرجہ ذیل کتابوں کے مطالعے سے آپ کا علمی و ادبی ذوق ایک مطلوب معیار تک پہنچ جائے گا۔

نمبر	کتب وتصنیفات	مصنف
۱	۱۔وحی القلم ۲۔إعجاز القرآن	مصطفی صادق الرافعی
۲	۱۔امرء البیان ۲۔القدیم والجدید ۳۔کنوز الأجداد	کرد علی
۳	۱۔فجر الإسلام ۲۔ضحی الإسلام ۳۔ظہر الإسلام	أحمد امین
۴	۱۔حدیث الأربعاء ۲۔مستقبل الثقافۃ فی مصر	طٰہٰ حسین

۵	تاریخ آداب اللغة العربية	أحمد حسن زیات
۶	روائع اقبال	أبوالحسن علی ندوی
۷	التصوير الفنی فی القرآن	سید قطب

نوٹ: اس مرحلے میں اب آپ ''طہٰ حسین'' کی بعض اختلافی تصنیفات اور ''توفیق الحکیم'' اور ''نجیب محفوظ'' کی ان ناولوں کا بھی مطالعہ کرسکتے ہیں جو اسلامی تہذیب اور اس کی قدروں کو زک پہنچاتی ہیں، پہلے دو مرحلوں میں ان جیسے ادیبوں کا پڑھنا آپ کے لئے خطرناک ہوسکتا ہے۔(۱)

(۱) شائقین عربی کے لئے عظیم تحفہ، عربی مضمون نگاری کیسے سیکھیں؟ ۵۔۱۱

فقہ اکبر اور علم العقائد کے بغیر ایمان سلامت نہیں رہ سکتا، کفر واسلام، بدعت وسنت، فرقِ ضالہ وفرقۂ ناجیہ کے درمیان حد فاصل کا اندازہ علم الاعتقاد ہی سے ہوسکتا ہے، ہر فرقے سے وجوہ اختلاف کے اندازے بغیر حدودِ اختلاف کی رعایت کرنا مشکل ہے، اعتقادی انحراف عملی بگاڑ سے زیادہ خطرناک ہے، منطق وفلسفہ اپنی جگہ لیکن سادے، مثبت، واضح اور مدلل انداز میں عقیدے پڑھایا جانا وقت کی بڑی ضرورت ہے، انکارِ حدیث، توہینِ فقہ، علاماتِ قیامت کی من مانی تشریحات، دعوی مہدویت، متواترات وضروریات کا انکار یا معنوی تحریف، مشاجرات صحابہ، بین الادیان مذاکرات، شیعت وسنت میں مصنوعی اتحاد کے نعرے ہر طرف چل رہے ہیں۔

امت مسلمہ میں اصولی وفروعی مسائل کا فرق نہیں رہا، بعض فروعی اختلافی مسائل کو جماعتی علامت بنالیا گیا، بعض اعمال بدعت کو شعائرِ اسلام کا مقام دے دیا گیا، مشترکہ اقدار، وحدتِ مت کا پہلو یاد نہیں، فرقہ واریت کی آگ تھمتی ہی نہیں، اختلاف کے ساتھ دوسرے کا اعتراف اور اس پر اعتماد کوئی نہیں کرنا چاہتا، تحفظِ مذہب کے مواقع پر بھی تحفظِ مسلک کا غم سوار ہے، تبلیغ مذہب کی نہیں، مسلک کی ہورہی ہے، جب کہ یہ طئے شدہ ہے کہ مذہب تبلیغ کے لئے، مسلک ترجیح کے لئے ہوتا ہے، داخلی فروعی مسائل پر گفتگو کا موقع اہل علم کی پروقار مجالس ہیں نہ کہ عوامی جلسے۔

ہمارے نصاب میں خالص اعتقادات کے موضوع پر (کلامی موضوعات سے خالی) ایک ہی کتاب ہے ''عقیدۃ الطحاوی'' جو ''سلم العلوم'' کے بعد پڑھائی جانا طئے ہے:

لیکن وہ بھی سرسری انداز میں (اخیر سال ہونے کی وجہ سے) گذاردی جاتی ہے، اگر اس سے پہلے اردو زبان میں کوئی رسالہ یا اس کے بعد مفصل میں امام سراج الدین علی بن عثمانی کی "بدء الأمالی فی علم العقائد" (جس کی بہترین شرح بدرا اللیالی، مفتی رضاء الحق، شیخ الحدیث و مفتی دارالعلوم زکریا، ساؤتھ افریقہ) بھی کسی طرح پڑھائی جائے تو بہت بہتر ہوگا۔

فلسفہ کی ضرورت

فلسفہ کے بہت سے مسائل کفر میں داخل ہیں؛ لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ میں اس کا درجہ بھی بیان کر دیا جاتا ہے، جس سے مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ فلسفہ کی حقیقت اور اس کا بطلان معلوم کر لینے کے بعد کوئی شخص ان کے دلائل سے متاثر نہ ہو اور ضرورت کے وقت ان کے دلائل کا جواب دے سکے۔

اسی بناء پر ہمارے علماء متکلمین نے یونانی فلسفہ کو حاصل کیا اور علم کلام کو معقول کے طرز پر مدون فرمایا۔(۱)

جیسے کلمات کفریہ کا عمداً زبان سے نکالنا کفر ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص کلمات کفریہ سے بچنے کے لئے ان کو جاننا چاہتا ہے یا تردید کے لئے اور دوسرں کو بچانے کے لئے ان کو جاننا چاہے تو یہ کفر نہیں؛ بلکہ یہ جائز ہے، چنانچہ فقہاء نے کتابوں میں کلمات کفریہ کے لئے باب منعقد کیا ہے جس میں ایسی باتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے ایمان جاتا رہتا ہے، ان کے جاننے اور پڑھنے کو کوئی حرام نہیں کہتا۔۔۔۔۔۔۔۔کیوں کہ نقلِ کفر کفر نہیں۔

دوسری صدی ہجری میں جب امت مسلمہ میں غیر معمولی توسیع پیدا ہوئی اور اس وقت کی معلوم دنیا کے تین براعظموں تک امت مسلمہ پہنچ گئی تو نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، رومن لا (Roman law) سے واسطہ پیش آیا، ایرانی تصورات سے واسطہ پیش آیا، ہندوستانی تصورات سے، بدھ ازم سے، عیسائیت سے، یہودیت سے واسطہ پیش آیا، ان

(۱) امداد الفتاوی: ۴؍۲۷، التبلیغ: ۲۱؍۱۰۴، بحوالہ مذکور

میں سے ہر ایک کی طرف سے اعتراضات اسلام پر وارد ہوئے، اس کا اتنا پختہ جواب مفکرین اسلام اور فقہاء و متکلمین اور علماء اصول نے دیا کہ ایک ہزار برس تک اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی، بنیاد ان کے پاس موجود تھی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ سے ان کو ملی تھی، لیکن اس بنیاد یا اس ذخیرے کی جو فارمولیشن تھی یعنی جس طرح انہوں نے اس کو تعبیر کیا اور بیان کیا اس میں عقلی استدلال بھی تھا، اس میں یونانیوں کے اعتراضات کا جواب بھی تھا، ایرانیوں کے تصورات کا جواب بھی تھا، ہندوستان کے ویدازم کا جواب بھی تھا، مصر کے نوافلاطون فلسفیوں کا جواب بھی تھا، اور یہ جو پیکیج ہم کہہ سکتے ہیں، یہ مجموعہ علوم یا مجموعہ ثقافت تھا، اس میں ان تمام مسائل کا مؤثر جواب موجود تھا، جس کے نتیجے میں علمی، فکری اور تہذیبی سطح پر کسی کو مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑا ہونے کا یارانہ رہا، یہ صورت حال ہزار برس تک جاری رہی۔

امام غزالیؒ نے یونانی علوم کا جائزہ لے کر انہیں خالص عملی انداز میں بیان کیا کہ یونانیوں کے علوم یہ ہیں، اس کے بعد خالص عقلی انداز میں یونانی اسلوبِ استدلال سے کام لے کر جس سے کوئی بڑے سے بڑا یونانی فلسفی، خود ارسطو اور افلاطون بھی ہوتا تو وہ اس اسلوب استدلال سے انکار نہیں کرسکتا۔

امام غزالیؒ کا انتقال ۵۰۵ ہجری میں ہوا، ۵۰۱ ہجری میں اگر کوئی یونانی زندہ ہوکے آجاتا، حکیم ارسطو طالیس معلم اول زندہ ہوکر آجاتا اور امام غزالیؒ کے سامنے بیٹھ کے کتاب پڑھتا تو اپنی منطق کی روشنی میں اس کتاب پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔ بہر حال امام غزالی نے اس دور کے عصری علوم کو خادم بنا کر اسلام کے کیمپ میں داخل کر دیا۔

بعض لوگ اسلامی علوم کو خادم اور عصری علوم کو مخدوم بنا کر جمع کرنا چاہتے ہیں، یہ اسلامی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اسلامی تاریخ میں کسی بھی عصری علم یا عصری فن سے جب استفادہ کیا گیا تو اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے خادم کے طور پر اس سے کام لیا گیا اور اس خادم نے اسلامی ثقافت اور تہذیب کے خادم کے طور پر اس سے کام لیا اور اس

خادم نے اسلامی علوم کو مخدوم بنا کر ان کی خدمت کی، یہ آپ کو علم طب میں بھی نظر آئے گا، تفسیر میں بھی، حدیث میں بھی، فقہ میں بھی، اصول فقہ میں بھی، کلام میں بھی، حتی کہ تصوف میں بھی، تصوف جیسے فن کی کتابیں جو خالص روحانیات کا میدان ہے، اس کو بھی اتنے مضبوط عقلی دلائل سے بیان کیا گیا ہے آپ دیکھ لیں "تربیۃ السالک" دو بڑی جلدوں میں ہے۔

عصری علوم سے استفادہ اس شرط کے ساتھ کہ عصری علوم پر ناقدانہ نظر ہو، مقلدانہ نہیں، مقلدانہ نظر تو خطرناک ہوتی ہے، ناقدانہ نظر، عصری علوم پر رکھتے ہوں کہ عصری علوم کو جو بھی جس زمانے کے علوم ہیں ان کو اسلام کی خدمت کے لئے اور اسلامی علوم وفنون کو نئے انداز سے مرتب اور مدون کرنے کے لئے بیان کریں۔(۱)

جدید فلسفہ کی ضرورت واہمیت

نئے زمانے کے ساتھ نئے تقاضے پیدا ہو چکے ہیں، اس لئے علم کلام اور فلسفہ کو نئے دور اور اس کے تقاضوں میں سمجھنے کی ضرورت ہے، یہاں اس سلسلے میں علم کلام سے متعلق چند ایک کتابوں اور کلام اور عقائد سے متعلق جو موجودہ رجحانات اور عصر حاضر کے مطابق جن میں۔

(۱) بدائع الکلام فی بیان عقائد الاسلام

حضرت مولانا یوسف صاحب تاؤلوی کی "بدائع الکلام فی بیان عقائد الاسلام"، یہ عقائد اسلام کے بیان کے سلسلے میں نہایت مؤثر اور سہل اور موضوع ترین اور مفید ترین کتاب ہے، جس کو شرح عقائد وغیرہ سے پہلے پڑھا دیا جائے تو عقائد اسلام اور اسلام کے بنیادی امور کے سمجھنے کے سلسلے میں کافی مدد ملے گی۔(۲)

(۲) عقائد اسلام

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی تالیف فرمودہ کتاب

---

(۱) التبلیغ: ۱۰۳، بحوالہ علوم فنون: ۹۹

(۲) بدائع الکلام فی بیان عقائد الاسلام، مفتی محمد یوسف التاؤلوی، مکتبۃ فقیہ الامت، دیوبند

''عقائد اسلام'' اردو زبان میں عقائد پر ایک اہم کتاب ہے جس میں اسلام کے عائد کو نہ صرف عقلی اور نقلی دلائل سے مزین کیا گیا ہے؛ بلکہ جدید اور قدیم فلاسفہ اور گمراہ لوگوں کے اعتراضات کے جوابات جامع انداز سے دیئے گئے ہیں، جس سے تمام شبہات دور ہو جاتے ہیں؛ اس لئے یہ تالیف مقبول ہوئی اور علماء وطلبہ میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب کو بھی جدید فلسفہ کی حقیقت اور اس کے اعتراضات کے جوابات شافی ووافی انداز میں مل جاتے ہیں۔

اس حوالہ سے فلسفہ اور علم کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ فرماتے ہیں:

اسلام کی اصل بنیاد عقائد پر ہے، جن کا اجمالا جاننا فرض عین ہے اور تفصیلا جاننا فرض کفایہ ہے، اگر امت میں سے چند افراد بھی اس سے واقف ہوں تو باقی تمام سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اور چونکہ عقائد میں چوٹی کا عقیدہ عقیدہ توحید ہے اور اسلام کا اصل اصول ہے؛ اس لئے اس فن کا نام علم توحید ہوا اور اس علم کی غرض وغایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور صفات الٰہیہ کا علم اور نبوت ورسالت کی ماہیت اور قیامت کی حقیقت قرآن وحدیث کے مطابق اور صحابہ کرام کے مسلک کے موافق ایسے دلائل عقلیہ ونقلیہ سے واضح ہو جائے کہ جس سے دل کو تسلی اور اطمینان ہو جائے اور دل میں کوئی شک اور تردد نہ رہے اور یہ علم تمام علوم دین میں اول اور افضل ہے۔

اس علم کی تدوین کی بنیاد ڈالنے والے امام اعظم ابوحنیفہؒ النعمان ہیں اور پھر ان کے بعد امام شافعی ہیں جیسا کہ ''تکملہ'' عقائد الاسلام میں اس کا بیان گذر چکا۔

عہد صحابہ وتابعین کے بعد جب علوم کی تدوین وتالیف کا زمانہ آیا تو شیخ ابوالحسن اشعری اور شیخ ابومنصور ماتریدی نے علم اصول دین کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور عقائد اسلامیہ کی تحقیق وتدقیق اور معارضین اسلام کی تردید میں اپنے زمانہ کے علماء معاصرین سے سبقت لے گئے اور یہی دونوں حضرات ائمہ فن اور واضع فن مشہور ہو گئے، اور قیامت تک

آنے والے علماء کو راستہ بتلا گئے، چنانچہ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے اسی راہ پر چل کر علم کلام کو بام عروج اور اوج کمال تک پہنچادیا اور ایسے اصول اور کلیات بتلا گئے جس سے قیامت تک آنے والے فلاسفہ اور ملاحدہ کے اعتراضات اور شبہات کا جواب ہوسکے۔

بحمدہ تعالیٰ حضرات متکلمین ایسا جامع علم کلام مدون کر لئے کہ جدید وقیم شبہات کے ازالہ کے لئے کافی اور وافی ہے، جدید فلسفہ کو دیکھ کر مرعوب ذہنیتوں کی زبان پر اکثر یہ آتا ہے کہ جدید علم کلام مدون ہونا چاہئے جس کا درپردہ مطلب یہ ہے کہ قدیم علم کلام جدید تحقیقات اور جدید شبہات اور اعتراضات کو جدید کہا جاتا ہے اکثر ان میں ایسے ہیں کہ وہ درحقیقت جدید نہیں؛ بلکہ ان کا پیرایہ جدید ہے اور اصل شبہ کا رد قدیم علم کلام کی کتابوں میں موجود ہے؛ چونکہ بہت سے قدیم شبہے ختم ہوگئے تھے؛ مگر موجودہ زمانہ میں ان کا تذکرہ تازہ ہوگیا اور جدید پیرایہ سے بیان کئے جانے لگے؛ اس لئے لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ نئے شبہے ہیں، سوم یہ کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جدید علم کلام کی ضرورت ہے، ان کی غرض یہ نہیں کہ اصول اسلام اور عقائد اسلام کی ایسی تحقیق کی جائے جس سے اسلام کی باتیں دل نشین ہوجائیں اور دلوں سے نئے شبہات دور ہوجائیں؛ بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ مذہبی تحقیقات میں کچھ تغیر وتبدل کر کے اس کو جدید سائنس کے مطابق کردیا جائے، تحقیقات جدیدہ تو اصل رہیں اور اصول اسلام اور احکام اسلام ان کے تابع ہوجائیں، اور جہاں کہیں اسلامی عقیدہ بظاہر جدید فلسفہ کے مخالف نظر آئے تو اسلامی عقیدہ میں تاویل؛ بلکہ تحریف کر کے اس کو جدید فلسفہ کے مطابق بنادیا جائے، ان لوگوں کا مقصود دین کی طرف داری نہیں؛ بلکہ سائنس اور جدید فلسفہ کی طرف داری ہے۔

مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے جدید علم کلام کی ضرورت بیان کرتے ہیں جس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ توحید اور رسالت اور قیامت کو دلائل سے ثابت کریں؛ بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ شریعت کے اصول مسلمہ کو توڑ موڑ کر فلسفہ جدیدہ کے مطابق کردیں اور یہ گروہ جدید فلسفہ سے اس درجہ مرعوب ہے کہ اس کو شریعت کے اصول مسلمہ اور اجماع امت کی بھی

پرواہ نہیں، ہمہ تن کوشش اس کی ہے کہ نصوص شریعت میں دور دراز تاویلیں کر کے ان کو تحقیقات جدیدہ پر منطبق کردیں؛ حالانکہ جن باتوں کا نام ان لوگوں نے تحقیقات جدیدہ رکھا ہے وہ درحقیقت وہمیات جدیدہ اور خیالات جدیدہ ہیں جو نہ کسی مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہیں اور نہ کسی دلیل عقلی سے ثابت ہیں، جیسا کہ مسئلہ ارتقاء کہ ڈارون لکھتا ہے کہ آدمی پہلے بندر تھا ترقی کر کے دم گر گئی اور سیدھا کھڑا ہو کر چلنے لگا اس پر نہ کوئی مشاہدہ اور تجربہ ہے اور نہ کوئی دلیل عقلی موجود ہے، اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں "**خلقه من تراب**" اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اس قسم کے لوگ ڈارون کی بے سروپا باتوں کی پر تو بلا دلیل ایمان لے آتے ہیں اور قرآن کی صریح آیتوں میں تاویلیں کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ علم کلام، اصول اسلام کی حفاظت کے لئے بمنزلہ ایک مضبوط قلعہ کے ہے جس میں داخل ہو کر دشمنان اسلام کے حملوں اور الحاد و دہریت اور فلسفہ جدیہ وقدیمہ کے تیروں سے محفوظ و مامون ہوسکتا ہے؛ اس لئے ہر زمانہ کے علماء اعلام اور ائمہ کرام نے عقائد اسلامیہ کے ثابت کرنے اور فلاسفہ اور ملاحدہ کے شبہات دور کرنے کے لئے صدہا کتابیں لکھ ڈالیں اور اسلام کی حفاظت کے لئے مضبوط قلعے کھڑے کر دیئے۔

الحمد للہ اس چودھویں صدی می جدید علم کلام کا اولین مصداق علامہ سید حسین جسر طرابلسی کی تالیف لطیف رسالہ حمیدیہ ہے، جس کا ترجمہ "سائنس اور اسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ نے اس کا ایک خلاصہ لکھا ہے جو خلاصہ سائنس اور اسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، رسالہ حمیدیہ بحمدہ اللہ تعالی عقائد اسلامیہ کی تحقیق اور جدید وقدیم فلسفہ کے شبہات اور اعتراضات کے جوابات میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

علامہ حسین جسر طرابلسی نے عربی زبان میں اس موضوع پر رسالہ حمیدہ کے نام سے ایک مبسوط لکھی جو بار بار مصر سے شائع ہوئی جو اپنی معقولیت اور حسن استدلال کے نام پر عایت درجہ مقبول ہوئی، پھر اخیر میں علامہ موصوف نے حصون حمیدہ کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی، یہ دوسری کتاب درحقیقت پہلی مبسوط اور مفصل کتاب کا خلاصہ ہے، یہ کتاب

اگر چہ بہت مختصر ہے؛ لیکن نہایت جامع ہے اور فلسفہ جدیدہ وقدیمہ کے شبہات کے جوابات میں اور عقائد اسلامیہ کے ثابت اور محقق کرنے میں کافی وشافی ہے، **جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیرا**

انہیں حضرات متکلمین کے نقش قدم پر اور انہی حضرات کے دستر خوان علم کی خوشہ چینی سے اس ناچیز نے عقائد اسلامیہ وغیرہ ان کتابوں میں مسائل اور دلائل کی تفصیل تھی؛ تاکہ اس جدید تعلیم سے جو الحاد اور بے دینی کا سیلاب آرہا ہے اس کی روک تھام ہو سکے، سو الحمد للہ حق جل شانہ کی توفیق سے جو کچھ لکھا سکتا تھا وہ لکھ دیا، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، آمین، اور ان تالیفات کو ہدایت واستقامت کا ذریعہ بنائے۔

اب دل چاہا کہ ایک ایسا مختصر رسالہ لکھ دیا جائے کہ جو اہل سنت وجماعت کے عقائد کا خلاصہ ہو اور اس میں تفصیل تو زیادہ نہ ہو؛ مگر بقدر ضرورت ایسے عقلی دلائل پر مشتمل ہو جس سے اصول دین کے متعلق جدید وقدیم شبہات اور اعتراضات کا ازالہ بھی ہو جائے اور مسلمان موجودہ زمانہ کی دہریت اور الحاد کی بلا سے بچ سکیں اور عام لوگوں کو عقائد اسلامیہ کے بارہ میں عقلی طور پر بھی شک اور تردد نہ رہے اور ایمان مضبوط اور مستحکم ہو جائے اور سمجھ میں جائیں کہ اسلام کے اصول ونظریات کیسے معقولات اور مدلل ہیں اور یہ تحریر عقائد السلام کا دوسرا حصہ ہے۔

سو وہ مختصر رسالہ ہدیہ ناظرین ہے اور اسی وجہ سے اس کو خلاصہ العقائد کے نام سے موسوم کرتا ہوں اور یہ تحریر اگر چہ بہ نسبت عقائد الاسلام اور علم الکلام بہت مختصر ہے؛ لیکن باوجود اختصار کے اس میں بہت سے جدید اور مفید مضامین ایسے آگئے ہیں، جو گذشتہ کتابوں میں نہیں آئے۔(۱)

(۳) الانتباھات المفیدۃ عن الاشتباھات الجدیدۃ

علم کلام جدید کا ایک نہایت مفید رسالہ ہے جس میں شبہات جدیدہ کا جواب جدید

(۱) عقائد اسلام: ۲/ ۲۸۳، ادارہ اسلامیات، لاہور، کراچی، لاہور

تعلیم یافتہ حضرات کے مذاق پر نہایت وضاحت کے ساتھ دیا گیا ہے اور ایسے اصول موضوعہ قائم کر دیئے گئے ہیں، جن سے اس قسم کے جتنے شبہات پیدا ہوں رفع کئے جاسکتے ہیں۔

یہ ایک علم کلام جدید پر نہایت مفید رسالہ ہے جس میں شبہات جدیدہ کا جواب اہل شبہات (انگریزی تعلیم یافتہ حضرات) کے مذاق پر نہایت وضاحت ومتانت کے ساتھ دیا گیا ہے، موضوع اور کتاب کی اہمیت خود حضرات حکیم الامت نے اس طرح ذکر کی ہے:

''متکلمین کے مقرر کردہ اصولوں پر شبہات جدیدہ کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے، اور اسی ذخیرۂ علم سے علم کلام جدید کی بھی بآسانی تدوین ہوسکتی ہے، میں نے بطور خود یہاں کے بعض ایسے شبہات کہ جن کا علم مجھ کو تھا لکھ "الانتباهات المفيدة عن الاشتبهات الجديدة" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، اور اس میں میں نے ایسے اصول وضوابط قائم کر دیئے ہیں جن سے میرے نزدیک اس قسم کے شبہات پیدا ہوں، بسہولت رفع کئے جاسکتے ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں بقلم حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی منتقل کی گئی، اس کا عربی نام " الإسلام والعقلانية " ہے اور خود حضرت تھانویؒ کے خلیفہ کی شرح کے ساتھ ''اسلام اور عقلیات'' کے نام سے دستیاب ہے''(۱)

(۴) جدیدیت

اس حوالے سے محمد حسن عسکریؒ کی جدیدیت جس کو انہوں نے حضرت مولانا تقی عثانی مدظلہ العالی تقاضے پر مرتب کیا تھا، جس کے متعلق حضرت مولانا تقی عثانی صاحب فرماتے ہیں:

''جس میں انہوں نے جدید مغربی افکار اور مختلف فلسفوں کا خلاصہ عام

(۱) الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ: ۲، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مکتبہ امدادیہ اشرفیہ، نزد احمد غریب یونانی میڈیکل کالج، اکل کواں

فہم انداز میں مرتب فرما کر ریئے گینٹوں کے افکار کی روشنی میں ان کی بنیادی گمراہیوں کی نشاندہی فرمادی، میرا مقصد یہ تھا کہ یہ کتاب دینی مدارس کے اساتذہ وطلباء کے لئے مفید ہوگی اوراس کی مدد سے وہ مغربی افکاراوران کی گمراہیوں کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے، زیرنظر کتاب اسی فرمائش کی تکمیل ہے، کتاب کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں فاضل مصنف نے یورپ کی فکری تاریخ اس جامعیت، اختصار اورانضباط کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ اسے ''دریا بکوزہ'' کہنا چاہئے ، پہلے ابواب میں انہوں نے یونانی اور رومی ادوار اور ازمنہ وسطی کے فکری رجحانات کونہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، پھر ''سأۃ ثانیہ'' کے بعد سے یورپ میں جتنے فکری انقلابات آئے ہیں اور جتنے فلسفوں نے قبولیت حاصل کی ہے، ان کوانتہائی دل نشین ترتیب سے بیان کیا ہے، انداز بیان ایسا کہ مختصر الفاظ میں ان فلسفوں کی بنیادی خصوصیات بھی واضح ہوجاتی ہیں، اور ساتھ ساتھ ان کی گمراہیوں کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں، دوسرے حصہ میں ان فکری گمراہیوں کی فہرست ہے جو ان مغربی افکار کے زیراثر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں عام ہوچکی ہے، اورجن کی وجہ سے دین کی صحیح فہم سے روز افزوں بعد ہوتا جارہا ہے''(۱)

(۱) تبصرے: ۶۸۹، مفتی تقی عثمانی صاحب، دارالسعادۃ، سہارنپور

فن منطق

علم منطق سے ادنی تعلق رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ یہ علم انسان کے لئے کس قدر ضروری ہیں اور ہر انسان اپنی زندگی میں اس سے کس قدر مستفید ہوتا رہتا ہے۔

''نفس ناطقہ'' جو قدرت کی طرف سے انسان کو ہی عطا کیا گیا ہے، وہ مفہوم و معانی اور مقاصد و مدعا کے اظہار نیز افہام و تفہیم کے لئے غور و فکر اور ضروری تصرفات کر کے موزوں الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، تصورات و تصدیقات میں غور و فکر کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچانا ''علم منطق'' کا خاص منشاء ہے۔

موجودات عالم خواہ ذہنی ہوں یا خارجی ہوں یا مادی ہوں یا غیر مادی، ارضی ہوں یا سماوی، نوری ہوں یا ناری، خلقی ہو یا معبودی تمام چیزوں کی جانکاری کا تعلق ''علم فلسفہ'' سے ہے، اس کی رہنمائی کے بغیر صحیح اعمال اور افعال کا صدور ممکن نہیں ہے۔(۱)

منطق کی ضرورت

ایک مفسر نے دعوی کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا ثبوت نہیں؛ بلکہ اس آیت سے اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت یہ ہے: ''فَشُدُّو الوِثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً''، اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے، ''إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ''، پس جب تم کفار کے مقابل ہو تو ان کی گردنیں مارو (قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خون ریزی کر چکو تو تم کو اختیار ہے بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔

اس آیت سے مفسر نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں

(۱) مبادیات منطق: ۳

مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (غلام بنانا) جائز نہیں، اس تقریر سے ایک عالم صاحب کو شبہ پڑ گیا، اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے یہ دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کون سا ہے؟ حملیہ؟ یا شرطیہ؟ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو؟

بس اتنی بات نے سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا، کیوں کہ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ یہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو (ان دونوں کا جمع کرنا) کہ فدیہ بھی ہو اور احسان بھی ہو ممتنع ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں، تیسری اور کوئی صورت ہو کیوں کہ ''مانعۃ الجمع'' کا یہی حکم ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا، اور دونوں کا ارتفاع ممکن ہوتا ہے، مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یوں کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو ناممکن ہے (کہ ایک شی آدمی بھی ہو اور درخت بھی) ہاں یہ ممکن ہے کہ نہ درخت ہو نہ آدمی؛ بلکہ کوئی تیسری چیز ہو گھوڑا بیل وغیرہ۔

اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ ''من'' (احسان) اور فدیہ کا جمع کرنا ممتنع ہے؛ البتہ دونوں سے خلو ممکن ہے تو اس سے غلامی کی نفی کیوں کر ہوئی؟ تو دیکھئے جو شخص مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو کی حقیقت کو نہ جانتا ہو وہ نہ اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

اس واقعہ سے منطق کی ضرورت معلوم ہو جاتی ہے۔(۱)

منطق کے چند مفید پہلو

ایک مرحلہ مسلمانوں کی فکری تاریخ اور علمی کیریئر میں ایسے پہلوؤں کی نشان دہی کرنا ہے، جو مختلف اسباب کی بناء پر آج کے تقاضوں کا سامنا کرنے سے قاصر ہے، اس غرض کے لئے ان تنقیدی پہلوؤں کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے، مثال کے طور پر ہمارے قدیم مفکرین نے فلاسفۂ یونان کے زیر اثر منطق کے جس اسلوب کو زیادہ فروغ دیا، وہ منطق کا

(۱) التبلیغ: ۲/ ۲۰۲، بحوالہ علوم وفنون اور نصاب تعلیم: ۹۸، مکتبہ ادارہ افادات

استخراجی اسلوب تھا، منطق کی بیش تر کتابیں جو فارابی اور ابن سینا جیسے عباقرہ کے زیر اثر لکھی گئیں، وہ سب کی سب منطق استخراجی کے اصول پر مرتب ہوئیں، متکلمین اسلام اور علماءِ اصول مثلا امام غزالیؒ، امام رازیؒ کی خالص دینی تحریروں (مثلا المستصفی اور المحصول) میں منطقی استخراجی اصول وقواعد سے ہی کام لیا گیا ہے، آج منطق استقرائی کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی ورثے کی ان تمام چیزوں کا ازسرنو جائزہ لیا جائے جہاں بنیادِ استدلال منطق استخراجی کے قواعد تھے اور کوشش کی جائے کہ ان دینی حقائق کو جو اس وقت ائمہ اسلام نے منطق استخراجی کی بنیاد پر ثابت کئے تھے، آج انہیں منطق استقرائی کی بناء پر ثابت کیا جائے۔(۱)

منطق کے پڑھنے کی حد

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: معقولات کا درس کم کرو، قطبی تک پڑھانے والا تھوڑی تنخواہ کا مدرس کافی ہے(۲)

بعض علماء کی غلطی یہ ہے کہ ساری عمر علوم غیر نافعہ میں صرف کردیتے ہیں یعنی صرف معقول ہی پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معقول آخرت میں کام آنیوالی نہیں ہے۔

ساری عمر علوم آلیہ منطق وغیرہ میں گنوانا اور اس کو مقصود بالذات سمجھنا سراسر حماقت ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے: کوئی شخص ساری عمر ہتھیار کی درستی وصفائی میں گذاردے اور ان سے کام ایک دن بھی نہ لے تو ہر شخص اس کو بے وقوف بتلائے گا۔(۳)

منطق اور حضرت گنگوہیؒ

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے مدرسہ دیوبند کے نصاب سے فلسفہ کی بعض کتابوں کو نام کی تعیین کے ساتھ خارج کرادیا تھا کیوں کہ حضرت ان کو مضر دین سمجھتے تھے،

---

(۱) محاضرات تعلیم: ۲۴۰ (۲) اصلاح الرسوم: ۱۵۴

(۳) اصلاح الرسوم والتبلیغ: ۲۰ / ۱۳۳، بحوالہ علوم وفنون: ۱۰۳

کسی نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اس کی شکایت کی کہ مولانا نے ان کتابوں کو حرام کردیا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت نے حرام نہیں کیا ہے، خود تمہاری طبیعتوں میں کجی ہے، اس لئے یہ کتابیں مضر دین ہوجاتی ہیں، ورنہ اگر طبیعت سلیم ہوتی تو یہ کتابیں بھی مضر دین ہونے کے بجائے معین دین ہوتیں۔(۱)

❁ فلسفہ کی ضرورت نہیں اور قطبی تک منطق بہت کافی ہے سلم وملاحسن کی بھی ضرورت نہیں۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کا یہی دل چاہتا ہے کہ موت کے وقت ''صدرا کی مثناۃ بالتکریر'' کی تقریر زبان سے نکلے؟ ہرگز نہیں، پس معلوم ہوا کہ یہ علم ضروری نہیں؛ بلکہ زائد از ضرورت ہے، لہٰذا قاعدہ مسلمہ ''الضرورۃ یتقدر بقدر الضرورۃ'' پر عمل فرما کر غیر مقصود میں اس قدر غلو نہ کیجئے؟

یہ مسلم ہے کہ پائخانہ ایک ضروری شئی ہے مگر آدمی بقدر ضرورت ہی پائخانہ میں رہتا ہے، یہ نہیں کہ پائخانہ کے ساتھ دلبستگی اور شیفتگی ہوجائے، اسی طرح جب فلسفہ وغیرہ آلات ہیں اور علوم دینیہ کے لئے مقدمات کے درجہ میں ان کی ضرورت ہے نہ کہ مقصودیت کے درجہ میں تو بقدر ضرورت ہی ان کا اکتساب اور شغل کیا جائے۔

البتہ منطق بہت ضروری اور مفید ہے؛ مگر رفع ضرورت کے لئے منطق میں قطبی تک ہی سمجھ کر پڑھ لو تو بہت ہے، ملاحسن اور حمد اللہ کی بھی کیا ضرورت؟ بلکہ ایک رسالہ بھی منطق کے لئے کافی ہے، جعل بسیط ومرکب منطق کا مسئلہ نہیں؛ بلکہ فلسفہ کا مسئلہ ہے مگر اس کی بحث خواہ مخواہ علم منطق اور کتب منطقیہ میں موجود ہے۔

اسی طرح اور بہت سے مسائل فلسفہ کے کتب میں ٹھونس رکھے ہیں، انہیں کے لئے مدرسین اور طلبہ بہت سے رسالے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں؛ حالانکہ فلسفہ ضرورت سے زیادہ یک شی ہے۔(۱)

---

(۱) الافاضات الیومیۃ: ۷۷۳، ۸۷۳، بحوالہ علوم وفنون: ۱۰۸

(۲) علوم العباد من علوم الرشاد، ملحقہ حقوق وفرائض بحوالہ علوم وفنون: ۱۰۲

❁ من جملہ ان رسوم کے ۔۔۔۔۔۔۔ طالب علموں کا بڑے بڑے عہدوں کے حاصل کرنے کے لئے باجود دین کے ضائع ہونے کے انگریزی پڑھنا یا معقول وفلسفہ میں دینیات سے زیادہ توغل (غلو) وانہماک کرنا ہے چوں کہ ان دونوں چیزوں کا ضرر رساں ہونا تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو چکا ہے، اس لئے داخل وعید قرآنی ہوکر واجب المنع ہیں۔

❁ معقولات کے غلو سے اکثر فساد عقیدہ اور نخوت وکبر اور دین میں لا پرواہی وغیرہ یہ خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

❁ البتہ اگر ان سب غوائل سے پاک ہوتو مضائقہ نہیں ؛ مگر قدر ضروری پر اکتفا کرنا واجب ہوگا۔(۱)

حضرت تھانویؒ اور منطق وفلسفہ

اگر علم دین کے ساتھ معقول (منطق) کو اس غرض سے پڑھا جائے کہ اس سے فہم واستدلال میں سہولت ہوجاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو، صرف وبلاغت ومعانی وغیرہ کا حکم ہے کہ یہ سب علوم آلیہ ہیں، اگر ان سے علم دین میں مدد لی جائے تو تبعا ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے۔(۲)

فرمایا: معقول (منطق) سے اگر اثبات دین اور فہم شرع میں کام لیا جائے تو پھر باغی اور تلبیس ابلیس مشقی ہے جیسے اگر کوئی پوچھے کہ اس کھانے میں کتنی لاگت لگی ہے، تو جہاں آٹا اور گھی میں دال کو شمار کرتے ہیں وہیں کھانے میں کی میزان میں لکڑیاں بھی شمار ہوتی ہیں، گو وہ دکھائی نہیں دیتیں اور کھائی بھی نہیں جاتیں، مگر کھانے کی خدمت کرتی ہیں اس لئے کھانے ہی میں ان کا شمار ہوتا ہے۔(۳)

---

(۱) اصلاح الرسوم:۱۰۶

(۲) التبلیغ:۲۱/۱۳۳، بحوالہ علوم وفنون:۱۰۰

(۳) ملفوظات اشرفیہ:۶۹، بحوالہ مذکور ۹

(۱) سوال: ایک شخص نے عرض کیا: فلسفہ کارآمد چیز ہے؟ اسی طرح منطق؟

جواب: فرمایا: ہاں عمق نظر اور دقت فکر اس سے پیدا ہوتی ہے۔

منطق وفلسفہ جس پر اعتقاد نہ ہو اور محض استعداد کے لئے پڑھایا جائے تو خدا کی نعمت ہے، ان سے دینیات میں بہت معاونت ومدد ملتی ہے، فلسفہ، سفہ (حماقت) سے تو اچھا ہے۔ (۱)

(۲) سوال: علم منطق کا سیکھنا حرام ہے؟ یا مباح؟ فرض ہے یا واجب یا مستحسن؟ اور اگر مباح ہے تو کس حد تک؟ اور سلّم اور اس کی شروحات کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: علم کی دو قسمیں ہیں: علم معقول، علم منقول:

علم منقول کی مثال ایسی ہے جیسے غذائیں جو کہ مقصود ہوتی ہیں اور علم معقول کی مثال ایسی ہے جیسے دوائیں جو ضروری ہوتی ہیں اس شخص کے لئے جو علم منقول کے ساتھ مشغول ہو۔

اور منطق کے بغیر استدلال میں غلطی کرنے سے اس کا ذہن محفوظ نہ ہو اور جب یہ ضروری ہے تو حسب ضرورت ہی اس کو اختیار کیا جائے گا اور ضرورت کی مقدار مختلف ذہنوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، جس مقدار سے بھی ضرورت مرتفع ہو جائے گی اتنی ہی مقدار ضروری ہوگی اور وہ شخص جس کو کوئی ضرورت نہ ہو اور نہ ہی اس سے کوئی ضرر ہو اس کے لئے منطق کی تعلیم مباح ہوگی اور وہ شخص جس کو اس سے ضرر ہو اس کے لئے مذموم ہوگی اور ضرر کے درجہ اعتبار سے اس کی مذمت کراہت اور حرمت کے درجات میں تفاوت ہوگا۔ (۲)

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ اور منطق وفلسفہ

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بزرگان دین نے اپنی زیادہ تر توجہ تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے ٹھیٹھ دینی علوم کی طرف رکھی ہے، کیوں کہ یہی علوم مقصود بالذات ہیں

(۱) ملفوظات اشرفیہ: ۶۹، و ۱۷۷، الافاضات الیومیۃ: ۲/ ۲۹۲، علوم وفنون۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰

(۲) امداد الفتاوی: ۴/ ۷۷، بحوالہ علوم وفنون۔۔۔۔۔ ۱۰۱، مولانا تھانویؒ

اور انہی سے دنیا وآخرت سے متعلق حقیقی عملی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، معقولات کا چونکہ یہ مقام نہیں ہے، اس لئے اس کو خصوصی توجہ کا مرکز نہیں بنایا، اس طرز عمل کی بناء پر ہندوستان کے بعض علمی حلقے جو معقولات کی ہی مہارت رکھتے تھے، مثلاً رامپور وغیرہ ان میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ شاید علماء دیوبند معقولات میں دسترس نہیں رکھتے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں، اس کے برخلاف ہے، اظہار کا موقع ہو تو حیران وششدر رہ جائیں۔

فلسفہ وعقلیات کی حقیقت اور اس کے ''پائے چوبیں) کی ناپائیداری حضرت والد صاحبؒ پر واضح تھی، لیکن جب کبھی آپ کے سامنے یہ تجویز پیش کی جاتی کہ معقولات کو درس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والد صاحبؒ اس کی سخت مخالفت فرماتے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں، اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل نکال دیا جائے تو اسلاف کی کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کی راہ مسدود ہو جاتی ہے، جو ہمارا گرانقدر علمی سرمایہ ہیں۔

اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم ذہن وفکر کو جلا دیتی ہے، اور آدمی ذہنی مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے مسائل کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ: اگر ان علوم کی اصل حقیقت کو ذہن نشیں کر کے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے اور پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی تو ان علوم کی تحصیل بھی عبادت ہے، اور درس نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے تو ان علوم کو داخل درس کیا تھا، ارو حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے: اگر نیت بخیر ہو تو ہمارے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں، دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں، اور دونوں کی خدمت موجب اجر ہے۔(۱)

حضرت باندویؒ اور منطق وفلسفہ

حضرت فرماتے تھے کہ منطق کی استعداد تو قطبی ہی تک بنتی ہے، جتنے مباحث

(۱) میرے والد میرے شیخ: ۷۳ تا ۳۹

اور تفصیل قطبی تک آجاتے ہیں، اگر ان کو کوئی اچھی طرح پڑھ لے تو اس کو پوری منطق آجائے، استعداد تو قطبی ہی سے بنتی ہے، سلم میں اسی کی تفصیل ہے، اور دوسرے انداز۔سے بیان کردہ ہے''۔

ایک مرتبہ قطبی کے درس میں حضرت نے طلباء سے ایک سوال کیا اور ان کی خاموشی پر فرمایا:

''تم کیسے بتلاؤ گے؟ تم کہتے ہو منطق کی ضرورت ہی نہیں، ارے اللہ کے بندو اس فن سے کسی کو مفر نہیں، مفسرین بھی اس فن سے مستغنی نہیں، محدثین بھی نہیں اور فقہاء بھی مستغنی نہیں۔

اور فرمایا: لوگوں کی بے حسی تو دیکھو کہ منطق کے اوراق سے استنجاء کا جواز نکالتے ہیں، ارے خدا کے بندو! اگر یہ دینی کتاب نہیں تو دینی کتابوں کے حصول کا آلہ وذریعہ بھی نہیں ہے؟ اس کے کاغذ کا تو احترام کرو، کیا اس پر آیات قرآنی نہیں لکھی جاسکتی؟ کیا اس پر حدیث نہیں لکھی جاتی، کیا اس پر مسائل نہیں لکھے جاتے، کیا یہ دین سے دوری نہیں ہے، اللہ ہی رحم فرمائے، کیا اکابرین نے منطق کی کتابیں نہیں پڑھائیں؟ پھر منطق سے اس قدر نفرت اور بے زاری کیوں؟، افسوس ہے انحطاط کا زمانہ آگیا ہے۔

اور ایک موقع پر فرمایا: فلسفہ کی تو واقعی کوئی ضرورت نہیں، میبذی وغیرہ سے کوئی فائدہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے، اس کے بجائے اگر سائنس کی چیزیں پڑھائی جائیں تو زیادہ بہتر ہے، منطق سے استعداد بنتی ہے، منطق کے ذریعہ سمجھنے وسمجھانے میں بڑی مدد ملتی ہے، اگر منطقی اصطلاحات سے پوری واقفیت ہو تو لمبی لمبی بحثوں کو منٹوں میں سمجھا جاسکتا ہے''۔(۱)

(۱) مآثر حضرت باندوی: ۹۵۔۹۶

مفتی تقی عثمانی صاحب اور منطق وفلسفہ

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

”نصاب سے متعلق ایک بات یہ ہے کہ منطق اور فلسفے کے متعلق بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ یونانی فلسفے کے زوال کے بعد ان مضامین کو پڑھانے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہی، لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بوجوہ درست نہیں، ان مضامین کی اہمیت کے لئے تنہا یہ بات بھی کافی ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ بالخصوص اصول فقہ، انہی علوم کی اصطلاحات اور منطقی انداز واسلوب پر مشتمل ہے، اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لئے منطق اور فلسفے کی واقفیت ضروری ہے، آج ”تفسیر کبیر“ جیسے دریائے علم سے استفادہ کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان منطق اور فلسفے کا علم رکھتا ہو؛ لہٰذا ان مضامین کا یکسر ختم کر دینا ہمارے نزدیک سخت نقصان دہ ہوگا؛ لیکن ان مضامین کو اسی حد تک پڑھانا چاہئے جس حد تک وہ اسلامی علوم کے لئے زینے کا کام دیں، ان کو ایک مستقل علم مقصود کے طور پر پڑھنے پڑھانے کا واقعی اب کوئی جواز نہیں؛ لہٰذا جہاں ان مضامین کی تعلیم مذکورہ ضروریات سے زائد ہو رہی ہو وہاں اس کو ضرورت کی حد تک محدود کر کے دوسرے مضامین کے لئے گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ فلسفہ میں عصریات اور فلکیات کے جو حصے اب تحقیق اور مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکے ہیں، ان کی غلطی پر تنبیہ کے ساتھ جدید تحقیقات پڑھانا ضروری ہے، جس کے لئے علامہ نجیب کی ”توفیق الرحمن“ علامہ آلوسی کی ”ما دلّ علیہ القرآن“ اور مولانا محمد موسیٰ صاحب کی ”جدید فلکیات“ سے مدد لی جاسکتی ہے“۔(۱)

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۱۰۵

ابن الحسن عباسی اور منطق وفلسفہ

دینی مدارس کے نصاب کی دوسری خامی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس نصاب میں عمر کا ایک معتدہ حصہ ان علوم میں لگایا جاتا ہے، جن کی حیثیت عصر حاضر میں آثار قدیمہ سے زیادہ نہیں، اس سلسلہ میں میں منطق، فلسفہ، قدیم علم ہیئت اور قدیم علم کلام کی بعض کتابوں کا نام لیا جاتا ہے۔

منطق کے سلسلے میں تو ابتداء ہی سے علماء کی دو مختلف جماعتیں رہی ہیں، علماء کے ایک طبقہ نے منطق کی اہمیت وضرورت بیان کرنے میں یہاں تک غلو کیا کہ اسے فرض عین قرار دیا (۱) منطق کے متعلق امام غزالیؒ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ ''من لم یعرف المنطق فلا ثقة له فی العلوم أصلا''، یعنی جو منطق نہیں جانتا، اسے علوم کی پختگی ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔

لیکن صاحب نظر علماء کی ایک بڑی جماعت شروع ہی سے منطق کی کڑی تنقید کرتی رہی ہے، اس جماعت کا خیال ہے کہ منطق درحقیقت اہل یونان کی طرف سے مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی ترقی کی راہیں مسدود کرنے کی ایک سازش ہے، جس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے مامون الرشید نے جب اہل یونان سے عربی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے منطق وفلسفہ کی کتابیں طلب کیں تو یونان کے حاکم نے اپنی سلطنت کے اصحاب رائے سے مشورہ کیا، ان سب نے مسلمانوں کو ان علوم کی کتابیں دینے کی یہ کہہ کر سفارش کی کہ ان سے مسلمانوں کے دین میں رخنہ پڑے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

> ''میں نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ مامون الرشید عباسی سے درگزر فرمائیں گے، میرا خیال ہے کہ اس کو اس بات کی ضرور سزا ملے گی کہ اس نے امت مسلمہ کو منطق وفلسفہ میں مبتلا کیا'' (۲)

---

(۱) دیکھے کشف الظنون: ۲/ ۱۸۵۲

(۲) کشف الظنون: ۲/ ۱۸۶۳

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس منطق کے رد پر مستقل رسالہ بنام "الرد علی المنطقیین" لکھا ہے۔

درس نظامی میں منطق کی تعلیم کی عام طور پر دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ منطق ذہنی ریاضت اور دماغی قوتوں کے نکھارنے کا ایک علمی ذریعہ ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ علمائے اسلام کے بعض گرانقدر کتابوں میں منطقی اصطلاحات کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ منطق اور اس کے اسلوب سے واقفیت کے بغیر یہ کتابیں سمجھ میں نہیں آتیں، اول الذکر توجیہ تو کوئی معنی نہیں رکھتی، البتہ دوسری توجیہ معقول ہے کہ بلاشبہ امام رازیؒ اور امام غزالیؒ جیسی یگانہ روزگار شخصیات کی بعض کتابوں سے بھرپور استفادہ کے لئے منطق کی اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے، اصطلاحات کی واقفیت کی حد تک منطق نصاب تعلیم میں ضرور داخل ہونی چاہئے، اور الحمد للہ عام مدارس میں اس کا طویل سلسلہ کم کر دیا گیا تاہم شرح تہذیب اور "سلم" اب بھی کھٹکتی ہے۔

قدیم فلسفہ کی بھی کتابیں تمام نکال دی گئیں ہیں سوائے میبذی کے کہ اس کے عنصریات کا کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے، اکابر علمائے دیوبند میں کئی حضرات ابتداء ہی سے فلسفہ اور منطق سے متنفر رہے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق مولانا عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں:

> "اسی طرح منطق وفلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں، بار بار فرمایا کرتے تھم کہ اس منطق وفلسفہ سے انگریزی بہتر کہ اس سے دنیا کی نفع کی امید تو ہے" (۱)

آسان منطق

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ العالی

(۱) تذکرۃ الرشید: ۲۲۳، دینی مدارس کی ضرورت واہمیت: ۱۰۱-۱۰۲، مکتبہ طیبہ دیوبند

فرماتے ہیں:

''پون صدی پہلے ایک چھوٹا سا رسالہ بابرکت لکھا گیا جس کا نام ''تیسیر المنطق'' ہے، یہ رسالہ جناب مولانا حافظ محمد عبد اللہ صاحب گنگوہی قدس سرہ کی تصنیف ہے، اس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے حاشیہ لکھا ہے، جس کا نام ''تیسر المنطق'' ہے، پھر مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی نے بھی اس پر حاشیہ تحریر فرمایا جس کا نام ''تیسیر المنطق'' رکھا، نیز اس رسالہ کے لئے یہ بات بھی قابل فخر ہے کہ حضرت اقدس مولانا صدیق احمد صاحب انبھٹوی قدس سرہ (خلیفہ اجل حضرت گنگوہیؒ) نے اس کی نوک و پلک درست کی ہے اور اس پر تقریظ تحریر فرمائی جس میں آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ:

''ظاہر ہے کہ منطق ایک مشکل علم ہے، خصوصا طلبہ کو اول شروع میں مسائل منطقیہ سمجھنے میں بہت ہی دشواری ہوتی ہے؛ بلکہ احقر کا خیال ہے کہ اول چند رسائل میں طلبہ سمجھتے ہی نہیں، یا کم سمجھتے ہیں، اب سے تیس چالیس سال ہوئے جو طلبہ میں فارسی کی استعداد عمدہ ہوتی تھی اور فارسی پڑھے ہوئے طلبہ مدارس عربی میں آتے تھے تو بوجہ استعداد فارسی کچھ سمجھ جاتے تھے، اب سالہا سال سے طلبہ عربیہ ایسے آتے ہیں جن میں استعداد فارسی نہیں ہوتی، پس مولوی صاحب موصوف نے نہایت احسان اس زمانہ کے طلبہ پر فرمایا جو اردو کی سلیس عبارت میں مسائل منطقیہ کو واضح فرمایا ہے''۔

حضرت انبھٹویؒ نے یہ تحریر ۱۳۳۸ھ میں آج سے ننانوے۔سال پہلے لکھی ہے اور اب تو کایا ہی پلٹ گئی ہے، بات کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے، حال زبوں تر ہو گیا ہے، اس

لئے اب اس رسالہ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

۱۰۰ سو سال کے اس طویل عرصہ میں زبان اور انداز بیان میں بھی تبدیلی آئی ہے، اور استعدادیں بھی مزید کم زور ہوگئی ہیں، اس لئے اب طلبہ کو اردو کا یہ رسالہ بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، میں نے کئی بار یہ مبارک رسالہ اپنے بچوں کو پڑھایا ہے اور ہر بار یہ خیال تھا کہ اس کی ترتیب ضروری ہے، چند باتیں:

۱) بعض اسباق میں درازنفسی ہے، ان میں بچوں کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ کیا یاد کریں؟ ساری عبارت یاد کریں تو کہاں تک کریں؟ اور خلاصہ کریں تو کس طرح کریں؟ اس کا حل یہ ہے کہ بچوں کو عبارت پر نشان لگا کر دیں کہ اتنے الفاظ یاد کرلو باقی مفہوم کو یاد کرلو۔

۲) بعض اسباق میں طول ہے، وہ ایک دن میں نہیں پڑھائے جاسکتے، ان کو بیچ میں روکنا ضروری ہے، مگر کہاں روکا جائے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

۳) زبان قدیم ہوگئی ہے اسوجہ سے طلبہ کو فہم میں دشواری پیش آتی ہے۔

مگر بایں ہمہ کتاب کا نعم البدل تو کیا بدل بھی بازار میں نہیں آیا ہے، نئی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اپنی افادیت کے باوجود تیسیر المنطق کا بدل نہیں بن سکتی ہیں، البتہ ایک نوجوان فاضل محمد زاہد صاحب مظاہری نے ''تبیین المنطق'' کے نام سے ''تیسیر المنطق'' کی شرح لکھی ہے، جو طلبہ اور اساتذہ کے لئے خاصہ کی چیز ہے، مگر وہ بہر حال شرح ہے، درسی کتاب نہیں ہے اس لئے اس رسالہ کو مرتب کیا ہوں۔

اب اساتذہ کرام سے گذارش ہے کہ وہ بچوں کو کتاب سمجھا کر پڑھائیں؛ مگر لمبی تقریریں نہ کریں، مثالیں پڑھائیں اور مسئلہ ذہن نشیں کرائیں، اور بچوں کو چاہئے کہ وہ کتاب خوب یاد کریں، کم از کم ہر اصطلاح کی جو تعریف ہے وہ بلفظہ یاد کریں، مثال کی عبارت یاد نہ کریں، صرف مفہوم یاد کرلیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔(۱)

(۱) آسان منطق اقتباس از تقریظ کتاب:۸

تیسیر المنطق، مرقات

ان کتابوں کا مقصد منطق کی اصطلاحات یاد کرانا ہے، اسی نقطہ نظر سے ان کو پڑھانا چاہئے، ہمارے دور میں طلبہ منطق کو ایک خشک اور مشکل مضمون سمجھتے ہیں اور اس سے کسی کو دلچسپی پیدا نہیں کرتے، اس عدم دلچسپی کی بناء پر وہ پہلے ہی قدم پر منطق سے برگشتہ ہوجاتے ہیں، اور آگے کئی کتابوں میں بھی ان کی استعداد کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

لہٰذا تیسیر المنطق اور مرقات کے استاذ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کی اس غلط فہمی کو دور کرکے ان کے ذہنوں میں اس علم کو دلچسپ بنا کر پیش کرے، منطق کی اصطلاحات کو روز مرہ کی زندگی کی مثالوں سے سمجھا کر انہیں یہ بتائے کہ یہ کوئی مافوق الفطرت علم نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کے حقائق کا صحیح ادراک کرنے کے لئے اس کی کتنی ضرورت ہے، اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ استاذ صرف کتاب میں بیان کی ہوئی مثالوں پر اکتفانہ کرے؛ بلکہ اپنی طرف سے آسان مثالیں سوچ کر بتائے۔

فن معانی وبلاغت

معانی وبلاغت میں علامہ تفتازانی کی لکھی ہوئی ''تلخیص المفتاح'' کی شروح ''مختصر المعانی'' اور ''مطول'' داخل نصاب ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس فن کی تعلیم کے لئے بالکل ناکافی ہیں، متن، شرح اور حاشیہ کے انداز سے عصری ذوق بیگانہ ہورہا ہے، درسی نصاب میں معتد بہ فائدہ کے لئے کم از کم فن کی پہلی کتاب صرف اور صرف اصطلاحات وامثلہ پر مشتمل ہونی چاہئے، جس کے لئے ''دروس البلاغة'' اور ''البلاغة الواضحه'' مفید تر کتابیں ہیں ''مختصر المعانی'' اور ''مطول'' عالم اسلام کے علمی دور انحطاط میں لکھی گئی گئی ان کتابوں میں سے ہیں جن میں لفظی موشگافیوں اور عبارتی تعقیدات کو نقطہ کمال سمجھا گیا، بے شک ذہن کی جلا، دقت نظر اور تدقق کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے یہ موزوں ترین ہوں؛ لیکن فن کی اصطلاحات ومباحث میں ان سے بصیرت حاصل نہیں ہوسکتی، بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

> ''علامہ تفتازانی کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے، انہوں نے جو متن وشرح لکھی وہ ان کی زندگی میں بہت مقبول تھے، علامہ تفتازانی کی کتابوں کی مقبولیت اس زمانہ میں اس لئے ہونے لگی تھی کہ اسلامی علوم کا دماغی تنزل شروع ہو چکا تھا، اور ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا، ان کتابوں سے بجائے اس کے کہ آگے چل کر ترقی کے دروازے کھلے ہوں، ایک حد تک نقصان پہنچا، یہ بھی میرا عقیدہ ہے ادب عربی اور عربی بلاغت کو مطول نے سخت نقصان پہنچایا''(۱)

(۱) خطبات آزاد: ۳۵۴، دینی مدارس ضرورت واہمیت: ۹۸، ابن الحسن عباسی، مکتبہ طیبہ دیوبند

فن فقہ

فقہ کی تعلیم تو ابتدائی درجات سے اردو یا مادری زبان میں شروع ہوجاتی ہے، فقہ کے معنی سمجھنے کے ہیں؛ لہٰذا ہر سبق سمجھا کر پڑھائے۔

- جو چیزیں گنتے میں آتی ہیں ان کو رٹا دیں، اوران کو زبانی لکھنا سکھادیں اوران کو ایکشن کے ساتھ بتانا سکھائیں۔
- تمام اعمال مثلا فرائض وواجبات طلبہ کو مستحضر ہوں، سنتیں بھی یاد ہوں۔
- یہ چیزیں صرف درجہ میں پڑھانے سے یاد نہیں ہوتیں؛ بلکہ خارجی اوقات میں اس کا مذاکرہ وتکرار اور مشق ضروری ہے، ساتھ ہی ساتھ عملی مشق کراتے رہے۔
- اگر بچپن میں غلط عادات پڑ جائیں تو بڑے ہونے کے بعد علم کے باوجود عالم بھی صحیح طریقہ سے نماز کی سنتیں انجام نہیں دے سکتا۔
- مثلا وضو سکھانا ہو تو پہلے استاذ پانی لے کر وضو کر کے دکھائے، پھر ایک یا دو بچوں کو بلا کر وضو کروائے، پھر سب سے ایک ساتھ وضو کرائے، پھر سوال جواب کے ذریعہ وضو کے فرائض، سنتیں، نواقض وضو وغیرہ سب کچھ طلبہ کو یاد کرائے؛ بلکہ ذہن نشیں کرائیں؛ کیوں کہ یہ چیزیں زندگی بھر کام میں آنے والی ہیں۔
- پھر وضو کرتے وقت طلبہ کی نگرانی کرے کہ سنت طریقہ پر تمام طلبہ وضو کررہے ہیں یا نہیں؟
- سبق پیش کرنے کا اندازا اپنے مطالعہ سے طئے کرے۔
- سبق کو دلچسپ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرے۔

❁ اسی طرح جب نماز کا باب آئے مندرجہ ذیل گیارہ طریقوں پر نماز کی عملی مشق کرائے:

۱) کسی طالب علم کو کھڑا کرے اور اس سے مکمل نماز پڑھوائے اور اس سے تمام اذکار اور نیت بلند آواز سے کہلوائے اور غلطیوں کی اصلاح کرے یا بچوں سے اصلاح کروائے، اگر فرض نماز کی نیت کی ہو تو اقامت بھی کہلوائے۔

۲) جب طلبہ نفل نماز میں مشغول ہوں تو ان کی نگرانی کرتے ہوئے نماز کی تصحیح کرائے۔

۳) معلم کھڑے ہو کر بتائے کہ رفع یدین، قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ وغیرہ کا طریقہ یہ ہے اور اسی طرح طلبہ کو نماز پڑھائے۔

۴) ایک طالب علم تمام طلبہ کو اس طرح نماز پڑھائے کہ پہلے وہ بلند آواز سے اذکار پڑھائے اور تمام طلبہ اس کے بعد پڑھیں۔

اسی طرح سنت نفل دو رکعت اور چار رکعت اور وتر تین رکعت، نماز جنازہ، نماز عیدین، سجدہ تلاوت اور سجدہ سہو کی مشق کرائے، یہ ابتدائی اور چھوٹے طلبہ کے لئے مفید ہے۔

۵) تمام طلبہ کو صف بنا کر کھڑا کر کے ہر صف میں سے دو ایسے افراد کو کھڑا کر دے جو اصلاح کرنے والے ہوں اور خود استاذ یا طالب علم کو سامنے کھڑا کر کے پہلے سامنے والا آدمی کرے، پھر تمام طلبہ اس کے بعد اس کی پیروی کریں، اس طرح پوری نماز کی مشق کرائے۔

۶) تمام طلبہ کو صفوں میں کھڑا کرے اور ایک طالب علم کو بطور امام کھڑا کرے پھر نماز کی عملی مشق کرتے ہوئے ہر ہیئت کا صرف نام بتائے مثلاً اس کو تکبیر تحریمہ، قیام، قومہ ، جلسہ قعدہ اولی وقعدہ اخیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔

۷) مکمل نماز بلا ترجمہ صحیح ہونے کے بعد پھر مکمل نماز مع ترجمہ سکھائے۔

۸) وضو کا مختصر طریقہ فرض نماز کا مختصر طریقہ اور نماز جنازہ کا مختصر طریقہ بھی الگ سے

سکھائے۔

۹) جماعت میں کھڑے ہونے کا طریقہ الگ سے سکھائیں مثلا دائیں بائیں برابر ہوں۔

۱۰) لیٹ کر اور بیٹھ کر نیز مریض کے نماز پڑھنے کا طریقہ سکھائے۔

۱۱) ہندوستان کے اکثر علاقوں میں طلبہ ثنا پڑھتے وقت لفظ ''ثنا'' بول کر پھر ثنا پڑھتے ہیں، اس غلطی کی خاص طور پر اصلاح کرے یا ثنا کا نام ''سبحانك اللهم'' رکھ دے۔

❁ سوالات کو مختصر کر کے یاد کرائے، عربی کتابیں، بڑی عربی کتابیں جیسے مختصر القدوری، شرح وقایہ، کنز الدقائق ہدایہ وغیرہ کتابیں شروع ہونے پر طالب علم عبارت پڑھے اور طالب علم ہی تشریح کرے اور اس کی کمی استاذ پوری کرے، پھر طالب علم ہی ترجمہ کرے، اگر کوئی طالب علم تشریح نہ کر سکے تو استاذ تشریح کرے۔

اس طرح پڑھانے پر کتاب کا پاؤ حصہ گذرنے کے بعد طالب علم میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بقیہ کتاب خود حل کر سکتا ہے۔(۱)

اس وقت ہمارے مدارس میں فقہ کا جو نصاب تعلیم ہے وہی ہمارا موضوع ہے اور نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم دونوں پہلوؤں سے دو چار باتیں ضروری ہیں۔

❁ فقہ کے فن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک فقہ، دوسرے اصول فقہ اور تیسرے قواعد فقہ۔

❁ فقہ میں علامہ ابوالحسن مرغینانی کی ''ہدایہ'' ایک بے نظیر کتاب ہے، مرغینانی نے امام قدوری کی مختصر اور امام محمد کی جامع الصغیر دونوں کو ملا کر فقہ کا نہایت جامع متن تیار کیا اور پھر اس کی نہایت طویل ومبسوط شرح ''کفایۃ المنتہی'' کے نام سے لکھی، پھر اس کی نہایت جامع اور ''قلّ مادلّ'' کا مصداق تلخیص ''ہدایہ'' کے نام سے لکھی، جو اہل

---

(۱) مدرسہ تعلیم سے تعمیر تک ۳۹، ۴۵، مؤلف: مولانا ایوب صاحب ندوی، مکتبہ فرید

علم اور ارباب ذوق دونوں کے لئے صدیوں سے چشم عقیدت کا سرمہ ہے، مصنف کو بعضوں نے ''مجتہد فی المذہب'' قرار دیا ہے اور بعضوں نے ''اصحاب ترجیح'' کے زمرہ میں شمار کیا ہے، واقعہ ہے کہ مصنف کو مجتہد فی المذہب قرار دینا قرین انصاف ہے، مسائل کے احاطہ، منقول و معقول دلائل کے انتخاب، طرز استدلال کی قوت اور ایجاز میں اسکا جواب نہیں۔

❁ اس کتاب کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہ اپنے قارئین کو غور و فکر کا ایک نہج عطا کرتی ہے، اور استنباط اور استنتاج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

اگر یہ بہ تقاضۂ بشریت اس میں یہ کمزوری نہیں ہوتی کہ احادیث سے استدلال میں صحیح روایات کے ساتھ بہت سی سقیم بھی آ گئی ہیں جس کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو کہنا پڑا:

> ''مصنف دے در اکثر بناء کار بر دلیل معقول نہادۃ و اگر حدیث آوردہ نزد محدثین خالی از ضعفے نہ غالبا اشتغال گوں اسناد در علم حدیث کم تر بودہ است''۔(۱)

تو شاید فقہ اسلامی کے پورے ذخیرہ میں اس کے مماثل ہی نہیں؛ بلکہ اس سے قریبی درجہ پانے کی بھی کوئی اور کتاب مستحق نہیں ہوتی۔

❁ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں اس کتاب کا جگہ پانا ''حق بہ حقدار رسید'' کے مصداق ہے؛ مگر صورت حال یہ ہے کہ ہدایہ کے چار حصوں میں عملاً صرف پہلا حصہ ہی مکمل ہو پاتا ہے، جو عبادات پر مشتمل ہے، اور جس کی بحثیں مختلف کتب فقہ کے علاوہ حدیث میں بھی بکثرت و تکرار کے ساتھ آتی رہتی ہیں، ہدایہ کی بقیہ جلدیں جو معاشرتی احکام، بین ممالک قوانین اور اقتصادی قوانین سے متعلق ہیں تشنہ تکمیل رہتی ہیں۔

(۱) شرح سفر السعادۃ: ۱۲۳

یہ وہ مسائل ہیں جن میں احکام کی بنیاد نصوص سے زیادہ قیاس اور عرف و مصلحت پر ہے، ان سے طلبہ کا نا آشنارہ جانا زندگی کے مختلف گوشوں میں اسلامی تعلیمات و ہدایات سے ان کی محرومی کے ہم معنی ہے۔

اس لئے اس حقیر کا خیال ہے کہ دو سال میں چار کے بجائے پانچ گھنٹوں میں اگر یہ کتاب مکمل کر دی جائے تو طلبۂ فقہ پر احسان عظیم ہوگا۔(۱)

❁ ہمارے نصاب میں اس سلسلہ کی دوسری کتاب ''المختصر القدوری'' پڑھائی جاتی ہے ،اس کے مصنف امام ابوالحسین احمد بن محمد قدوری ہیں جو پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں، قدوری مسائل کے احاطہ وانتخاب، تعبیر کی سلاست و وضاحت، استناد کے اعتبار سے تثبت و احتیاط، نیز حسن ترتیب میں نہایت اعلی درجہ کی تالیف ہے، اور فقہی متون میں اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔

یہ کتاب عربی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں پڑھائی جاتی ہے اور غالبا اکثر مدارس میں یہ بھی تشنہ تکمیل ہی رہتی ہے؛ اس لئے اگر یہ کتاب مکمل کر دی جائے تو طلبۂ فقہ پر احسان عظیم ہوگا۔

❁ ان دو کتابوں کے علاوہ تین اور کتابیں اس موضوع پر داخل درس ہیں، ابتدائی جماعت میں ''نورالایضاح'' ہے اس کا موضوع عبادات یعنی ارکان اربعہ ہیں، شرنبلالی کو فقہاء میں وہ درجہ نہیں دیا گیا ہے جو مرغینانی اور قدوری نے پایا ہے، اور اس کی مثال خود یہ کتاب ہے جس میں سنن وآداب وغیرہ کے نقل کرنے میں جا بجا تسامح ہوا ہے، عبارت میں بھی وہ سلاست و برجستگی نہیں ملتی جو امام قدوری کے متن میں ہے۔

اور نصابی نقطہ نظر سے سب سے قابل توجہ یہ ہے کہ کتاب کی ابتداء ہی میں غسل واستنجاء وغیرہ کے مسائل میں ایسی وضاحت کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو کم سن اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے والے طلبہ کے سادہ ذہن کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

(۱) ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ کی تدریس مناہج اور طریقے: ۲۲۶، ایفا پبلیکیشنز

❁ دوسری کتاب ’’کنز الدقائق‘‘ ہے، ابو البرکات نسفی (۱۰۷ھ) نے حنفیہ کی مستند آراء پر مشتمل نہایت جامع متن اس کتاب کی صورت میں مرتب فرمایا ہے خود نسفیؒ نے اس کو ظاہر روایت سے ثابت شدہ احکام کا مجموعہ بتایا ہے، ’’لانہ موضوع لظاہر الروایۃ۔۔ ‘‘(۱) علامہ نسفی کے علمی مقام ومرتبہ کی شاید تفسیر میں ’’مدارک التنزیل‘‘ اور اصول میں ’’المنار‘‘ ہیں کہ ان کو جو شہرت عام اور نقش دوام اپنے فن میں حاصل ہوا اس کی مثال کم ہی مل پاتی ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ اس دور وسطی کی تالیف ہے جب فن پر توجہ دینے اور اس میں اضافہ کرنے کے بجائے ایسی تحریروں کا رواج پڑ گیا تھا جس میں مختصر سے مختصر عبارت میں بیش از بیش معانی کو سمیٹ لیا جائے، خواہ الفاظ وعبارت کی اس کفایت کے نتیجے میں قارئین کا وقت کتنا بھی صرف ہو جائے اور ایک ایک سطر کی عقد کشائی میں بے چارے شارحین کے صفحات بھی کافی نہ ہو پائیں۔

افسوس کہ خود ’’کنز الدقائق‘‘ بھی اسی مزاج کی کتاب ہے اور اس کے اختصار نے حد ایجاز کو پار کر کے اغلاق کی صورت اختیار کر لی ہے۔

❁ تیسری کتاب تاج الشریعۃ محمود کے فقہی متن ’’وقایہ‘‘ پر ان کے پوتے صدر الشریعۃ الاصغر عبد اللہ بن مسعود (م ۷۴۷ھ) کی مفصل شرح ہے جو ’’شرح وقایہ‘‘ کے نام سے معروف ومتداول ہے، شرح وقایہ کو فتاوی وغیرہ میں ’’ہدایہ‘‘ و’’قدوری‘‘ اور ’’کنز‘‘ کا سا استناد حاصل نہیں، بہت سے مقامات پر طول بیان ہے اور دراز نفسی کا احساس ہوتا ہے اور اس کے بعض مقامات پر مزید الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

❁ یہ دو کتابیں ایسی ہیں کہ ان کا متبادل موجود ہے، ’’شرح وقایہ‘‘ کی جگہ ملا علی قاری کی ’’شرح نقایہ‘‘ بڑی عمدہ چیز ہے، ملا علی قاری بلند پایہ محدث ہیں اور جب کسی مصنف: ذوق میں حدیث وفقہ کا ’’قران السعیدین‘‘ ہو جائے تو اس کی آب

(۱) البحر الرائق: ۲۳۲/۷، زکریا

وتاب ہی اور ہوتی ہے، میں نے سنا کہ شیخ الأدب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی رائے بھی یہی تھی، بہتر ہوگا کہ شرح وقایہ کی جگہ اس کتاب کو شریک نصاب کیا جائے۔

نور الایضاح کی جگہ مولانا شفیق الرحمن ندویؒ نے ''الفقہ المیسر'' کے نام سے اس سن وسال کے طلباء کے لئے بڑی اچھی چیز تیار کردی ہے، زبان سہل ہے، چھوٹے فقرے ہیں، تراکیب بھی آسان ہیں، مسائل وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، ترتیب بھی اچھی ہے، ان مسائل سے صرف نظر کیا گیا ہے جن کی ابھی ان طلبہ کو ضرورت نہیں، ساتھ ہی نئے طریقہ پر ''تمرینات'' بھی قائم کردی گئی ہیں۔

ضرورت ہے کہ دینی مدارس اسے قبول کریں؛ مگر افسوس کہ بعض دفعہ گروہی حد بندیاں اور تنگ دامنیاں اعتراف وتسلیم میں رکاوٹ ہوجاتی ہیں وإلی اللہ المشتکی۔(۱)

بعض حضرات نے یہ رائے دی ہے کہ عبادات کے ابواب کیوں کر تین سال تک بار بار پڑھائے جاتے رہیں، نور الایضاح، قدوری اور شرح وقایہ میں بار بار یہ مسائل آجاتے ہیں، اس لئے اب اگر ہدایہ جلد اول کے بجائے شیخ وہبہ زحیلی کی ''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' کے وہ ابواب پڑھائے جائیں جو معاملات سے متعلق ہیں، یا ہدایہ کی جلد اول کے سوا باقی تین جلدیں مکمل پڑھادی جائیں خاص طور پر آخری دو جلدوں کے تمام ابواب کی تدریس کا اہتمام ہونا چاہئے، بلا شبہ یہ کتاب اپنے استدلالی طرز بیان اور مختلف مسالک کے درمیان تقابل اور محاکمے میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، مصنف کتاب علامہ ابوالحسن علی مرغینانی نے قدوری اور الجامع الصغیر کو بنیاد بنا کر بدایۃ المبتدی کے نام سے ایک کتاب لکھی، پھر اس کتاب کی مبسوط شرح تیار کی، بعض کتابوں میں اس شرح کی جلدوں کی تعداد اسی بیان کی گئی ہے، پھر اس کا اختصار کیا جو ہدایہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی پہلی جلد عبادات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں نکاح وطلاق اور عتاق وغیرہ کا بیان ہے، تیسری میں بیوع وغیرہ کے

(۱) دینی وعصری درسگاہیں تعلیمی مسائل: ۹۸، ۱۱۰، مؤلف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ابواب ہیں، چوتھی جلد میں شفعہ وغیرہ کے ابواب ہیں، عموما تمام جلدوں کے ابتدائی ابواب بڑی آہستہ روی کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں، اور سال کا بڑا حصہ ابتدائی ابواب ہی کی نذر ہو جاتا ہے، مقدار نصاب تک پہنچنے کی جلدی تیز گامی کا تقاضا کرتی ہے، ان حالات میں معاملات کے بعض اہم ابواب یا تو سرسری طور پر پڑھائے جاتے ہیں یا بالکل نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں، کیا بیوع، قرض، رہن، مساقات، مزارعہ، اجارہ، حوالہ، وکالہ، عاریۃ، ودیعت، غصب، لقیط، جعالہ، شرکہ، ہبہ، حجر، وصایا فرائض، اوقاف وغیرہ فقہ کا حصہ نہیں ہیں، اور کیا ان ابواب میں بصیرت حاصل کئے بغیر کوئی عالم صحیح معنی میں فقیہ کہلانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکے طریقہ تدریس میں بھی بنیادی تبدیلی لائی جائے۔(۱)

فقہی مذاہب کا تقابلی مطالعہ

تقابلی مطالعہ و بحث کا ذوق واقعہ ہے کہ دوسرے اہل فن کے مقابلہ میں فقہاء کے ہاں زیادہ ہے، اہل سنت کے چاروں دبستانِ فقہ پر متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، قدیم علماء نے بھی لکھی ہیں اور ماضی قریب میں بھی بعض اہل علم نے اس پر بڑا قیمتی کام کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ پر ایک ایسی کتاب بھی شریک نصاب ہو جو مختلف فقہی آراء کا معروضی اور غیر جانبدار مطالعہ کراتی ہو، اس سے نگاہ میں وسعت اور فکر و خیال میں فراخی پیدا ہوگی، اور نقد و تحقیق کی صلاحیت ابھرے گی، اس سلسلہ میں ابن رشد قرطبی کی ''بدایۃ المجتہد'' کی عظمت شان اور قدر و قیمت سے کون انکار کریگا؟ پوری کتاب نہ سہی کچھ ابواب ہی پڑھا دیئے جائیں تو مسائل میں فقہی جزئیات پر قناعت کے بجائے ان کی بنیاد و اساس کو سامنے رکھ کر سوچنے کا ذوق پیدا ہوگا۔(۲)

فن فقہ کا طریقہ تعلیم

مسئلہ کتاب سے زیادہ کتاب پڑھانے کے اسلوب و نہج کا ہے، اساتذہ کا ذوق

(۱) حسن تدبیر: مدارس نمبر: ۲۸۵، فروری: ۲۰۱۱

(۲) حوالہ مذکورہ: ۱۰۰

اوران کی محنت اصل میں طلبہ کے ذہن وفکر کی تعمیر کرتی ہے، ذوق کو پروان چڑھاتی اور آتش شوق کو سلگاتی اور بھڑکاتی ہے، فقہ کی تعلیم میں دو بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ کتاب اور مسائل کے حل میں طلبہ کو شریک کیا جائے، کتاب کی عبارت ان سے حل کرائی جائے۔

- گاہے گاہے دلائل پر ان کو بحث کا موقع دیا جائے، ان سے کہا جائے کہ اس پر تنقیدی نظر سے غور کریں۔
- استحسانی مسائل میں خود طلبہ سے یہ بات نکلوائی جائے کہ اس سلسلہ میں قیاس جلی اور قیاس خفی کیا ہے اور وجہ استحسان کیا ہے؟ اس سے ان میں نقل وروایت کے بجائے مسائل کی روح پر غور کرے اور سوچنے کا ذوق پیدا ہوگا۔

دوسری اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اس دور میں جو مسائل پیدا ہورہے ہیں، وہ بالعموم فقہاء کے قدیم اجتہادات سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے ہیں، تو جہاں ایسے مسائل آئیں جن سے موجودہ زمانہ کے کسی نو پید مسئلہ کا تعلق ہو، وہاں خصوصی اہتمام اور شرح وبسط کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالیں جیسے: ربا کے تحت بینک انٹرسٹ کا، قمار کے تحت انشورنس کا، بیع کے تحت زمانہ کی بیع کی بہت سی نت نئی شکلوں کا۔

- جہاد وسیر کے ابواب میں ہندوستان کی شرعی حیثیت کا۔
- بیع صرف کے ذیل میں زر کی حقیقت اور زر اصطلاحی اور فی زمانہ مروج کرنسی نوٹوں کا۔

اگر اس بیدار مغزی اور چوکسی کے ساتھ تعلیم دی جائے تو طلبہ مسائل عصریہ سے بے بہرہ نہ رہ جائیں گے، مگر ہر مدرس سے اس کی توقع رکھنا مشکل ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مدرسین کے لئے ایک ایسی ''کلید'' مرتب کی جائے جو ان کی رہنمائی کرتی ہو کہ ان کو نصابی کتاب کے کس مسئلہ کے ذیل میں کن نئے مسائل پر بحث کرنی ہے؟ ممکن ہے اس طرح اس دشواری کا حل نکل سکے۔

ہمارے موجودہ طرز تدریس میں علوم شرعیہ میں مختلف فنون کی تعلیم کے لئے یکساں

انداز اختیار کیا جاتا ہے، مثلا حدیث کے درس اور فقہ کے درس میں کوئی اجنبی شخص بیٹھے تو کم ہی فرق کر پائے، فقہ کے درس کا بھی یہی حال ہے ابواب وفصول کے درمیان باہمی ارتباط کی بحث، مصنف سے کہیں تسامح ہو گیا ہے تو اس کے لئے بہ ہزار تکلف تاویل وتوجیہ۔۔۔۔۔ اس طرح کی بحثوں کی بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہی باب کو پڑھانے سے پہلے اس باب فقہی سے متعلق فقہ کے بنیادی ضوابط وقواعد طلبہ کو بتادئے جائیں؛ تاکہ طلبہ کے لئے تطبیق میں آسانی ہو اس مقصد کے لئے مدرسین کو کلید فراہم کرنا اس کے لئے شیخ حمزہ دمشقی کی "الفوائد البهية فى القواعد الفقهية" بڑی عمدہ چیز ہے۔(۱)

متعلقات فقہ

فقہ۔ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ کوئی نظری اور خیالی علم نہیں؛ بلکہ وہ انسان کی عملی زندگی سے مکمل طور پر مربوط اور ہم رشتہ ہے، اس لئے فقہ کے طلبہ کے لئے زندگی کے نت نئے تجربات اور انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے افکار وخیالات سے آگہی ضروری ہے، اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ معاشیات، سیاسیات، جغرافیہ، جنرل سائنس اور عالمی قانون، کی مبادیات پر مشتمل کتابیں مرتب کی جائیں اور مختلف جماعتوں میں اس طرح ان مضامین کو پڑھایا جائے کہ دوسرے مضامین کی تعلیم متاثر نہ ہو، منطق اور فلسفہ کی کتابوں میں تخفیف کرکے بہ سہولت اس کی گنجائش فراہم کی جاسکتی ہے۔

غور کیجئے جو شخص زر کی حقیقت سے واقف نہ ہو وہ سکوں کی فقہی جہت کیوں کر متعین کرسکتا ہے؟ جو بین الاقوامی قوانین سے آگاہ نہ ہو وہ مسلم وغیر ممالک کے تعلقات اور ان کی شرعی حیثیت پر کیا بحث کرسکتا ہے؟ جو ملک کے دستور وآئین سے بے خبر ہو وہ کس طرح ہندوستان کی شرعی حیثیت متعین کرسکتا ہے؟ اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں جو ان جدید فنون کے جاننے پر موقوف ہیں۔(۲)

---

(۱) دینی وعصری درسگاہیں، تعلیمی مسائل: ۱۰۲، مؤلف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم

(۲) ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ کی تدریس مناہج اور طریقے: ۲۳۰، ایفا پبلیکیشنز

کتب فقہ پڑھانے کا طریقہ

حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزی شہید رحمہ اللہ کتب فقہ پڑھانے کا مختصر طریقہ یوں بتاتے ہیں:

''ابتدائی کتب کے اندر سب سے آسان اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ طالب علم عبارت پڑھے تو اگر طالب میں صلاحیت ہے تو استاذ طالب علم سے بلوائے کہ یہ فعل ہے، یہ صفت ہے، یہ موصوف ہے، یہ مبتداء ہے، یہ خبر ہے، مضاف ہے، یہ مضاف الیہ ہے، نہیں تو پھر استاذ مختصرا یہ بتادے کہ عبارت یہ ہے اور مسئلہ یہ ہے، صورت مسئلہ بتادے اور اس میں یہ چیز جائز ہے اور یہ ناجائز ہے، بس ختم، آگے یہ کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ اس کی علت کیا ہے؟ اس میں فقہاء کے اقوال کتنے ہیں، ائمہ کا اختلاف کیا ہے، ہر امام کے قول کا ماخذ کیا ہے؟ یہ نہیں، یہ چیزیں ابتدائی طلبہ کے لئے مضر ہیں، یہ ان کے لئے نہیں ہیں۔

آگے مفتی صاحب فرماتے ہیں:

اگر اسکو مسئلہ معلوم ہو جائے تو آگے ہدایہ میں صرف دلیل سمجھنی ہوگی، مسئلہ پہلے سے یاد ہوگا، تو اس کے لئے آسانی ہوگی، لہٰذا ابتدائی کب کو ہدایہ یا ترمذی نہ بنایا جائے اور نہ ان کتب کو علم الجدل کی کتاب بنایا جائے کہ فلاں نے یوں کہا اور اس کا جواب یہ ہے:

ابتدائی کتب میں طالب کو صرف مسئلہ پر مرکوز رکھا جائے کہ طالب علم صرف مسئلہ سمجھے یہ کہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا دلیل ہے؟ یہ سب آگے چل کر معلوم ہوگے اب آگے چل کر قدروری، کنز، وغیرہ سبب میں یہی ہو، کہ آپ مسئلہ پڑھیں اور اس کی صورت بتائیں، پھر آگے چلیں، اسطرح آپ پوری کنز کو ایک سال میں نہیں؛ بلکہ چار ماہ میں پڑھا سکتے ہیں، فائدہ طالب کو بھی ہوگا اروا استاذ کو بھی ہوگا۔

نیز ہمارے مدارمیں درس نظامی میں سب سے زیادہ توجہ فقہ پر دی جاتی ہم، اولی سے لے کر دورۂ حدیث تک طالب علم کا گہرا رابطہ فقہ سے رہتا ہے، نور الایضاح، مختصر القدوری، کنز الدقائق اور شرح وقایہ تک طالب علم درجہ رابعہ تک کا سفر جاری رکھتا ہے، آگے

جا کر درجہ خامسہ اور سادسہ میں ہدایہ (کتاب الصلاۃ اور کتاب النکاح) زیر درس رہتی ہیں، جب کہ سادسہ میں چالیس فیصد توجہ فقہ پر رہتے ہوئے ہدایہ اخیرین (کتاب البیوع وکتاب الشفعۃ) پڑھائی جاتی ہیں، پھر دورۂ حدیث میں جاتے ہوئے احادیث کی تدریس میں اکثر فقہی مباحث میں طلبہ اور اساتذہ الجھے رہتے ہیں، لیکن طالب علمی میدان میں آتے ہوئے کوئی فقہی مسئلہ بڑی مشکل سے بیان کرسکتا ہے، کتابی مباحث طلبہ کو ازبر یاد ہوتے ہیں، لیکن کسی جزئیہ کا استنباط اس کے لئے دور کی بات ہے۔

ہمیں طریقہ تدریس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، ہم جس ماحول سے وابستہ ہیں، اس میں فقہ کی کتابوں کی عظمت اتنی راسخ ہے کہ ان ان سے متبادل کتابوں کے بارے میں سوچنا جرم ہے، فقہ ہماری زندگی کا رہبر ہے، اس کے بغیر اسلامی زندگی گذارنا یا دینی اقدار کو ترویج دینا مشکل ہے، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں انتہائی تیز رفتار سے تغیر پذیر ہونے والی صورت حال اور سائنس وٹیکنالوجی کی حیرت انگیزی کے نتیجہ میں آئے دن پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کے حل کے لئے ہمیں دوسرے مذاہب کی ضرورت پڑے گی، جس کے لئے دوسرے مذاہب سے صرف آگاہی کافی نہیں؛ بلکہ ان سے مخاصمانہ رویہ کے بجائے مصنفانہ رویہ کی ضرورت ہے، چنانچہ ہمیں موجودہ فقہ کو تین مراحل میں تقسیم کرنا چاہئے:

۱۔ ثانویہ عامۃ یعنی درجہ اولی اور درجہ ثانیہ میں فقہ کے حوالے سے ہماری توجہ کا مرکز صرف اور صرف فقہی مسائل کا حفظ اور ضبط ہو، فی المذہب یا فی الشرع اختلاف کی طرف بالکل توجہ نہ رہے، جس طرح ''نور الایضاح'' میں مسائل بیان ہوتے ہیں، اس میں ہم فقہ کا پہلا حصہ عبادات اور عائلی زندگی رکھ لیں اور اولی کے طلبہ سے مسائل یاد کرائیں اور درجہ ثانیہ میں فقہ کے دوسرے حصے یعنی معاملات پر توجہ ہو، ان دونوں سالوں میں اگر طلبہ کو مسائل کا حفظ مد نظر ہو تو دو سالوں میں طلبہ حفظ وافر کے مالک بن جائیں گے، موجودہ کتابوں میں قدوری سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تا ثویہ یعنی درجہ ثالثہ اور اربعہ میں توجہات کا مرکز مجتہدین فی المذہب ہونے چاہئے ،تاکہ طلبہ میں فقہ حنفی کے باہمی اختلافات کا اندازہ ہوسکے،حضرت مولانا محمد علی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی فقاہت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ اکیلے ہوں اور صاحبین دوسری جانب ہوں،اس میں شیخین اور صاحبین اور طرفین پھر انفرادی طور پر رائے سامنے آئے ، دلائل کا جائزہ لینا چاہئے ، ظاہر ہے کہ اس درجہ میں امام زفرؒ کے نکتہ نظر کو سمجھنا ہوگا ، یہ ضرورت ''کنز الدقائق'' سے پوری نہیں ہوتی ، اس کے لئے شرح الوقایہ مکمل زیادہ مفید رہے گی ، چنانچہ درجہ ثالثہ میں ''شرح الوقایہ اولین'' اور درجہ رابعۃ میں ''شرح الوقایہ آخرین'' کی تدریس کر کے اندرون مذہب اختلافات سے آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔

۳۔ درجہ عالیہ فقہ کے لئے اہم مرحلہ ہے ، اگر طلبہ کی استعداد کی آب یاری پچھلے درجات میں ہوئی ہو تو اس مرحلہ میں پہنچ کر طلبہ میں تحقیق کا ور جستجو کا مادہ پیدا ہوگا ، اس لئے خامسہ پہنچتے ہی کچھ وقت اصول مذاہب کو دینا چاہئے ، یعنی طلبہ کی اس سے آگاہی ضروری ہے کہ مذاہب اربعہ کے اصول کیا ہیں ، وہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں ، یہ کوئی نیا مضمون نہیں ہے ؛ بلکہ ''اصول الشاشی'' اور ''نور الأنوار'' پڑھتے ہوئے قواعد وضوابط کا اعادہ ہے ، تاہم انہیں یکجا کرنے کی ضرورت ہے ، اس سے طلبہ کو دوسرے مذاہب کے بنیادی وسائل تک رسائی حاصل ہوگی ، اور پھر ان اصول کو سامنے رکھتے ہوئے درجہ خامسہ اور سادسہ اور درجہ سابعہ میں فقہ کی تدریس ہو ، اواس کے لئے ہدایہ بہت موزوں کتاب ہے ، چنانچہ یہاں آکر طلبہ کی استعداد بڑھ جاتی ہے ، وہ مذہب کے جزئیات سے کافی حد تک آگاہی حاصل کر چکے ہوتے ہیں ، اور ایسا ہی وہ مذہب میں اختلافات کی وجوہات جان چکے ہوتے ہیں ، اس لئے اب وسعت کی طرف قدم رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب سے مجادلانہ اور مخاصمانہ اندازِ بیان سے نہ الجھیں ؛ بلکہ تحقیق اندازِ

بیان اختیار کر کے مذاہب کے اصول اوران پر جزئیات کی تفریع اور پھر فقہ حنفی کی ترجیحات کا سہارا لیں، ممکن ہے کہ اس طریقہ پر چلتے ہوئے دورہ حدیث تک پہنچنے سے پہلے معاشرتی مسائل کے لئے فقہی حل کی استعداد طالب علم میں پیدا ہو ہوسکتی ہے، ہدایہ کا انداز تدریس ایسا ہونا چاہئے کہ ائمہ کے اختلاف کے صورت میں دوسرے ائمہ کے اصول وضوابط طالب آگاہی حاصل کرے اور پھر فقہ حنفی کی ترجیحی وجوہات پیش ہوں، اس سے طلب میں تحقیق اور فقہی ذوق بھی پیدا ہوگا، ممکن ہے کہ طریقہ تدریس کی تبدیلی سے فضلاء معاشرتی مسائل کے حل کے لئے قابل عمل صورتیں پیش کرسکیں۔

فقہ چونکہ عملی زندگی کا نام ہے؛ اس لئے اس کی تدریس میں صرف مسائل حفظ کروانا مقصود نہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملی مشاہدہ کے لئے طلبہ کو مارکیٹ میں بھیجنا پڑے گا؛ تاکہ طالب علم دکاندار کے طریقہ کا اور عرف سے آگاہی حاصل کرے، آج کل اقتصادیات تو دنیا میں معیار بنا ہوا ہم، اس لئے جدید مارکیٹ سے آگاہی بھی ضروی ہے۔(۱)

درسی کتب فقہ کی دو اقسام

کتب فقہ جو ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں، ایک متون، جیسے قدوری، کنز، وقایہ، مختار، ان میں صورت اور حکم ہوتا ت ہے، دلیل نہیں ہوتی۔

دوسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں متن کے ساتھ شرح بھی پڑھائی جائے، ان میں دلیل بھی ہوتی ہے، جیسے شرح وقایہ اور ہدایہ، ان کے اندر تینوں اجزاء ہوتے ہیں، صورت بھی، حکم بھی، اور دلیل بھی، گویا ہمارے نصاب میں شامل دو کتابیں قدوری اور کنز تو صورت اور حکم سے بحث کرتی ہیں، دلیل شرح میں یا حاشیہ میں موجود ہوتی ہے، جو مدرس کو اس کا خلاصہ تیار کرکے بیان کرنا پڑتا ہے، اور شرح وقایہ اور ہدایہ دو ایسی کتابیں ہمارے اس برصغیر کے نصاب میں موجود ہیں جس کے اندر تیسرا جزء بھی ہوتا ہے۔ صورت اور حکم کے ساتھ دلیل بھی۔

(۱) یادوں کے دریچے: ۳۵۸

اب دو دلیل کسی صورت کا حکم ثابت کر رہی ہوتی ہے، وہ نقلی ہوگی یا عقلی، اگر وہ دلیل نقلی ہے تو اس میں اصول فقہ کا اجراء ہونا چاہئے، اور اگر وہ دلیل عقلی ہے تو اس میں قواعد فقہ کا اجراء ہونا چاہئے

دلائل کے اجراء کا طریقہ

دلیل نقلی کتاب اللہ سے ہے، تو مدرس کو بیان کرنا چاہئے کہ اس آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے، یہ عبارۃ النص یا دلالۃ النص یا اشارۃ النص ۔

اور کتاب اللہ سے جو نص لی گئی ہے یہ ظاہر، نص، مفسر، محکم ہے یا مخفی، مجمل، مشکل، متشابہ، اگر دلیل نقلی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو سنت کی کونسی قسم ہے؟ اسکو بیان کرنا چاہئے۔

اگر اجماع ہے تو اس کو بیان کرنا چاہئے کہ اجماع صریحی ہے، یا سکوتی، اجماع مفرد ہے یا مرکب؟

اور اگر دلیلِ عقلی ہے تو وہ بھی تین قسم سے خالی نہیں، اقترائی، استثنائی اور تمثیل، یہ تمثیل وہی قیاس ہے، تو دلائل نقلیہ تین قسم سے خالی نہیں ہوں گے، اصول فقہ کا جو مسئلہ یہاں سے متعلق ہے اس کو جاری کرنا چاہئے، نہیں جاری کرتے تو ہلکی سی خوشبو تو سونگھانی چاہئے طالب علم کو۔

اور جب دلیل عقلی آجائے گی تو اس کے اندر قاعدہ کلیہ فقہیہ کونسا موجود ہے؟ وہ مسئلہ بیان کرنے سے پہلے بیان کر دینا چاہئے کہ یہ مسئلہ ایک اصول پر کھڑا ہے، مشہور قواعد تو بالکل مستحضر ہونے چاہئے، مثلا:

للأكثر حكم الكل

التابع لا يفرد بالحكم

إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه

جب ہم نے اسلام کو عالمگیر مذہب مانا ہے اور دائمی مذہب مانا ہے کہ ہر زمان

اور مکان میں نافذ ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی مکلف سے ایسا کوئی فعل صادر نہیں ہوسکتا جو ان قواعد میں سے کسی قاعدے کے احاطہ میں آتا نہ ہو یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے، یہ مسلمہ نظریہ کے خلاف ہوجائے گا، لیکن ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ وہ یہ ہے کہ دلائل نقلی گذرے اور ترجمہ پر اکتفاء کرلیا گیا۔(۱)

مختصر القدوری

قدوری یہ فقہ حنفی کا سب سے مقبول متن ہے، یہ علامہ قدوری کا لکھا ہوا متن تھا، جس کو ''مختصر القدوری'' کہا جاتا ہے، قدوری ڈھائی تین سو صفحات کی ایک مختصر سی کتاب ہے؛ لیکن اس میں فقہ حنفی کے تمام مسائل کو آسان ترین زبان میں جامعیت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، اس وقت تک فقہ حنفی میں جتنے اجتہادات ہوئے تھے، اور جتنے مسائل کو جمع کیا گیا تھا، ان میں بنیادی اور اہم مسائل کا انتخاب کر کے علامہ قدوری نے اس کتاب میں جمع کردیا۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور جب لکھی گئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک دنیا بھر میں ایک درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے، کسی زمانے میں اس کو زبانی یاد کرنے کا دستور بھی تھا، جب اس کتاب کو بچے زبانی یاد کرلیا کرتے تھے تو پوری زندگی فقہ حنفی کی جڑ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی، اب زبانی یاد کرنے کا رواج ختم ہوگیا؛ لیکن پڑھنے کا رواج بھی اب تک موجود ہے، قدوری کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، اردو میں بھی لکھی گئیں، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں میں بھی لکھی گئیں، ہدایہ بھی اس متن کی شرح ہے۔(۲)

جس طرح ''ہدایۃ النحو'' نحو کی بنیاد ہے، اسی طرح ''مختصر القدوری'' فقہ حنفی کی بنیاد ہے، یہ ایک سلیس ''آسان'' مختصر مگر جامع کتاب ہے جس کی تدریس بڑے اہتمام سے ہونی ضروری ہے اور اس میں مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھنا چاہئے:

۱) عبارت ہر طالب علم سے باری باری پڑھوائی جائے اور طلبہ کو پابند کیا جائے کہ وہ

---

(۱) تحفۃ المدرسین: ۲۰۳

(۲) محاضرات فقہ: ۴۸۷، ڈاکٹر محمود احمد غازی مکتبہ الحق، ماڈرن جوگیشوری، ممبئی

مطالعہ کر کے آئیں، عبارت کی کسی ادنی غلطی یہاں تک کہ تلفظ سے بھی چشم پوشی نہ کی جائے اور عبارت کی درستی کو درس کا ایک اہم حصہ قرار دے کر اس پر وقت صرف ہونے کی پرواہ نہ کی جائے۔

۲) کتاب میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے صرف اسی کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے پر زور دیا جائے خارجی مباحث نہ چھیڑے جائیں؛ البتہ اگر اسی مسئلہ کو سمجھانے کے لئے کچھ تفصیل کی ضرورت ہو یا مفتی بہ قول بیان کرنا ہو تو الگ بات ہے۔

۳) مسئلے کے دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ جہاں مسئلے کا سمجھنا دلیل پر موقوف ہو یا دو مسئلوں میں وجہ فرق بیان کرنا ضروری ہو وہاں صرف دلائل ذکر کئے جائیں۔

۴) استاذ ''قدوری'' کی شروح میں ''جوہرہ'' اور ''لباب'' کو بطور خاص مطالعہ میں رکھے، اور ضرورت کے وقت ''ہدایہ'' اور اس کی شروح سے بھی مدد لے، لیکن طالب علم کو صرف اتنی بات بتائے جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔

۵) شروحات کے علاوہ استاذ کو چاہئے کہ وہ ''بہشتی زیور'' اور ''امداد الفتاوی'' بھی اپنے مطالعہ میں رکھے اور ہر سبق میں یہ دیکھ لیا کرے کہ کتاب کا کوئی مسئلہ مفتی بہ قول کے خلاف تو نہیں ہے، اگر خلاف ہو تو مفتی بہ قول بھی بیان کرے۔

٦) تمام فقہی اصطلاحات اور ان کا مفہوم و مصداق طالب علم کو زبانی یاد کرایا جائے، اسی طرح ہر باب سے متعلق بنیادی مسائل اور کثیر الوقوع جزئیات بھی زبانی یاد ہونے چاہئے، البتہ تفصیلات اور تفریعات وغیرہ میں اس بات پر اکتفاء کیا جاسکتا ہے کہ طالب علم کتاب میں دیکھ کر ان کا مطلب بتا سکے۔

۷) نماز کے سنن و آداب نہ صرف طالب علم کو زبانی یاد کرائے جائیں؛ بلکہ ان کی عملی مشق کرائی جائے اور طلبہ کو ان کی عملی غلطیوں اور کوتاہیوں پر متنبہ کیا جائے اور خارج درس بھی اس طرز عمل کی نگرانی کی جائے۔

۸) طالب علم کے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات پیدا کی جائے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ محض ایک نظریاتی علم یا فن نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد اس کے عمل کی اصلاح ہے۔(۱)

شرح وقایہ

''وقایہ'' فقہ حنفی کا ایک مقبول متن جو دراصل ہدایہ کی جامع تلخیص ہے، یہ تلخیص ایک فقیہ تاج الشریعۃ محمد بن صدر الشریعۃ نے تیار کی جو علامہ مرغینانی سے کم وبیش سوڈیڑھ سو سال بعد آئے ، اس تلخیص کا نام ''وقایہ'' رکھا، وقایہ ایک متن قرار پایا اور قدوری کے بعد فقہ حنفی کا دوسرا مقبول ترین متن قرار دیا گیا ، یہ دراصل ہدایہ کی تلخیص ہے ، یعنی اس میں قدوری اور جامع صغیر کے بنیادی مسائل بھی آ گئے اور چند وہ مسائل جن کا اضافہ علامہ مرغینانی نے کیا تھا وہ بھی آ گئے ،تفصیلات کو نکالتے ہوئے جو اہم اور بنیادی مسائل اور قواعد تھے وہ سب انہوں نے اس نئے متن میں سمودیئے ، یہ متن بھی اس وقت درسی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے ، جب یہ متن مقبول ہو گیا تو اسی مصنف کے نواسے صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود نے اس کی شرح لکھی جو''شرح وقایہ'' کے نام سے مشہور ہوئی ، ''شرح وقایہ'' بھی آج تک ایک درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے، اگرچہ ''شرح وقایہ'' کا وہ درجہ نہیں جو''ہدایہ'' کا ہے،لیکن یہ ایک مقبول کتاب ہے،اور آج تک پڑھائی جاتی ہے۔(۲)

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ فقہ کے سادہ مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد طالب علم فقہاء کرام کے اختلافات اور دلائل سے تعارف حاصل کرے ، چنانچہ اس کتاب میں جو مباحث بیان ہوئے ہیں، ان کی اس طرح تشریح کی جائے کہ طالب علم ان دلائل ومباحث کو نہ صرف سمجھ سکے؛ بلکہ ان مباحث میں قوت مطالعہ اس کے اندر پیدا ہو سکے۔

اس کے لئے مناسب ہے کہ استاذ وقتاً فوقتاً طلبہ سے پڑھے ہوئے سبقوں کے بارے میں سوالات کرتا رہے ، یہ سوالات نفس مسائل کے علاوہ اختلافات اور دلائل کے

---

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں:۱۶، ۱۸

(۲) محاضرات فقہ:۹۰۴،ڈاکٹر محمود احمد غازی مکتبہ الحق ، ماڈرن جوگیشوری ، ممبئی

بارے میں بھی ہونے چاہئے۔

طلبہ کی عبارت کی تصحیح اور نحوی وصرفی قواعد کے اجراء کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہنا چاہئے۔

کنز الدقائق

قدوری اور وقایہ کے بعد یہ تیسرا مقبول ترین متن اور فقہ اسلامی کے ذخیرے کا شاید سب سے منفرد متن ''کنز الدقائق'' کہلاتا ہے، اس کو ایک مشہور فقیہ، مفسر قرآن اور متکلم علامہ حافظ الدین نسفی نے ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں لکھا تھا، ان کی ایک تفسیر ''مدارک التنزیل'' کے نام سے ہے، اصول الفقہ پر بھی انہوں نے کام کیا ہے، کنز الدقائق کے نام سے انہوں نے جو متن تیار کیا ہے، وہ تمام متون سے زیادہ مختصر اور جامع ہے، اتنا مختصر اور جامع کہ اسلامی ادبیات میں نہ اس اختصار کی مثال ملتی ہے اور نہ اس کی جامعیت کی، بعض مقامات پر اپنے اختصار کی وجہ سے ایک چیستاں اور معمہ معلوم ہوتا ہے، اس کی مثالیں بہت مشہور ہیں۔(۱)

مختصر القدوری کے بعد کنز الدقائق کی فقہ میں وہی حیثیت ہے جو نحو میں ہدایۃ النحو کے بعد کافیہ کی، قدوری کے مبادی کا تعارف حاصل ہوتا ہے، لیکن کنز میں فقہی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ دریا بکوزہ کے مصداق جمع ہے، لہٰذا استاذ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ یہ ذخیرہ طالب علم کے اس طرح ذہن نشیں کرادے کہ کتاب سے استفادہ کی صلاحیت طالب علم میں پیدا ہوجائے، ہر باب کے بنیادی مسائل اور اصطلاحات اسے اچھی طرح یاد ہوجائیں اور باقی تفصیلات وہ کتاب کی مدد سے سمجھ سکے۔

کتاب کے حل کے لئے استاذ کو''عینی'' شرح کنز''اور''کشف الحقائق'' کو سامنے رکھنا چاہئے اور فقہی تفصیلات جاننے کے لئے''زیلعی'' اور بوقت ضرورت''البحر الرائق'' کی مراجعت کی جائے۔

(۱) محاضرات فقہ: ۴۹۰، ڈاکٹر محمود احمد غازی مکتبۃ الحق، ماڈرن جوگیشوری، ممبئی

اس کتاب میں بھی دلائل طلبہ کے سامنے بیان کرنے کی حاجت نہیں، البتہ جہاں مسئلے کی صحیح فہم دلیل پر موقوف ہو وہاں دلیل ضرور بیان کی جائے یا جہاں ایک جیسے مسئلوں کا حکم مختلف ہو وہاں وجہ فرق ضرور واضح کیا جائے۔

ہدایہ

اس کتاب کو اگر درس نظامی اور علوم دینیہ کی بنیاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، لہٰذا استاذ کو اسی اہمیت کے ساتھ اسے پڑھانا چاہئے، کتاب کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم کو مسائل کے ساتھ ان کے نقلی اور عقلی دلائل اور فقہاء کے مدارکِ استنباط سے واقفیت ہو۔

قدوری لکھے جانے کے کچھ عرصہ بعد ایک مشہور فقیہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے محسوس کیا کہ علامہ قدوری کی مختصر اور امام محمد کی جامع صغیر میں بعض ایسے مسائل ہیں جو ایک دوسرے کے یہاں موجود ہیں، انہوں نے ان دونوں قسم کے مسائل کو ایک جگہ جمع کرنا چاہا، انہوں نے قدوری اور جامع صغیر کا تقابلی جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ بعض جگہ تکرار ہے، اور بعض جگہ منفرد مسائل ہیں جو کسی سے ملتے جلتے نہیں، ان کو ایک جگہ جمع کیا اور ایک نیا ٹیکسٹ تیار کرکے اس کا نام ''بدایۃ المبتدی'' رکھا۔

پھر انہوں نے ''بدایۃ المبتدی'' کی ایک شرح لکھی جو چالیس یا پچاس یا ستر جلدوں پر مشتمل تھی، اس کا نام انہوں نے ''کفایۃ المنتھی'' رکھا، پھر انہوں نے اس کا ایک خلاصہ تیار کیا جو ''ہدایہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

ہدایہ فقہ حنفی کی انتہائی مستند کتابوں میں سے ایک ہے، اس کا استدلال بڑا عقلی، اس کا انداز انتہائی علمی، اس کا اسلوب انتہائی سائنٹفک اور مختصر ہے، اس میں ایک لفظ بھی زائد نہیں ہے، ہدایہ کے جلیل القدر مصنف اپنی بات کو اتنے سلیقے سے کہتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک مرتبہ ان کے اسلوب سے واقف ہو جائے تو وہ بڑی آسانی سے کتاب سے استفادہ کر سکتا ہے، اس لئے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے لئے ''ولہ'' اور صاحبین کے لئے ''ولہما'' اور جہاں سب کا اتفاق ہے وہاں ''عندنا'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، اس طرح کی کچھ علامتیں

بنا کر انہوں نے اور زیادہ اختصار سے کام لیا ہے، اگر کوئی شخص اس کتاب کو پڑھ لے اور اس کے دلائل اور استدلال سے گہرائی کے ساتھ واقف ہو جائے تو نہ صرف بہت اچھا فقیہ بن جاتا ہے؛ نہ صرف فقہاء کے اسلوب استدلال اور طرز اجتہاد پر اس کو گرفت حاصل ہو جاتی ہے؛ بلکہ فقہ حنفی کی کنجی اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔(۱)

اس کتاب کی تدریس میں مندرجہ ذیل امور کا اہتمام لازم ہے:

۱) عبارت کی تصحیح لازمی ہے۔

۲) مسئلے کی صورت کا واضح بیان جو خارجی مثالوں سے مصور کر کے ہو تو بہتر ہے ارو مسئلے کے حکم کی تفصیل مع اختلاف فقہا۔

۳) مسئلے کے دلائل کی توضیح اور مخالف قہاء کی دلائل کا جواب۔

۴) مذکورہ دونوں امور پہلے کتاب سے ہٹ کر طلباء کو سمجھا دئے جائیں، پھر کتاب سے کر کے اس بحث کی پوری مطابقت کر لی جائے۔

۵) دلائل کے بیان کے وقت جس قدر ممکن ہو اصولِ فقہ کے قواعد اجراء کرایا جائے۔

۶) حلِ کتاب کے لئے ''عنایۃ'' اور ''کفایۃ'' کو نبیاد بنایا جائے اور دلائل کی تفصیل کے لئے فتح القدیر اور عینی کی ''بنایۃ'' سے مدد لی جائے۔

۷) اس بات کا اطمینان کیا جائے کہ طالب علم کو باب سے اہم او ربنیادی دلائل کی تفصیل کے لئے فتح القدیر اور عینی کی ''بنایۃ'' سے مدد لی جائے۔

۸) کبھی کبھی طلبہ کا اطمینان کیا جائے کہ طالب علم کو باب سے متعلق اہم اور بنیادی مسائل یاد ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا امتحان لیا جاتا رہے۔

(۹) اس بات کی بطور خاص نگرانی کی جائے کہ ''ہدایۃ'' جیسی کتاب کے مطالعے اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت طالب علم میں پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔(۲)

---

(۱) محاضرات فقہ: ۴۸۸، ڈاکٹر محمود احمد غازی مکتبہ الحق، ماڈرن جوگیشوری، ممبئی

(۲) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھے اور پڑھائیں؟

ہدایہ کے متعلق حضرت باندوی فرماتے ہیں:

حضرت اس قسم کی باتیں اس لئے فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ان علوم کے امام تھے اوران سے خاص شغل وشغف رہا تھا؛ اسی لئے ان کی اہمیت سے خوب واقف تھے اور اس انداز ومزاج کی کتابوں کواہمیت دیتے تھے، اوراسی انداز میں ان کو پڑھاتے اور سمجھاتے تھے۔ چنانچہ ہدایہ جس کے عقلی دلائل کی زمین کچھ اسی انداز کی ہے حضرت اس کو اسی سطح و نہج میں سمجھاتے تھے،، اسی وجہ سے ذہین طلباء اس کے مسائل ودلائل کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے تھے، اس کا ذہین طلباء نے برملا اور بار بار اظہار کیا حضرت نے ایک موقع پر ہدایہ کی بابت فرمایا:

''صاحب ہدایہ کا کمال یہ ہے کہ قیاس کے اندر کبھی صغری و کبری اور نتیجہ تینوں کو ذکر کرتے ہیں، کبھی صرف نتیجہ کو ذکر کرتے ہیں، اور کبھی صغری ہے تو کبری نہیں اور کبری ہے تو صغری نہیں، کوئی غور کر کے ان پہلوؤں کو سمجھ لے تو کتاب بالکل حل ہو جائے گی'' (۱)

ہدایہ کی تعلیم

یہاں ہدایہ پڑھانے کے لئے ایک اچھا مدرس درکار ہے، جو بہت بڑا فقیہ بھی ہو اور جب ہدایہ وہ پڑھائے تو آج کل کے معاشی مسائل سے اس کو ریلیٹڈ بھی کر سکے، جہاں مضاربہ کی بحث ہو وہاں بینکاری سے بھی وہ واقف ہو، بینکاری میں جس طرح سے مضاربہ سے کام لیا جاتا ہے یا لیا جاسکتا ہے، یا لیا جانا چاہئے اس سے واقف ہو، تا کہ وہ طلباء کو اس کے لئے تیار کر سکے۔ (۲)

اس سلسلے میں ''مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب مدظلہ العالی'' کی کتاب ''ہدایہ کیسے پڑھائیں'' زیر مطالعہ رہے اور اس کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس کتاب کی حقیقت اور اس کتاب کی شمولیت نصاب وغیرہ کی وجوہات اور بہت سارے اصول اور بنیادی چیزوں کی رہنمائی مصنف نے کی ہے، یہ کتاب نہایت مفید اور ہدایہ پڑھانے والوں کے لئے نہایت رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

(۱) مآثر حضرت باندویؒ: ۹۶۔۹۷ (۲) محاضرات تعلیم: ۱۴۲

ضروری ہدایات

- فقہی اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھایا جائے۔
- روزمرہ کے مسائل طلبہ کو زبانی یاد ہوجائیں اور وہ صحیح طور پر عمل میں آجائیں۔

اس کی پوری کوشش کی جائے جس کے لئے عملی مشق بھی ہو؛ طالب علم فقہ کو صرف نظریاتی طور پر نہ پڑھے؛ بلکہ عملی طور پر وہ مقصود ہے، یہ سمجھ کر عملی جامہ پہناوے: "قال الإمام المالک من تفقه ولم یتصوّف فقد تفسّق" (۱) قرآن وحدیث سے مسائل کو سمجھ سکنا، اور ان سے مربوط ہونا؛ تاکہ شرعی لچک وحکمت سے وہ ناآشنا نہ رہیں، عصر حاضر کے مسائل اور جزئیات کو کلیات سے انطباق کی سمجھ، مثلاً فقہ کا مسئلہ ہے، الاغماء فی مثل النوم، تو صرف الفاظ کا ترجمہ یا سرسری تشریح کر کے گذر نہ جائیں، موجودہ مسائل پر طلبہ کی توجہ مبذول کرائیں کہ آج کل ایکسیڈنٹ وغیرہ میں کسی کو سر کی چوٹ سے بے ہوشی کے مثل بیماری، جس کو "کوما" کہتے ہیں، لاحق ہوتی ہے، جس سے افاقے کی امید کم ہوتی ہے اور وہ بہت ممتد ہوتی ہے قوی احتمال ہے کہ مفتیانِ کرام اسے اغماء میں شامل فرماتے ہوں گے اس طرح مکروہات استنجاء میں (Tissue paper) باریک کاغذ سے استنجاء کا مسئلہ کیا ہے؟ وہ بتانا، اسی طرح آج اشاعت دین کے ذرائع عام ہوچکے تو اب دارالحرب میں کوئی اسلام لائے؛ لیکن شرعی احکام سے ناواقف رہے تو یہ عذر میں شامل ہے یا نہیں وغیرہ "فمن لم یوسّع معارفه لم تجدّدت معارفه بل تساقطت جزئیاته عن الذهن"۔

۱۔ فقہ کی کتابوں مثلاً نورالایضاح قدوری وغیرہ میں بھی ۲۰ اور ۳۰ صفحات کی اولا صرف عبارت ٹھیک کرالی جائے جیسے اوپر فن ادب میں مذکور ہوا، اس سے۔ ایک فائدہ یہ ہوگا کہ طالب علم پڑھنے پر توجہ دے گا اور اس پر جمے گا کیوں کہ صرف عبارت سے بوجھ نہیں بڑھے گا اور جب عبارت ٹھیک ہوگئی تو پھر ترجمہ اور مطلب کے لئے آمادہ ہوگا۔

---

(۱) مرقات: ۲۵٦

۲۔ دوسرا فائدہ: یہ کہ چونکہ طالب علم مطالعہ نہیں کرتا تو عبارت کی تیاری کرنے سے کلام کے سیاق وسباق سے کچھ آشنا ہوجائے گا، تو پھر وقت پر سمجھانے میں بڑی مدد اس لئے ملے گی کہ اس کا ذہن سیاق وسباق کی طرف سبقت کرجائے گا، کیوں کہ فقہ میں مبتداء وخبر اور معطوف ومعطوف علیہ، فعل فاعل مفعول وغیرہ جدا جدا گوشے میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، نحو کی طرح متواصل نہیں ہوتے۔

عبارت پڑھنے کے لئے چند طلبہ ایسے منتخب کئے جائیں جو کچھ اغلاط کے ساتھ پڑھ سکیں اور ان کی اصلاح کی جاسکے، لیکن وہ نقی اللسان اور رفیع الصوت ہوں، طالب علم درس کے ہر مسئلہ کی عبارت جدا جدا کر کے پڑھے، اس پر توجہ دی جائے، پھر استاذ بھی عبارت پڑھ کر سلیس ترجمہ کرے، مشکل اور جدید لفظ کا ترجمہ پہلے سے انفرادی بتادیا جائے، پھر آسان انداز میں اولا مسئلہ کو سمجھادے، اور دوبارہ خلاصہ کے انداز میں بتادے، پھر دو مسئلوں کے فرق کے لئے خاص جملہ ''مستعمل'' ہوا سے علاحدہ توجہ سے سمجھائیں (لکل شیء شأن) جیسے استنجاء بالأحجار کے طریقے میں قدام اولی خلف یا برعکس کا مدار خصیہ کے مدلاۃ اور غیر مدلاۃ پر ہے، اسی طرح کنویں کے پانی کے مکمل ناپاک ہونے کا مدار بئر صغیر ہونے پر ہے؛ ورنہ مکمل ناپاک نہ ہوگا، تو بئر صغیر وغیر صغیر کے فرق سے مسئلہ کا فرق سمجھانا۔

ان درجات کی تمام کتابوں میں بیک وقت دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

نفس ذکر کردہ مسئلہ کا سمجھانا۔

طلبہ میں حل عبارت کا ملکہ پیدا کرنا۔

اگر مفہوم پورا بتادیا گیا حتی کہ طلبہ نے اسے سمجھ بھی لیا لیکن وہ کتابی عبارت سے اسے منطبق کرنا نہیں جانتے تو یہ ان کی دوسرے مقصد میں ناکامی کہی جائے گی۔ (ومثلھما کالجناحین للطیر)

نوٹ: ابتداء میں تمام فنون کی تمام کتابوں میں طلبہ کو آسانی کا تصور دلایا جائے؛ کیوں کہ نفسیات کا اثر بہت بڑا ہوتا ہے، جب طالب علم آسان سمجھے گا تو مشکل بوجھ بھی اٹھا

لے گا، جس کے لئے بقرعید تک دو دو مرتبہ ترجمہ کیا جائے اور مطالب ومفاہیم کا بھی خلاصہ کے انداز میں تکرار کیا جائے؛ اور سمجھانے کے دوران استاذ: پوچھتا رہے'' تسلسل کے ساتھ'' بولتا گذر نہ جائے کیوں کہ سوالات سے انتباہ باقی رہتا ہے، انہیں درس کا جزء لاینفک قرار دیا جائے، اور ترجمہ، عبارت اور مطلب پر غلطی نہ کرنے میں فوری اصلاح نہ کی جائے اسے سوچنے کی مہلت دی جائے اور اولا ''دوسرے طالب علم سے'' اصلاح کرائی جائے۔(۱)

جدید معاشیات وسیاسیات

نصاب سے متعلق ہماری آخری گذارش جدید معاشیات اور دنیا میں رائج مختلف نظامہائے سیاست سے نظریاتی واقفیت کی بارے میں ہے، جدید معیشت وتجارت سے مروجہ نصاب بالکل خاموش ہے، خرید وفروخت کے جو مسائل ''مختصر القدوری'' میں پڑھتے ہیں، سات سال بعد وہی مسائل، بیوع کی وہی صورتیں حدیث کی کتابوں میں پڑھائی جاتی ہیں، اور پڑھنے والے کو سرے سے علم نہیں ہوتا کہ معیشت کی نئی منڈی میں خرید وفروخت کی ان سیدھی سادی صورتوں میں بہت کم گذر ہے، جدید تجارت ومعیشت نے نت نئے مسائل اور صورتیں پیدا کی ہیں، ان سے واقفیت اور شرعی نقطہ نظر سے ان کا حکم معلوم ہونا ایک عالم دین کے لئے انتہائی ضروری اور اس کے منصب کی اہم ذمہ داری ہے، عربی میں جدید معاشیات پر کافی کام ہوا ہے، جن میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ کی ''فقہ البیوع'' اور اردو میں مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب 'اسلام اور جدید تجارت ومعیشت'' درس میں پڑھانے اور نصاب میں داخل کرنے کی کتاب ہے، اس طرح دنیا میں رائج سیاسی نظاموں سے نظریاتی واقیت بھی ضروری ہے، ایسی کتاب داخل نصاب ہونی چاہئے جس میں اسلام کے سیاسی نظام اور اس کے اصول ومبادی کے ساتھ ساتھ مروجہ مختلف نظامہائے سیاست کے متعلق بھی معلومات ہوں۔(۲)

---

(۱) فن تدریس کے اصول: ۱/۱۶۵، ۱۶۸، مترجم: عبدالحفیظ صاحب

(۲) دینی مدارس اہمیت وضرورت: ۱۰۹، ابن الحسن عباسی، مکتبہ طیبہ دیوبند

فن اصول فقہ

علوم اسلامی میں ''اصول فقہ'' کی تدریس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ اس فن کا تعلق صرف فقہ ہی سے نہیں؛ بلکہ کتاب اللہ سے بھی ہے، حدیث سے بھی ہے اور ایک گونہ عقیدہ وکلام سے بھی؛ اس لئے ہندوستان کے مدارس میں اس موضوع کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور اصول فقہ کی متعدد کتابیں داخل درس کی گئی ہیں۔

تاہم ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں اصول فقہ کی تدریس کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے بہ طور تمہید کے دو نکات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱) اوران مضامین کی جو اس فن میں زیر بحث آتے ہیں۔

۲) دوسرے ان مناہج کی جو مصنفین نے اس فن کی ترتیب وتوضیح میں اختیار کئے ہیں۔

تصنیف اصول کے مناہج

اصول فقہ میں جو مباحث آئے ہیں ان کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱) "أدلة الأحكام"-----یہ اصول فقہ کی سب سے اہم بحث ہے، جسے ''ادلہ شرعیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس میں چار ادلہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اجماع اور قیاس متفق علیہ ہیں، آٹھ کے بارے میں معتبر ہونے یا نہ ہونے میں فی الجملہ اختلاف پایا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: "قول صحابی، شرائع ما قبل، استحسان، مصالح مرسلہ، سد ذرائع، استصحاب، عرف وعادت تعامل اہل مدینہ"

چونکہ یہی مصادر تمام احکام شرعیہ کے لئے مآخذ ہیں؛ اس لئے اصول فقہ میں اس

باب کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے۔

۲) **مقاصد و مدارج احکام** مقاصد سے مراد احکام شرعیہ کے عمومی مقاصد خمسہ: حفظ دین، حفظ نفس، حفظ نسل، حفظ مال اور حفظ عقل ہیں اور مدارج سے مراد اہمیت کے اعتبار سے احکام کے مدارج یعنی ضرورت وحاجت اور تحسین ہے، جسے بعض اہل علم نے، تین کے بجائے پانچ اور بعض نے ہر درجہ کے ساتھ ایک مکمل کا اضافہ کر کے چھ درجات مقرر کئے ہیں، اصول فقہ کا یہ حصہ نہایت اہم ہے اور مجتہد کے لئے اجتہاد اور استنباط کے حدود اربعہ کو متعین کرتا ہے؛ لیکن کم ہی مصنفین نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

۳) **''دلالت کلام''** دین کا اصل ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے، اور اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امانت عربی زبان میں محفوظ ہے، اس لئے جو شخص احکام شرعیہ کا استنباط کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے عربی زبان اور اس کے اسالیب تعبیر سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلا یہ کہ امر کی دلالت وجوب پر ہوتی ہے، یا استحباب واباحت پر؟ نہی کا صیغہ کب تحریم کے لئے آتا ہے اور کب بطور ارشاد کے وارد ہوتا ہے؟ عام اور مطلق کی دلالت اپنے افراد پر قطعی ہوتی ہے، یا وہ بیان کا محتاج ہوتا ہے؟ ''وٗ'' صرف جمع کے لئے ہے یا جمع وترتیب دونوں کے لئے ہے؟ ''ب، ف، ثم، الی، حتی اور من'' یہ کلمات کب کن معنوں میں استعمال ہوتے ہیں؟ وغیرہ ان تمام مباحث کا تعلق اصل عربی زبان کے قواعد سے ہے؛ لیکن چوں کہ کتاب وسنت کی زبان بھی عربی ہی ہے؛ اس لئے یہ موضوعات اصولِ فقہ کا بھی اہم حصہ ہیں، بلکہ علامہ بزدویؒ اور سرخسیؒ کی ترتیب میں کتاب کا ابتدائی بڑا حصہ اسی بحث پر مشتمل ہے۔

منہجِ تالیف

اصول فقہ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ طریقۂ تالیف اور ترتیب کے

لحاظ سے تین طرح کی ہیں: ایک: طریق الشافعیہ، جس کو ''طریق المتکلمین'' بھی کہتے ہیں، دوسرے ''طریق الحنفیۃ'' جس کو ''طریق الفقہاء'' بھی کہتے ہیں، اور تیسرے ''جامع بین الطریقین''۔

متکلمین، مالکیہ اور شوافع کے یہاں اصولی مسائل کی توضیح کا اسلوب یہ ہے کہ وہ نفس قواعد کو ذکر کرتے ہیں، اس کے علاوہ حدود وقیود بیان کرتے ہیں، اور اسی پر دلائل قائم کرتے ہیں، فروع وجزئیات پر اس کی تطبیق کا التزام نہیں کرتے، امام غزالیؒ (م: ۵۰۵) کی ''المستصفی'' علامہ آمدیؒ (م: ۶۳۱ھ) کی ''الاحکام'' اور قاضی بیضاویؒ (م: ۶۸۵ھ) کی ''المنہاج'' اس سلسلہ کی اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

فقہاء حنفیہ کا طریق یہ ہے کہ وہ اپنے ائمہ کے مجتہدات کو سامنے رکھ کر اصول وقواعد وضع کرتے ہیں اور ان قواعد کو ذکر کرتے ہوئے ان کی تفریعات کو نقل کرتے ہیں، اور اصول وفروع کے ارتباط پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، اس لئے شوافع کے یہاں اصول اور انکے دلائل پر زیادہ زور ہوتا ہے اور احناف کے یہاں اصول وفروع سے ان کے ارتباط پر، اس طریقہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں قاضی ابوزید دبوسیؒ (م: ۴۳۰ھ) کی ''تقویم الأدلۃ'' فخر الاسلام بزدویؒ (م: ۴۴۲ھ) کی ''اصول''، شمس الائمہ ابوبکر سرخسی (م: ۴۹۰ھ) کی ''اصول'' اور بعد کے علماء میں علامہ حافظ الدین نسفی (م: ۷۱۰ھ) کی ''کتاب المنار'' بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

بعد کو کچھ اہل علم نے ان دونوں طریق کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حیثیت سے علامہ مظفر الدین بغدادی حنفی المعروف بان ساعاتی (م: ۶۹۴ھ) کی ''بدیع النظام'' جو آمدی کی ''الاحکام'' اور فخر الاسلام بزدوی کی ''اصول'' کو جامع ہے، صدر الشریعۃ کی ''التوضیح'' علامہ ابن ہمام کی ''التحریر'' اور علامہ تاج الدین سبکی کی ''جمع الجوامع'' اور ان کتابوں کی شروح اہم سمجھی جاتی ہیں اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی ملا محب اللہ بن عبد الشکور (م: ۱۱۱۹ھ) کی ''مسلم الثبوت'' ہے۔

ہندوستان کے دینی مدارس میں داخل نصاب اصول فقہ کی کتابوں پر ایک نظر:

اس تمہید کی روشنی میں ہندوستان میں داخل درس اصولِ فقہ کے مضمون، پر دو جہتوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اول ان کتابوں پر جو داخل نصاب ہیں، دوسرے اس مضمون کے طریقہ تعلیم پر۔

جہاں تک کتابوں کی بات ہے تو عام طور پر تین کتابیں اصول فقہ میں پڑھائی جاتی ہیں: اصول الشاشی، نور الأنوار اور حسامی۔

اصول الشاشی

اصحابِ تحقیق کی رائے ہے کہ یہ اسحاق بن ابراہیم شاشی سمرقندی (متوفی: ۳۲۵ھ) کی تالیف ہے، یہ کتاب بڑی تقطیع سے ۱۰۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں بڑا حصہ دلالت کلام سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے، جو ابتدائی کتاب سے صفحہ نمبر ۶۷ تک پر محیط ہے، حاکم اور مقاصد احکام کے مباحث سے اس کتاب میں تعرض نہیں کیا گیا ہے، ادلہ شرعیہ میں کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کی بحثیں ہیں، اس طرح یہ کتاب اصول فقہ کے تمام مباحث کو جامع نہیں ہے اور طلبہ کو مضمون سے مانوس کرنے کے لئے پڑھائی جاتی ہے، ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی ابتدائی بحثیں طلبہ کے لئے نسبتا دشوار ہوتی ہیں۔(۱)

اس حوالہ سے مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

یہ اصول فقہ کی پہلی کتاب ہے؛ لیکن بعض دقیق مباحث پر مشتمل ہے، نیز اس میں قواعد ومسائل سے زیادہ تفریعات پر زور دیا گیا ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس کتاب کو شروع کرانے سے پہلے ''اصول فقہ'' کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل کوئی چھوٹا رسالہ پڑھا دیا جائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہر سبق کے شروع میں متعلقہ اصطلاح یا قاعدے کی تشریح اہتمام سے کرائی جائے، کتاب میں جو تفریعات بیان کی گئی ہیں قاعدے پر ان کا انطباق بعض اوقات بہت دقیق ہوتا ہے اور بعض اوقات پر تکلف بھی؛ لہٰذا شروع میں اس قاعدے کو آسان اور بے تکلف مثالوں پر منطبق کر کے سمجھایا جائے اور طالب علم سے مختلف سوالات

(۱) دینی وعصری درسگاہیں، تعلیمی مسائل: ۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷، ۱۰۸-۱۰۹، بعنوان دینی مدارس میں اصول فقہ کی تعلیم

کے ذریعہ انطباق کرایا جائے، اس کے بعد کتاب کی دقیق تفریعات شروع کی جائیں۔

کتاب کی بعض تفریعات ایسی بھی ہیں کہ وہ حقیقۃً قواعد پر منطبق نہیں ہوتیں، اور انطباق کے لئے بہت تعسف سے کام لینا پڑتا ہے، ایسے مقامات پر پر تکلف تاویلات کرنے کے بجائے حقیقت حال طالب علم کو بتادینے میں کوئی حرج نہیں ہے ورنہ وہ نفس قاعدہ کے بارے میں ذہنی الجھن کا شکار رہے گا۔

''اصول الشاشی'' کی تدریس کے دوران اس کی شرح ''فصول الحواشی'' کے علاوہ ''نورالانوار'' بھی مطالعے میں رکھنی چاہئے۔(۱)

نورالانوار

یہ ایک ہندوستانی عالم ملا جیونؒ کی تالیف ہے، علامہ نسفیؒ کی ''منار'' پر مبسوط اور مفصل شرح ہے، اور ہندوستانی مطبوعہ بڑی تقطیع سے ۳۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں حاکم اور احکام شریعت کے مقاصد و مدارج کا ذکر نہیں؛ البتہ قیاس اور استحسان کے مباحث بالتفصیل مذکور ہیں؛ لیکن کتاب کا ابتدائی نصف حصہ اور زیادہ تر اسی کا درس ہوتا ہے)''دلالت کلام'' کی بحثوں اور اس پر تفریعات سے متعلق ہیں، مختلف فیہ ادلہ شرعیہ'' قول صحابی، شرائع ما قبل، استصحاب، عرف، تعامل اہل مدینہ، سد ذرائع وغیرہ'' پر بحث مستقلا نہیں کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ شارح نے متن کی عبارت کو حل کرنے اور اس سلسلہ میں لفظی موشگافیوں، نیز دخل اور دفعِ دخل میں اتنی زیادہ کاوش کی ہے جو مصنف کے گہرے علم کی دلیل تو ضرور ہے؛ لیکن طالب علم کی توجہ کو اصل فن سے ہٹادیتی ہے۔(۲)

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ اس کتاب کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''یہ اصول فقہ کی پہلی مفصل کتاب ہے جو طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے، کتاب بذات خود نہایت آسان ہے، اس لئے اس کے حل میں کسی

---

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۲۳، ۲۴

(۲) ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ کی تدریس مناہج اور طریقے: ۲۳۶، ایفا پبلیکیشنز

خاص جدو جہد کی ضرورت نہیں ہوتی؛ لیکن استاذ کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیئے کہ اس کتاب کے ذریعہ اصول فقہ کی اصطلاحات اور اس کے مسائل ومباحث کے ساتھ طالب علم کے ذہن نشیں کرانے ہیں، اس کتاب میں بھی تفریعات بہت ہیں؛ لیکن ہر جگہ تفریع کو اصل پر منطبق کر کے اصل کو یاد دلایا جاتا رہا ہے تا کہ تفریعات کی تفصیل میں محو ہو کر طالب علم اصل کو فراموش نہ کرے''۔

حسامی

''حسامی''، شیخ محمد بن محمد بن عمر اخسیکثی کی تالیف ہے، یہ اصول فقہ کا عظیم الشان متن ہے اور ترتیب وہی ہے جو بزدوی وغیرہ کی ہے، اور مباحث بھی قریب قریب وہی ہیں ہ جو ''منار'' اور ''نور الأنوار'' کے سلسلہ میں مذکور ہوئے ہیں، البتہ اس میں قیاس واستحسان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض وہ اصول جس کے دوسرے فقہاء قائل، احناف قائل نہیں اور ان کا تعلق دلالتِ کلام سے ہے، کو''وجوہ فاسدہ'' کے عنوان سے بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، چوں کہ اصول فقہ میں نقد کی بعض بحثیں فن مناظرہ سے متعلق ہیں،، اس لئے ''نور الأنوار'' اور ''حسامی'' دونوں ہی کتابوں میں ان مباحث کا بھی قابل لحاظ حصہ ہے، لیکن اس کتاب ''حسامی'' میں ''ایجاز واغلاق'' اس درجہ ہے کہ اس کو فقہ اور اصول فقہ پر لکھی گئی چند مغلق کتابوں میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا؛ اس لئے ایک تو اکثر مدارس میں یہ کتاب مکمل نہیں ہو پاتی ہے، دوسرے دقتِ تعبیر کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ کی محنت کا بڑا حصہ فن کی گہرائیوں میں غواصی کے بجائے حل عبارات میں صرف ہو جاتا ہے، اگر حسامی کو نصاب میں وہاں سے رکھا جائے جہاں سے کتاب اللہ کی بحث ختم ہوتی ہے اور پھر ختم کتاب تک پڑھایا جائے تو بہت مناسب ہوگا، تا کہ قیاس، استحسان، عوارض اہلیت وغیرہ کی بحثیں تفصیل سے آجائیں، پھر موقع ہو تو ابتداء سے پڑھایا جائے۔(۱)

(۱)　ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ کی تدریس مناہج اور طریقے: ۲۳۶، ایفا پبلیکیشنز

بعض مدارس میں فضیلت کے بعد ''اصول بزدوی'' پڑھائی جاتی ہے اور بعض میں ''التوضیح والتلویح'' یہ فن کی اہم کتابوں میں ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان کتابوں میں صرف فقہاء احناف کے اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جیسے ہم ہدایہ پڑھتے ہوئے مختلف دبستانِ فقہ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں، اسی طرح ان کتابوں کے ذریعہ ہم مختلف مکاتب فقہ کے اصول اور اس سلسلہ میں ان کے دلائل سے آگاہ نہیں ہو پاتے، اسی طرح وہ ادلہ شرعیہ جن کے دوسرے فقہاء قائل ہیں؛ لیکن احناف ان کے قائل نہیں ہیں، یا قائل ہیں تو بعض شروط وقیود کے ساتھ، ان پر نگاہ نہیں ہو پاتی ہے، خاص کر وہ مصادر جن سے جدید مسائل کا حل متعلق ہے، جیسے: مصالح مرسلہ، عرف وعادت، فتح ذریعہ اور سد ذریعہ، اسی طرح اجتہاد اور تقلید و تلفیق کے اصول، موضوعات ان کتابوں میں زیر بحث نہیں آتے، یہاں تک کہ بہت سے طلبہ وہ ہیں جن کے کان ان عنوانات سے تک آشنا نہیں ہوتے، اسی طرح شریعت کے عمومی مقاصد اور احکام شرعیہ کے مدارج سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے، تاکہ نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے ان کو ملحوظ رکھا جائے ،ان کتابوں سے ان مضامین کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

اس پس منظر میں نصابی نقطہ نظر سے دو باتوں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، اول: یہ کہ اصول الشاشی سے پہلے فن کی اصطلاحات ومبادی پر مشتمل ایک مختصر کتاب جو ایک سہ ماہی میں مکمل ہوجائے، پڑھا دی جائے، جس میں اصطلاحات کی تعریف، مثال اور ضروری قواعد آجائیں، خواہ یہ کتاب عربی میں ہو، یا طلبہ کی مادری زبان میں؛ بلکہ اردو میں میں ہوتو زیادہ بہتر ہے، اس طرح کی بعض کتابیں شائع ہوچکی ہیں، ایسی کسی کتاب کا شروع میں پڑھا دینا طلبہ کے ذہن کو مانوس کرنے اور انہیں اصول فقہ کے مضامین سے قریب کرنے میں بہت ہی معاون ثابت ہوگا''۔

اور آگے فرماتے ہیں:

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ منتہی جماعت کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب بھی

شامل کی جائے جو طریق الحنفیۃ اور طریق الشافعیہ دونوں کو جامع ہو اور مضمون کے اعتبار سے واضح ہو، تاکہ تمام متفق علیہ اور مختلف فیہ مصادر، اصول فقہ کی تمام ابحاث اور اہل سنت کے تمام مکاتب فقہ کے نقطہ نظر سے آگہی حاصل ہو سکے اور وہ کتاب درج ذیل خصوصیات کی حامل ہو۔

اول: اس کی ترتیب وہی ہو جو علامہ ابن ہمامؒ وغیرہ کی ہے۔

دوسرے: اصول فقہ کے سلسلے میں مختلف دبستانِ فقہ کے نقطہ نظر کو انصاف کے ساتھ پیش کیا جائے۔

تیسرے: متفق علیہ ادلہ شرعیہ کے علاوہ مختلف فیہ ادلہ کو بھی ذکر کیا جائے اور اس بات کی وضاحت کی جائے کہ ان ادلہ کے سلسلہ میں کن نکات پر فقہاء کا اتفاق ہے، اور کن نکات پر اختلاف ہے؟

چوتھے: اصول کے ضمن میں احکام شریعت کے مقاصد اور احکام کے مدارج پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

پانچویں: جو اصول ذکر کئے جائیں، ان کی چند روایتی مثالوں ہی کے ذکر کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جائے؛ بلکہ نئی مثالیں بھی درج کی جائیں۔

بحمداللہ ماضی قریب میں مختلف عرب علماء نے ان امور کی رعایت کرتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے؛ لیکن میرے خیال میں ان کتب میں نصابی اعتبار سے شیخ ابوزہرہ اور شیخ خلاف کی کتابیں شاید زیادہ مفید ثابت ہوں؛ کیوں کہ یہ تدریسی نقطہ نظر سے مرتب کی گئی ہیں۔ اور خوشی کی بات ہے کہ بعض اداروں نے اس کتاب کو داخل نصاب کرنے میں پہل بھی کی ہے۔(۱)

تدریس اصول فقہ سے متعلق اکابر کی آراء

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

(۱) ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ کی تدریس مناہج اور طریقے: ۲۳۶، ایفا پبلیکیشنز

’’جو اصطلاحات ملتی جلتی ہیں ان کے درمیان وجوہ فرق کو اچھی طرح بیان کر کے ذہن نشیں کرایا جائے مثلاً یہ بات کہ ’’ظاہر‘‘ اور ’’اشارۃ النص‘‘ میں کیا فرق ہے،؟ ’’نص‘‘ اور ’’عبارۃ النص‘‘ میں نیز ’’دلالۃ النص‘‘ اور ’’قیاس‘‘ میں کیا فرق ہے؟ ’’خاص‘‘ اور ’’معرفہ‘‘ میں نیز ’’عام‘‘ اور ’’نکرہ‘‘ میں کیا فرق ہے؟ ’’عموم مجاز‘‘ اور ’’جمع بین الحقیقۃ والمجاز‘‘ میں کیا فرق ہے؟ ’’عام‘‘ اور ’’مطلق‘‘ میں اور ’’خاص‘‘ اور ’’مقید‘‘ میں کیا فرق ہے۔

اس قسم کی باتوں کو ذہن نشیں کرانے کے لئے صرف کتاب کی مثالوں پر اکتفاء نہ کیا جائے، بلکہ استاذ خود اپنی طرف سے مثالیں سوچ کر جائے؛ بلکہ قرآن وسنت کی مثالوں کے علاوہ روزمرہ کی زندگی میں ہونے والی عام گفتگو سے بھی مثالیں دی جائیں، طلبہ سے وہ مثالیں نکلوائی جائیں اور مثالیں دے کر طلبہ سے سوال کیا جائے کہ دلالت کی کونسی قسم بنی؟‘‘(۱)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

عام طور پر دینی مدارس میں اس موضوع پر ’’اصول فقہ‘‘ ’’اصول الشاشی‘‘، ’’نور الأنوار‘‘ اور ’’حسامی‘‘ داخل نصاب ہیں، بعض مدارس نے شیخ عبد الوہاب الخلاف کی ’’علم اصول الفقہ‘‘ کا بھی اضافہ کیا ہے، جو نصاب میں ایک مفید اور بہتر اضافہ ہے۔

نور الانوار میں چوں کہ لفظی بحثیں اور غالبا طول کلام کسی قدر زیادہ ہے، اس کی وجہ سے کتاب کا بہت کم حصہ سال بھر میں ہو پاتا ہے، اور بہت سی مفید اور اہم بحثیں رہ جاتی ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں نے دار العلوم سبیل السلام میں ’’نور الانوار‘‘ کے بجائے اس کا متن ’’المنار‘‘ پڑھانے کا تجربہ کیا ہے، جو بہت مفید ثابت ہوا۔

اس سے اصول فقہ کے تمام ہی مباحث مناسب طور پر طلبہ کی نگاہ سے گذر جاتے ہیں،

---

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۲۵،۲۶

یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ فن میں بصیرت بلکہ مناسبت کے لئے اصول فقہ کی ایک آدھ اور کتاب بھی داخل نصاب کی جانی چاہیے۔

بحمد اللہ راقم الحروف کو ان کتابوں کی تدریس کا موقع ملا ہے، اور تجربہ ہے کہ فن کی پہلی کتاب ''اصول الشاشی'' حالانکہ زبان وبیان کے اعتبار سے نسبتا سہل الفہم ہے، اور تفریعات کی کثرت کی وجہ سے طلبہ کا ذہن بھی اس کو جلد قبول کرتا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ مدارس کے لئے غالبا اسی کتاب کی تفہیم زیادہ دشوار ہوجاتی ہے، کیوں کہ یہ فن کی پہلی کتاب ہوتی ہے، اکثر فنون میں اب پہلی کتاب اردو میں پڑھائی جانے لگی ہے۔

اس کی وجہ سے ہمارے یہاں معمولی ذہنی صلاحیت کے حامل طلبہ بھی فن کی مبادیات اور اساسیات کو سمجھ لیتے ہیں، اور آئندہ انہیں مضامین کو عربی میں پڑھنا ان کے لئے آسان ہوجاتا ہے، اور غالبا یہ بھی ہمارے ہندوستان کے دینی مدارس کے نصاب کی ایک قدیم روایت ہے۔

ایک زمانہ میں فارسی زبان کا چلن زیادہ تھا، دفاتر کی زبان تک فارسی تھی تو اس عہد میں فارسی زبان میں فن کی پہلی کتاب پڑھانے کا رواج تھا جیسے نحو میں ''نحو میر'' صرف میں ''میزان الصرف'' اور علم الصیغہ منطق میں ''کبری'' وغیرہ۔

اب یہ جگہ اردو نے لے لی ہے، حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ خود عربی زبان میں ان فنون کی تدریس جتنی مفید ہے اردو میں ان کو پڑھانا شاید اس قدر فائدہ مند نہ ہو؛ لیکن مدارس میں جو تعلیمی انحطاط ہے، اور جس کے مختلف اسباب وعوامل ہیں ان کو دیکھتے ہوئے قریب قریب تمام ہی اہل علم کی رائے ہے کہ فن کی پہلی کتاب مادری زبان میں پڑھائی جائے؛ تاکہ طالب علم پر بیک وقت فن اور زبان کا دوہرا بوجھ نہ پڑے۔

اسی مقصد کے تحت اصول فقہ پر یہ مختصر رسالہ ''آسان اصول فقہ'' مرتب کیا گیا ہے کہ ''اُصول الشاشی'' سے پہلے دو تین ماہ میں یہ رسالہ پڑھا دیا جائے، اس کے بعد اصول

الشاشی پڑھادی جائے۔

میں نے اس رسالہ میں حسامی واصول الشاشی کی ترتیب کے بجائے ''مسلم الثبوت'' اور ابن ہمام وغیرہ کی ترتیب کوملحوظ رکھا ہے، اس لئے کہ یہ ترتیب زیادہ فطری اورقریب الفہم ہے۔(۱)

مولانا رضوان القاسمیؒ ناظم سبیل السلام حیدرآباد فرماتے ہیں:

''موجودہ دور میں کچھ تو نئی ایجادات اور اس سے زیادہ بین الاقوامی سطح پر قائم غیر اسلامی سیاسی اور معاشی نظام کی وجہ سے نت نئے قانونی مسائل پیدا ہورہے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا قانونی حل تلاش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فقہی مآخذ، اصول، قواعد فقہ اورطرق استدلال پر گہری بصیرت حاصل ہو اوراس کے لئے اصول فقہ اور قواعد فقہ، ان دوفنون پر توجہ کی ضرورت ہے۔

مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ اصولِ فقہ میں ہمارے یہاں صرف دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اور ان میں بھی بعض کتابیں کتاب اللہ کی بحث سے آگے نہیں بڑھ پاتیں، سنت، اجماع اور قیاس کے کی بحث تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی ہے؛ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے زیادہ توجہ ''قیاس'' کے مباحث پر دی جائے اور ''قواعد فقہ'' کے موضوع پر تو عام مدارس میں سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں پڑھائی جاتی ہے؛ حالانکہ اس موضوع پر علامہ ابن نجیم مصری کی ''الاشباہ والنظائر'' بڑی بصیرت افروز کتاب ہے، ابو زید دبوسی کی ''تأسیس النظر'' بھی احناف کے فقہی کلیات وقواعد کے موضوع پر بڑی عمدہ چیز ہے، اورداخلِ نصاب کئے جانے کی مستحق ہے،،

(۱) آسان اصول فقہ: ۲۳، مؤلف: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

نئی کتابوں میں حکومتِ عثمانیہ ترکی کے وزیر عدل علی حیدر کی گراں مایہ تصنیف ''درر الحکام فی مجلۃ الاحکام'' کا مقدمہ بھی داخل نصاب کیا جاسکتا ہے اسی طرح ''اصولِ فقہ'' پر بھی توجہ کی ضرورت ہے، نیز اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہی مکاتبِ فکر اور علی الخصوص مالکیہ کے اصولِ فقہ کی بھی کوئی کتاب داخلِ نصاب ہو۔(۱)

اصول فقہ کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے شان دار کارناموں کے موضوع پر کوئی کتاب ''اصول فقہ و تاریخ'' اور ''التشریع الاسلامی'' بھی پڑھائی جائیں، تاکہ اس کے ساتھ ساتھ علماء کے فقہی کارناموں کی تاریخ سے ناآشنا نہ رہیں۔(۲)

مولانا ندیم الواجدی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''فقہ کی تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اسے نہایت ٹھوس، جامع اور دور حاضر کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے، اب اصول فقہ کو لیجئے، یہ ایک بنیادی فن ہے اور فقہی مسائل میں کما حقہ بصیرت حاصل کرنا اس فن میں مکمل مہارت پر موقوف ہے، ہمارے مدارس میں اصول فقہ کی تعلیم کا آغاز سال چہارم سے ہوتا ہے، اس سال میں اصول الشاشی پڑھائی جاتی ہے، جو اگرچہ سہل ہے، مگر فن سے مناسبت کے لئے اسے ناکافی سمجھتے ہوئے اب اصول فقہ پر ایک مختصر رسالہ عربی میں بھی پڑھایا جانے لگا ہے بعض مدارس میں عربی کے بجائے قواعد کی تفہیم اور حفظ کے لئے اردو کی مختصر کتابیں بھی پڑھائی جارہی ہیں، سال پنجم میں ''نور الانوار'' پڑھائی جاتی ہے، مگر اس کتاب میں بعض مباحث بڑے مفصل ہیں، اس لئے سال بھر میں کتاب مکمل نہیں ہو پاتی

(۱) دینی مدارس اور عصر حاضر: ۲۷، محمد رضوان القاسمی

(۲) دینی مدارس: مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری،: ۴۲۶، فضل بک سوپر مارکیٹ، کراچی

اور کتاب کے اہم حصے تشنہ تدریس رہ جاتے ہیں، ''حسامی'' طرزِ استدلال میں منطقی رنگ لئے ہوئے ہے، طلبہ مسائل سمجھنے سے زیادہ کتاب کی مشکل عبارتیں حل کرنے میں وقت زیادہ صرف کرتے ہیں، متقدمین کے یہاں اس فن پر بڑی معیاری کتابیں ملتی ہیں (حضرت مولانا یوسف بنوریؒ نے امام ابوبکر جصاص کی کتاب ''الفصول فی الاصول''، شمس الائمہ سرخسی کی ''الاصول'' اور ابوزید دبوسی کی ''تقویم الادلہ'' کی نشان دہی کی ہے، موجودہ دور کے علماء نے بھی اس فن پر بڑا گراں قدر کام کیا ہے، مثال کے طور پر شیخ عبدالوہاب کی کتاب ''علم اصول الفقہ'' جس کی عبارت میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے، اور اس میں موضوع کے تعلق سے بہترین مواد بھی جمع کیا گیا ہے''۔(۱)

آخری زمانے میں جناب ڈاکٹر فاروق حسن صاحب کی ''فن اصول فقہ کی تاریخ'' کی مفصل کتاب سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔(مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

قواعد فقہ

اصول فقہ سے قریب تر ایک موضوع ''قواعد فقہ'' کا ہے اور بعض جہتوں سے قواعد کی اہمیت اصول سے بھی زیادہ ہے، کیوں کہ قواعد فقہ شریعت اسلامی کے مزاج و مذاق اور مقاصد و مصالح واضح کرتے ہیں، ہندوستان کے دینی مدارس کے مروجہ نصاب میں فضیلت تک کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی؛ بلکہ جو طلبہ فضیلت کے بعد تدریب افتاء کرتے ہیں، ان کو علامہ ابن نجیم مصری کی ''الاشباہ والنظائر'' پڑھائی جاتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یہی کتاب، یا اس کی متبادل کوئی اور کتاب یا شیخ زرقاء کی ''شرح القواعد الفقہیہ'' طلبہ کو سبقاً سبقاً زبانی یاد کرائی جائیں، پھر تدریب افتاء کے شعبہ میں اس موضوع کی کوئی کتاب پڑھاتے ہوئے تخریج کا کام لیا جائے کہ وہ کتب فقہ سے ایسے جزئیات کا انتخاب کریں،

(۱) حسن تدبیر: ۲۸۵، مدارس نمبر فروری: ۲۰۱۱

جن پر فقہی قواعد منطبق ہوتے ہوں، اس سے طلبہ کے اندر اپنے عہد کے حالات پر شریعت کے مقاصد ومصالح کی تطبیق اور شریعت کے عمومی قواعد اور اصول کو سامنے رکھ کر مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

اور آگے فرماتے ہیں:

دوسرا اہم پہلو طریقہ تعلیم کا ہے، اصول وقواعد کی تعلیم میں مفید طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تطبیقی تعلیم ہو اور عملی طور پر اس کی مشق کرائی جائے، لیکن صورت حال یہ ہے کہ عام وخاص، ظاہر ومشکل، مطلق ومقید، حروف ومعانی وغیرہ کی مثالیں، جو ان کی کتاب میں مذکور ہیں، قریب قریب وہی مثالیں دوسری کتابوں میں بھی آتی ہیں، اس کی وجہ سے طلبہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اصول زیادہ تر نظری ہیں، ضرورت اس بات کی ہے اصول فقہ کو تطبیقی انداز میں پڑھایا جائے اور تطبیق کے لئے صرف اختلافی مسائل ہی کا انتخاب نہ کیا جائے؛ بلکہ قرآن مجید کی مختلف آیات اور احادیث انہیں دی جائیں اور ان سے خواہش کی جائے کہ وہ ان آیات پر ان قواعد کو منطبق کریں تاکہ جیسے نحوی وصرفی قواعد کو منطبق کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں، یہی صلاحیت ان کے اندر اصول فقہ اور قواعد کی تطبیق کے سلسلہ میں بھی پیدا ہو''۔(۱)

---

(۱) دینی وعصری درسگاہیں: تعلیمی مسائل: ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲

ہمارے نصاب میں اصولِ تفسیر میں بھی بہت کمی ہے یا تو اس موضوع پر سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں پڑھائی جاتی، یا کوئی مختصر رسالہ پڑھا دیا جاتا ہے اور وہ بھی اس رواروی میں گویا صرف ''برکت'' حاصل کرنا مقصود ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ''الفوز الکبیر'' کے ساتھ مفتی شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی (بنگلور انڈیا) کی ''نفحات العبیر فی اصول التفسیر'' اگر شامل کیا جائے تو اصول تفسیر کے مضامین کا کسی قدر استیعاب ہوجاتا ہے، ان سب سے پہلے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا رسالہ ''آسان تفسیر'' بزبان اردو بطور مطالعہ کے اور بطور نصاب وتمرین کے بھی بے حد مفید ہے۔

باذوق اساتذۂ کرام ''مناہل العرفان''، ''علوم القرآن'' کے علاوہ ڈاکٹر علامہ خالد محمود کی ''آثار التنزیل'' (دوجلدیں) زیور مطالعہ رکھیں تو غیر معمولی فائدہ ہوگا، عربی زبان میں طبقات مفسرین، اسرائیلیات وغیرہ پر ایک کتب خانہ تیار ہوچکا ہے، روز بروز اس کے مطالعہ سے فن شناسی کو ترقی دی جاسکتی ہے، حضرت علامہ ابوالحسن علی ندویؒ کے رسالہ ''مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی'' سے تلاوت وتدبر اور مولانا اسلام شیخوپوری کی کتاب ''عشاقِ قرآن'' سے محبت قرآن میں ان شاء اللہ ضرور اضافہ ہوگا۔

علم تفسیر کی تدریس ابتدائی درجات میں

مولانا شمس الحق صاحب رحمہ اللہ ناظم تعلیمات دارالعلوم کراچی فرماتے ہیں:

ابتدائی درجات کے اندر تفسیر قرآن کریم کا عنوان مت رکھیں، ابتدائی درجات ثانیہ/ثالثہ/رابعہ/خامسہ کے اندر ترجمہ قرآن کا عنوان دیں، تفسیر کا نہیں، یہ بہت بڑ غلطی ہے

، بہت بڑے نقصان کا سبب ہے، وجہ کیا ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ درجہ ثانیہ میں جو طالب علم پہلی مرتبہ قرآن کریم کے پارے پڑھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ اسے اس درجے میں مفسر بنانا مقصود نہیں ہے، بے شمار تفسیر نکات مفسرین کے اقوال ، واقعات، شان نزول کی قسمیں اور طرح طرح کے تفسیر مباحث وہ درجہ ثانیہ کے طلباء کے سامنے بیان کر رہا ہے، اور طالب عل کا حال کیا ہے کہ اس قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ پوچھو تو اسے لفظی ترجمہ نہیں آتا، تو یہ بہت بڑی خطا ہے اور کوتاہی ہے کہ ہم نے اس درجے میں تفسیر کا نام رکھ دیا، خدا کے لئے آپ ان درجات کے اندر اس کا نام ترجمہ قرآن رکھیں اور یہ ہی عنوان استعمال کریں اور اس میں اتنا اضافہ کرلیں کہ:

''لفظی ترجمہ قرآن کریم مع مختصر تشریحات''

بالکل یہ بھی نہیں کہ آپ نے خالی ترجمہ کر دیا، اسے سیاق وسباق سے کچھ مثلاً علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی اگر اس کا حاصل بھی آپ طالب علم کو بتا دیں تو اس درجے میں اس کے لئے کافی ہوگا، آپ اس درجے میں تفسیر قرطبی دیکھ آئیں اور تفسیر روح المعانی دیکھ آئیں اور اس کے سامنے بیان کریں تو اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہیں اور اسے بھی برباد کر رہے ہیں، اس لئے عنوان تبدیل کیجئے عنوان یہ ہو ''لفظی ترجمہ قرآن مع ضروری تشریحات ، یہ درجہ ثانیہ میں ہو اور ثالثہ، رابعہ اور رابعہ وخامسہ میں بھی؛ اس لئے کہ ہمارے یہاں دس دس پارے تین درجات میں ہیں، جن درجات میں دس دس پارے ہیں وہاں ترجمہ ہو، اصل مقصود بھی ہی ہے، آپ خود اپنے قلوب میں غور فرمائیں، آپ کا مقصد یہاں طالب علم کو لفظی ترجمہ سکھانا ہے، اگر سارے مباحث بالفرض اس کو پڑھا دیئے، بالفرض اگر ان میں کوئی ذی استعداد ہے اور وہ ان باتوں کو یاد بھی رکھ لے؛ لیکن اسے لفظی ترجمہ نہیں آتا تو آپ کا مقصود حاصل نہیں ہوگا، اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ ضروری فوائد اور تشریحات ہو جائیں تو بہت ہے، ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ترجمہ قرآن جو آپ پڑھا رہے ہیں، درجہ ثانیہ اور ثالثہ میں

دس دس پارے پڑھا رہے ہیں، اس میں آپ بنیادی ترجمہ اور لفظی وٹکسالی ترجمہ کا اہتمام کریں، لفظی ترجمہ قرآن جو آپ پڑھا رہے ہیں، درجہ ثانیہ اور ثالثہ میں دس دس پارے پڑھا رہے ہیں، اس میں آپ بنیادی ترجمہ اور لفظی اور ٹکسالی ترجمہ کا اہتمام کریں، لفظی ترجمہ ہو، طالب علم کو معلوم ہو کہ لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ ہمارے اکابر کی قبور کو نور سے بھر دے، حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کا جو اردو ترجمہ ہے، آج تو اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ''موضح القرآن'' اور وہ ترجمہ جو چھپا ہوا ہے وہ ایسے ٹکسالی دلی کی اردو ہے کہ اس کا سمجھنے والا بہت کم ملے گا ''الطیبات للطیبین'' ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے، اب اس کا ترجمہ کہ ستھری کسے کہتے ہیں ''الخبیثات للخبیثین'' گندیاں ہیں گندوں کے لئے، اتنا پیارا، اتنا لذیذ، اتنا جامع، اور مختصر ترجمہ (الطیبات) کا ستھری سے بہتر ترجمہ کوئی نہیں ہوسکتا، تو اگر آپ اس کی اردو سمجھ سکتے ہیں تو اسی کو دیکھ لیا کریں، اس میں لغوی ترجمہ ایسا ٹکسالی ترجمہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس لغت کا اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ نہیں، تو اس کا اہتمام کیجئے کہ لغوی ترجمہ آئے، لغت میں اس کے کیا معنی ہیں اور عبارت میں اس لفظ کے معنی کو کس طرح پرویا گیا اور سمویا گیا۔

ایک بات ترجمے کے ذیل میں یہ ہے کہ (میں ترجمے کا عنوان اختیار کر رہا ہوں، تفسیر کا نہیں) لغات کے معنی کے ساتھ صیغوں کا اہتمام کیجئے، قرآن کریم میں جو صرفی صیغے ہیں استعمال کئے ہیں، آپ طالب علم سے پوچھیں:

یہ کس باب سے ہے؟

کس وزن پر ہے؟

کونسا صیغہ ہے؟

اشتقاق کیا ہے؟

قرآن کریم سے زیادہ بہتر کتاب ادب، صرف اور نحو کی تمرین کے لئے اور کوئی نہیں

مل سکتی، اگر قرآن کریم میں کوئی شخص تمرین کرادے فن صرف واشتقاق، فن نحو کی، ادب کی، تو اس کو دوسری کتاب پڑھنے کی حاجت کم پیش آئیگی۔

درجہ ثالثہ میں دوسری بات آپ کو یہ کرنی ہے کہ حل لغات کے بعد آپ اس میں نحو وصرف کے صیغوں اور ترکیب کا اہتمام کریں، اس کو آیات کی، ہر آیت کی نہیں، جو ترکیب کے لحاظ سے پیچیدہ ہیں، کوئی ابہام واشکال ہو اسکی ترکیب ہونی چاہئے، صیغے آئیں ان کے اشتقاق اس میں ہونے چاہئے۔

بس اتنا کام آپ کو کرنا ہے، ترجمہ قرآن برائے درجہ ثانیہ وثالثہ:

لفظی ترجمہ آئے۔

لغات کے معانی آئیں۔

اس کے ساتھ صرفی اشتقاقات۔

نحوی ترکیب۔

خاص طور سے عم سپارہ میں ہمارے طلباء لغات پوچھیں، انہیں لغات پوچھیں، انہیں لغات بہت کم یاد ہونگی، وہ بالکل ابتدائی درجہ میں پڑھایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں تفسیر بیان کردی، لیکن لغات نہیں ہوا، آپ نے اس کے صیغوں کا اور ترکیب کا اہتمام کا اہتمام نہیں کیا، اس پر آپ خدا کے لئے زور دیجئے، اسکا اہتمام کیجئے اور اس سے زائد کوئی تفسیری مباحث نہ بیان کیجئے، بس اس کا مفہوم مختصر تشریح کے ساتھ ثانیہ میں بھی اسی طرح ثالثہ میں بھی اسی طریقہ سے، پھر رابعہ، قرآن کریم کے دس دس پارے اسطریقہ سے پورے ہوجائیں، انشاءاللہ۔

دیکھئے ان درجات میں قرآن کریم کا جو ترجمہ ہے ثانیہ، ثالثہ میں اس کا مقصود تو یہ ہے کہ قرآن کریم کا لفظی ترجمہ آئے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ قرآن نحو اور صرف کے اعتبار سے جب آپ پڑھیں گے، ان کے قواعد کے اجراء کے ساتھ تو نحوی قواعد کا بھی آپ کو استحضار ہوگا، ادب کا، لغات اور الفاظ کا

بھی استحضار ہوگا، تو گویا کہ پھر قرآن کا ترجمہ ہی نہیں آیا؛ بلکہ نحوی ضوابط وقوانین بھی پختہ ہوئے، صرف قواعد بھی پختہ ہوئے۔

اور اس کے ساتھ ادب کے تقاضے بھی پورے ہوئے، ادبی لحاظ سے قرآن کریم دیکھئے، یہ تینوں چیزیں تابع ہیں؛ لیکن ذریعہ ہیں قرآن کریم کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کا، ترجمہ آپ کرلیں؛ لیکن نحو کے قواعد کا اجراء آپ نہ کریں، بات نامکمل رہے گی، ترجمہ آپ مکمل کر ہی نہیں سکتے، جب تک کہ آپ نحوی قواعد کا اجراء نہ کرلیں، اسے پتہ نہیں کہ یہ فاعل ہے، مفعول ہے، حال ہے، ذوالحال ہے، تمیز ہے، وہ ترجمہ کیا کرے گا، جب تک آپ اسے یہ نہ بتلائں کہ یہ حال یہ تمیز ہے کونسا مفعول ہے، کونسا مفعول ہے، ترجمہ صحیح نہیں کرسکتا؛ اس لئے ان قواعد کا اجراء معین بنے گا قرآن کے صحیح ترجمہ کے واسطے۔

ان درجات میں نے عرض کیا کہ تفسیر کا عنوان نہ رکھیں، اور ان درجات کی مثال ایسے سمجھ لیجئے جیسے کہ ہمارے یہاں درجہ ثانیہ میں ''زادالطالبین'' پڑھاتے ہیں اور درجہ رابعہ میں ''ریاض الصالحین'' پڑھاتے ہیں، اب ''زادالطالبین'' اور ''ریاض الصالحین'' حدیثیں ہی ہیں، اور درجہ ثانیہ میں آپ کو وہ پڑھاتے ہیں تو یہاں ''زادالطالبین'' پڑھانے سے آپ کا مقصود کیا ہے، یہاں مقصود اس کو محدث بنانا تو نہیں ہے ''زاد الطالبین'' کی ایط حدیث ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده'' اگر وہ پڑھتا ہے اب آپ اس میں مشکوۃ کی اور صحاح ستہ کی اگر تقریر کرنے بیٹھ جائیں اس کے سامنے تو بتلائیں کہ یہ کوئی محل ہوگا اس کا؟ یہاں مقصود محدث بنانا تو نہیں اسے، یہاں اس کے دو مقصود ہیں:

ایک یہ ہے کہ اس کو حضور ﷺ کے مختصر مختصر جوامع الکلم یاد کرالئے جائیں، استحضار ہوجائے، ابتدائی درجہ میں چھوٹی چھوٹی حدیثیں ہیں، مختصر مختصر جملے ہیں، یہ یاد ہوجائیں گے، اس کو آگے کام آئیں گے، اس کے معارف وحقائق آگے سمجھئے گا۔

دوسرا مقصود اس کا یہ ہے کہ ان ہی احادیث میں آپ اجراء کرائیں کہ یہاں اس جگہ میں مبتداء کون ہے؟ ذوالحال اور حال کون ہے؟ نحوی اجراء اور صرف کے اشتقاقات،

مبادی مآخذ، ان کا اجراء کرنا مقصود ہے، ادبی لغات بھی اس کو معلوم ہوں گے، لیکن نحوی صرفی اجراء اصل مقصود ہے ''زاد الطالبین'' کا مقصود محدث بنانا نہیں ہے، اب ایک استاذ ''زاد الطالبین'' پڑھا دیتا ہے، ترجمہ کر دیتا ہے، ایک حدیث کا اور لمبی چوڑی تفصیلی مباحث بیان کر دیتا ہے، اس نے ''زاد الطالبین'' کا حق ادا نہیں کیا، اسے چاہئے کہ اس کی مختص حدیثیں طالب علم کو یاد کرا دے اور نحوی ترکیب کا اجراء کرا دے، مبتداء ہے، خبر ہے، جملہ انشائیہ ہے ،خبریہ ہے، اس کے بغیر اس کا حق ادا نہیں ہوگا۔

یہی حال بعینہ ''ریاض الصالحین'' کے اندر ہے، ''ریاض الصالحین'' کے اندر بھی محدث بنانا مقصود نہیں ہے، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مقصود معاشرت اور معاملات کی تربیت کرنا ہے، مثلاً ''ریاض الصالحین'' کا باب الادب پڑھاتے ہیں، تو باب الادب کے اندر اس کو کیا بتلانا ہے، نحوی صرفی تو وہ سیکھ کر آ چکا ہے، اور ابتدائی درجہ میں اجراء کر چکا ہے، اب بیان اس سے مقصود:

اس حدیث کے اندر آپ ﷺ کے آداب معاشرت کیا ہیں؟ وہ بیان کرنا ہے، حضور اکرم ﷺ کے معاملات کا طریقہ کیا تھا، لمبی چوڑیں بحثیں مقصود نہیں، بس اس پر آپ معمولی تفصیل کے ساتھ اس کو وہ حدیث پڑھا دیں، اس کے بعد صحاح ستہ پڑھے گا، اس کے مباحث آ جائیں گے، اب جو حیثیت ''زاد الطالبین'' اور ''ریاض الصالحین'' اور ان کے پڑھانے کے مقاد ہیں وہی مقصد ابتدائی درجات میں قرآن کریم کے ترجمہ پڑھانے کا ہے، وہاں لفظی ترجمہ اور نحوی صرفی قواعد کا اجراء ہو۔

علم تفسیر کی تدریس انتہائی درجات میں

اب آیا ہے درجہ با قاعدہ تفسیر کا، چھٹے درجہ میں ہمارے یہاں ''جلالین'' پڑھائی جاتی ہے، ساتویں درجہ کے اندر بیضاوی پڑھاتے ہیں، یہ درجات وہ ہیں کہ ان میں طالب علم ذہنی اعتبار سے بھی مضبوط ہو جاتا ہے، استعداد میں بھی اس کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور مختلف علوم کے مسائل وقواعد بھی اسے مستحضر ہو جاتے ہیں، اب یہاں اس کے لئے قرآن

کی تفسیر تفسیر ہونے کی حیثیت سے پڑھنے کے اندر سہولت ہوتی ہے؛ لہٰذا ان سارے علوم کی روشنی کے اندر جلالین پڑھتا ہے تو جلالین کے اندر ہمارے مدارس میں ایک طرز پڑا ہوا ہے کہ جلالین پڑھانے میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بس جلال الدین سیوطی نے جلال الدین محلی نے مقدرات نکال دیئے ہیں، ان مقدرات کا ترجمہ کردیتے ہیں، تفسیر کے آگے جو مقدرات عبارت نکالی جو تفسیری کلمات انہوں نے ذکر کئے ہیں، یا قراءت کا جو اختلاف بیان کیا ہے، اس کا ترجمہ کردیتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بات ''جلالین'' میں کافی نہیں، ''جلالین'' کے اندر پڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان مقدرات کا جو مفسر نے نکالے ہیں آیت کے ساتھ ان کا ربط بیان کریں، کہ یہ مقدر عبارت جو نکالی جارہی ہے، اس آیت کے ساتھ اس کی کیا مناسبت ہے، اور اس تقدیر کے بغیر اس عبارت کا مطلب نہیں سمجھا جاسکتا، اس مقدر عبارت کے ساتھ گہرا تعلق اور بغیر اس مقدر کے نکالے ہوئے عبارت کا قرآن کریم کی آیت کا مطلب نہ سمجھنا یہ اس طالب کو بتایا جائے، کہ اگر یہ عبارت مقدر نہ نکالی جائے تو آیت کا مطلب نامکمل رہے گا، سمجھ میں نہیں آئے گا، خالی ترجمہ کردینا کافی نہیں، اس مقدر آیت کے ساتھ ربط بیان کیجئے، اس کی مناسبت بیان کیجئے، اس پر موقوف ہونا بیان کیجئے، یہ ضروری ہے ورنہ آپ نے مقدر کا ترجمہ کردیا طالب علم کچھ سمجھا نہیں کہ تقدیر مصنف نے کیوں نکالی، بعض وقت مصنف تقدیری عبارت نکالتے ہیں، اس کے اندر کسی اشکال کا جواب دینا ہوتا ہے، بعض مرتبہ کسی نحوی ترکیب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مقدر عبارت اس لئے نکالی، آپ نے اس کو بتلایا ہی نہیں۔

دوسری بات ''جلالین'' میں اس سے زیادہ اہم، وہ یہ ہے کہ وہاں آپ آیات کی ترکیب کا اہتمام کریں اور قرآن کریم کی آیات کے جو مقدرات ہیں ان کی بھی ترکیب کریں اور نفس آیات کا بھی ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ ترکیب نحوی کریں۔

جلالین کے اندر ترکیب کا رواج ہمارے مدراس کے اندر تقریباً معدوم ہے، میں

نے الحمدللہ بہت عرصہ ''جلالین'' پڑھائی، ساری کتابیں الحمدللہ عرصہ دراز تک ہوتی رہیں، تقریباً اٹھارہ سال تک میں جلالین پڑھاتا رہا، اس کا ہمیشہ اہتمام کرتا تھا کہ قرآن کریم کی آیات کی ترکیب ار جو مقدرات وہاں پر ہیں ان کی ترکیب اور جو بات میں نے عرض کی کہ ضرورت کیا ہے، اور مناسبت اس کی آیت سے کیا ہے، اس کا اہتمام کئے بغیر میں بالکل نہیں چلتا تھا، چنانچہ اس کا طلبہ کو بہت فائدہ ہوا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ''جلالین'' کا جو حاشیہ ہے، اس حاشیہ میں رطب و یابس بہت ہے، بعض چیزیں سقیم ہیں، اور جمہور کے مسلک کے خلاف تفردات ہیں، تو ان حاشیوں کو طلبہ دیکھتے ہیں اور وہ حاشیہ دیکھ کر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ شاید قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے، آپ اس کی فکر کیجئے کہ جلالین کے حواشی میں جو رطب و یابس اور صحیح وسقیم چیزیں ہیں، ان میں تمیز بیان کریں، طالب علم کو یہ بتائیں کہ یہ بات یہاں سقیم ہے، یہ بات صحیح ہے اور یہ بات کمزور ہے، یہ بات یہاں غلط ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، جیسا کہ ہاروت و ماروت کے واقعہ کے اندر اس قسم کی بڑی لمبی چوڑی بحثیں وہاں کی گئی ہیں، اسی طریقہ سے ''تلک الغرانیق العلی'' کے اندر سورۃ نجم کی تفسیر کے اندر اس قسم کی باتیں حواشی کے اندر ہیں، طلبہ کو یہ بتلانا چاہئے کہ یہاں صحیح یہ ہے، سقیم یہ ہے اور آیت کے صحیح توجیہ کر کے بتلائیں کہ یہ ہے اصل توجیہ آیت کی صحیح مراد یہ ہے مرتب کرے، یہ بات آپ کب کر سکتے ہیں؟ یہ جب کر سکتے ہیں جب جلالین کے ساتھ ساتھ دوسری تفاسیر کو بھی دیکھیں۔

''جلالین'' کی تفسیر کے لئے آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ دوسری تفسیروں کا مطالعہ کریں؛ تا کہ جو باتیں یہاں اجمال ہیں وہ ذرا تفصیل سے آجائیں، سقیم باتیں حواشی کے اندر ہیں تو اس کی اصلاح ہو جائے، صاوی اور جمل یہ دو حواشی عام طور پر مشہور ہیں، صاوی کے بارے میں تو عام طور پر یہ تاثر ہے اور خود بھی تجربہ ہے کہ اس کی بہت سی باتیں ضعیف ہوتی ہیں، کچھ مبتدع بھی معلوم ہوتے ہیں، کچھ میلان ان کا ابتداع کی طرف ہے،

اس لئے اس پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہئے، جمل البتہ ایسی ہے کہ وہ مقدرات اور ترکیب وغیرہ کے بارے میں معتبر ہے۔

لیکن میرا مشورہ آپ حضرات کو یہ ہے کہ آپ تفسیر پڑھانے کے لئے جلالین پڑھائیں تو اس وقت خاص طریقہ پر ان تفاسیر کو اپنے مطالعہ میں رکھیں، آپ اپنے مطالعہ میں ''تفسیر مدارک'' کو مقدم رکھیں، علامہ نسفی کی تفسیر مدارک نہایت ہی مفید اور نہایت ہی جامع اور مختصر اور مسلک کے اعتبار سے بھی حنفی، اس کو اپنے مطالعہ میں بالالتزام رکھئے، اس کے بعد دوسری تفسیر جو آپ کو مزید مباحث کے لئے مفید ہوگی تفسیر مظہری ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ بیک وقت مفسیر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، قاضی بھی ہیں، حنفی بھی ہیں، اس لئے یہ تمام مباحث کو ہر حیثیت سے بیان کرتے ہیں، اور قابل اعتماد طریقہ پر بیان کرتے ہیں۔(۱)

اور خود قرآن مجید سے بڑی غفلت برتی ہے، ہمارے یہاں عام طور پر تفسیر کی دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ''تفسیر بیضاوی'' اور ''جلالین'' بیضاوی سے ظاہر ہے کہ قرآن کی اصل روح سامنے نہیں آتی؛ بلکہ قاری صرف لفظی گورک دھندوں اور موشگافیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ بھی صرف سورہ بقرہ کی حد تک ہوتی ہے، اور جلالین تو گویا قرآن کا محض عربی ترجمہ ہے، بس یہی کل کائنات ہے، حالانکہ اس کی شدید ضرورت ہے کہ ابتداء مفردات قرآن اور ان کی لغوی تشریح وترکیب پر کوئی کتاب پڑھائی جائے، نمونہ کے طور پر مولانا عبدالصمد رحمانی کی ''تیسیر القرآن'' پیش کی جاسکتی ہے، پھر متوسط جماعتوں میں ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ تین سالوں میں پورے قرآن کا پڑھا دیا جائے، اور اس کے بعد تفسیر کی مختلف کتابوں اور مختلف رنگ میں لکھی گئی تصانیف کو ملا کر پورے قرآن مجید کی تفسیر پڑھا دی جائے۔(۲)

---

(۱) تحفہ المدارس: یعنی آپ مثالی استاذ بن کر آپ تدریس ایسے کریں ۱۳۶۔ ۱۴۳، ادارۃ الرشید، کراچی

(۲) دینی مدارس اور عصر حاضر: ۲۸ مولانا، محمد رضوان القاسمیؒ

ڈاکٹر محمد عتیق اور مولانا شاجہاں قاسمی فرماتے ہیں:

''جلالین اور بیضاوی اکثر مدارس میں داخل درس ہیں، جب کہ زبان و بیان اور لب ولہجہ کے لحاظ سے ایک نہایت مختصر اور دوسری بہت دقت طلب ہے، ان کے مقابلے میں ''روح المعانی''، ''کشاف''، ''ابن کثیر'' زیادہ آسان اور عام فہم ہیں۔ دور حاضر کی تصانیف میں ''تفسیر مظہری'' اور ''تفسیر فی ظلال القرآن'' سے بھی طلبہ عہد جدید کی زبان ولب ولہجہ اور تحقیقات کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں''(۱)

(۱)　دینی مدارس: مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری،:۴۲۱=۴۲۲،فضل بک سوپر مارکیٹ، کراچی

فن حدیث واصول حدیث

حدیث پڑھانے کا طریقہ

۱) حدیث کے متعلق طلبہ سے کچھ سوالات کئے جائیں اور طلبہ کے عقائد پختہ کئے جائیں۔

۲) حدیث کے ذریعے دینی ذوق اور بیداری پیدا کی جائے، اچھی عادت واخلاق کا عادی بنایا جائے۔

۳) حدیث کو موجودہ حالات سے جوڑا جائے، اور موجودہ مشکلات کا حل حدیث سے بتایا جائے۔

۴) حدیث کا شانِ ورود بتایا جائے۔

۵) تمام طلبہ سے حدیث عمدہ انداز میں پڑھوائے؛ تاکہ بچوں کی عبارت واعراب صحیح ہوں۔

۶) مشکل الفاظ کے معنی بورڈ پر لکھ دے یا زبانی لکھوائے۔

۷) حتی الامکان طلبہ سے ہی حدیث کا ترجمہ، تشریح ومطلب کہلوائے۔

۸) اس حدیث کے جو مسائل وآداب مستنبط ہوئے ہیں ان کو بتائے یا بورڈ پر لکھ کر دے اور مکمل تشریح کرے۔

۹) چھوٹے طلبہ کو نمبر سے حدیث کا سوال کر سکتے ہیں؛ لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ حدیث کا مفہوم وعنوان سامنے رکھ کر سوال کیا جائے مثلاً نیکی کا راستہ دکھانے والی حدیث کیا ہے؟ اور کیا ثواب ملتا ہے؟

۱۰) حدیثیں منتخب کر کے دیں اور ان کو حفظ کرنے کی تلقین وتاکید کریں۔
۱۱) حدیث کی صرفی، لغوی، نحوی تحقیق پہلے خود کریں پھر طلبہ سے زبانی کروائیں۔

دورۂ حدیث کو دو سالوں میں منقسم کر دینا چاہئے۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ صاحب فرماتے ہیں:

''نصاب کے سلسلے میں آخری گذارش یہ ہے کہ قوی کے مسلسل انحطاط اور مسائل کی پیچیدگیوں کی بناء پر عرصے سے یہ بات محسوس ہو رہی کہ دورہ حدیث کے لئے ایک سال کی مدت ناکافی ہے اس مختصر وقت میں حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہو پاتا، اور عموماً یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے صرف معدودے چند ابواب تحقیق وتفصیل کے ساتھ پڑھ پاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے اور اس کے بعد کے حصے تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں، ایک صحیح بخاری ہی کو لے لیجئے، استاذ اور شاگرد شب وروز مثالی محنت کرنے کے باوجود آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں؛ حالاں کہ واقعۃً یہ حصہ ایسا نہیں جسے روا روی میں گزار دیا جائے۔

اسی طرح دورہ حدیث کی بعض انتہائی اہم کتب مثلاً طحاوی شریف اور مؤطین اسی وقت کی قلت کی بناء پر اکثر برائے نام ہوتی ہے، حالانکہ ان کو اہتمام کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے اگر دورہ حدیث کو دو سالوں پر منقسم کر دیا جائے تو امید ہے کہ انشاء اللہ علم حدیث کے ساتھ مطلوب مناسبت پیدا ہو سکے گی اور طالب علم حدیث کے تمام ابواب علی وجہ البصیرۃ پڑھ سکے گا اور اسکے ساتھ اصول حدیث کی کوئی معیاری کتاب مثلاً ''تدریب الراوی'' یا ''فتح المغیث'' وغیرہ بھی اہتمام کے ساتھ ہو سکے گی جو ایک حدیث کے طالب علم کے لئے

ازبس ضروری ہے''۔(۱)

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کی زبانی حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب حدیث کی تدریس کے اصول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''چونکہ حدیث میں آپ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے، اس لئے درس حدیث میں تحقیق مذاق آپ کو اپنے شیخ سے ورثے میں ملا تھا، لیکن آج کل ایسا بکثرت ہونے لگا ہے کہ تحقیق مباحث کے پھیلاؤ میں حدیث کا متن اس کے معانی ومطالب، اس کا اصل پیغام اور اس سے حاصل ہونے والے عملی فوائد پس پشت چلے جاتے ہیں، اور استاذ وطالب علم کی تمام تر توجہ فقہی اختلافات، سند کی بحثوں اور رواۃ کی جرح وتعدیل پر مرکوز ہو جاتی ہے، حضرت والد صاحب قدس سرہ اس رجحان کے سخت مخالف تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اس طرز عمل کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کچھ لوگ آم کے درخت کے نیچے جمع ہو کر آم کی تاریخ اس کی مختلف قسموں اور اس کے رنگ وبو پر بحث کر کے اٹھ جائیں اور انہیں عمر بھر آم کے کھانے کی توفیق نصیب نہ ہو، چنانچہ اس طرز عمل کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو علم حدیث سے متعلق مشہور فقہی اور اسنادی مباحث تو یاد ہو جاتے ہیں، لیکن متن حدیث یاد نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات نہ اس کا صحیح ترجمہ کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے عملی مسائل میں اس حدیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟ حالانکہ حدیث کو پڑھنے پڑھانے کا اصل مقصد یہی تھا، اور تمام مباحث اضافی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ: حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں شرح حدیث کے اس پہلو کا بھی حق ادا کیا ہے، وہ جہاں حدیث کے مرکزی موضوع پر مفصل بحث کرتے ہیں، اور وہاں سے حاصل ہونے والی دوسری ہدایات پر بھی ''وفیہ۔۔وفیہ'' کہہ کر متنبہ کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کی درس حدیث کی یہی شان تھی، آپ کے حدیث

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۶۱، مفتی تقی عثمانی صاحب، ہمارا تعلیمی نظام: ۱۰۵

حدیث سے جہاں تحقیقی معلومات کا ایک ذخیرہ طالب علم کو حاصل ہوتا تھا، وہیں تواضع ایثار، خشیت وللّٰہیت اور دوسرے اسلامی اخلاق وآداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہوتی رہتی تھی۔

اور مزید فرماتے ہیں:

آج کل اکثر وبیشتر مدارس میں درس حدیث کا یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ حدیث کے جو ابواب مفصل فقہی اور اختلافی مباحث پر مشتمل ہوتے ہیں، ان میں تو تقریر بڑے زور وشور سے ہوتی ہے، لیکن ان مخصوص ابواب کے بعد درس اتنی تیزی سے چلتا ہے کہ طلبہ حدیث کے مفہوم سے بھی بے خبر رہتے ہیں، چنانچہ فضائل، ومناقب، آداب واخلاق، سیر ومغازی فتن اور اشراط الساعۃ کی ضروری تلاوت کر لیتا ہے، اور بس! حضرت والد صاحبؒ اس طرز عمل کے بہت مخالف تھے، اور فرمایا کرتے تھے: 'درس حدیث میں ''روایۃ ودرایۃ'' کی تفریق عہد حاضر کی بدعت ہے، اسلاف میں اس کا کوئی نام ونشان نہیں، بلکہ شروع سال سے ہی معتدل انداز اختیار کیا جائے کہ تمام ابواب کے تحت ضروری معلومات طالب علم کے سامنے آجائیں، اور درس حدیث کا اصل فائدہ حاصل ہو۔

اس کے علاوہ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ: درس حدیث میں جو فقہی اختلافات اور ان کے مفصل دلائل بیان کئے جاتے ہیں، ان کا مقصد جہاں اپنے مسلک کے دلائل کی وضاحت اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے، وہاں اصل مقصد طالب علم میں تحقیق ونظر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے؛ تاکہ اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حدیث سے مسائل واحکام کا استخراج متعارض احادیث میں تطبیق اور احادیث صحیح وسقیم کی تحقیق کن اصولوں کے تحت کس طرح کی جاتی ہے؟ چنانچہ جب سال بھر تک اس قسم کے مباحث طالب علم کے سامنے آتے رہتے ہیں، تو اس سے ایک مزاج پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے آئندہ بساط کے مطابق تحقیقی کام کر سکتا ہے، لہٰذا ان مباحث کے دوران استاذ کو چاہئے کہ وہ یہ دیکھتا رہے کہ طالب علم میں یہ مزاج پیدا ہوا یا نہیں، استاذ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنا طالب علم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے، لیکن جن اصولوں کے تحت یہ مباحث ہوتے ہیں ان کا محفوظ ہو جانا

ضروری ہے۔

اور حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مفتی شفیع صاحب کے تدریس حدیث کے انداز کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور چونکہ ان مباحث کا مقصد وہ ہے جو اوپر بیان ہوا، اس لئے ان مباحث میں جو مسائل ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات سے متعلق ہیں، ان کو بیان کرتے وقت یہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہئے، جیسے حق وباطل کے درمیان معرکہ ہے، یہ اختلافات مکمل طور سے اخلاص اور علمی دیانتداری پر مبنی ہیں، اوران کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطا'' اور دوسرے کے مسلک کو'' خطا محتمل الصواب'' قرار دیا جائے؛ لہٰذا ان مسائل پر گفتگو کے دوران فریق ثانی کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اورس سلسلے میں مناظرانہ انداز سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے، جو حضرات جوش تقریر میں امام بخاری، امام دارقطنی، امام بیہقی، یا حافظ ابن حجر کی تردید کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیتے ہیں، جو ان حضرات کے شایان شان نہیں ہوتے، حضرت والد صاحبؒ ان پر سخت نکیر فرماتے، اور اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ: حافظ ابن حجر ہوں یا علامہ عینیؒ یہ سب حضرات صدیوں پہلے جنت میں اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں، ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو''

اس کے علاوہ مفتی تقی عثمانی صاحب حضرت مفتی شفیع صاحب کا انداز تدریس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسی طرح حضرت والد صاحب قدس سرہ اس طرز عمل کے بھی سخت

مخالف تھے کہ کسی خاص مسلک کا دفاع کرتے ہوئے کسی حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر اس مسلک پر فٹ کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے دور از کار تاویلات کا راستہ اختیار کیا جائے، اس کے بجائے آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر قرآن وحدیث کے دوسرے دلائل کی روشنی میں حدیث کی کوئی بے تکلف توجیہ ہوسکتی ہو تو اسے اختیار کیا جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو واضح طور پر یہ اعتراف کر لیا جائے کہ اس سے فلاں مجتہد کا مسلک ثابت ہوتا ہے، البتہ اس کے مقابلے میں اپنے امام کی دلیل اور ان کے قول کا ماخذ بھی بیان کر دیا جائے، اور اس کی جو بے تکلف وجوہ ترجیح موجود ہوں انہیں واضح کر دیا جائے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہوا ہی اس مقام پر ہے جہاں دلائل کی رو سے دونوں راہوں کی گنجائش موجود تھی، لہذا یہ ثابت کرنے کی فکر کہ دوسرا مسلک بلا دلیل ہے، بڑی نادانی کی بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ دلائل دونوں طرف موجود ہیں، اور کسی ایک مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے، جہاں دلائل متعارض ہوں، اس لئے اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ مان لیا جائے یہ شافعیہ یا حنابلہ یا مالکیہ کے مسلک پر دلالت کرتی ہے تو یہ واقع کے عین مطابق ہوگا، کیوں کہ اگر اس مسلک پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہ حضرات اسے اختیار ہی کیوں فرماتے۔

اس ضمن میں حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے ۵۴ھ میں جو پہلا حج کیا تو وہاں حرم مکہ میں حدیث کے مختلف درس ہوا کرتے تھے، ان میں شرکت کی تو ان کا طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ حدیث میں تاویلات کرنے کے بجائے ایک ہی بات کی مختلف احادیث آتیں تو

ایک حدیث کے تحت فرماتے "فيه حجة ساداتنا المالكية" پھر اس کے مخالف دوسری حدیث آتی تو فرماتے: "فيه حجة ساداتنا الحنفية" (۱)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ حدیث کے درس کے اصول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسباق میں طویل تقریر کے بجائے کتاب سے استنباط پر زیادہ توجہ دلائی جائے تو زیادہ مفید ہے کہ اس سے قابلیت پیدا ہوتی ہے، تقریر اور شرح سامنے نہ ہو تب بھی الفاظ سے اخذ مطلب واستنباط کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، اسباق حدیث ومطالعہ میں باوضو رہنا موجب برکت ہے، علم کی کتابوں کی قدر شناسی بہت ضروری ہے، جامع بیان العلم میں لکھا ہے: "إن من بركة العلم أن تضيفه إلى أهله" جو بات جہاں سے لی جائے اس کی طرف اس کی نسبت کردی جائے، اس کو اپنے ذہن کی اختراع نہ بتایا جائے، بیان کرنے یا سمجھنے میں اگر چوک ہوجائے تو اس سے رجوع ہونے میں عار نہ ہو"۔ (۲)

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ انعام الباری شرح بخاری کے مقدمے میں حدیث کی تدریس کے اصول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تدریس کے سلسلے میں بندے کا ذوق یہ ہے کہ شروع میں طویل بحثیں کرنے اور آخر میں روایت پر اکتفا کرنے کے بجائے سبق شروع سے آخر تک توازن سے چلے، بندے نے تدریس کے دوران اس اسلوب پر عمل کی حتی الوسع کوشش کی ہے، نیز جو خالص کلامی اور نظریاتی

---

(۱) میرے والد میرے شیخ: ۷۹ تا ۸۳

(۲) تربیت الطالبین، ما یتعلق بالمدارس: ۲۶۰، محمد فاروق غفرلہ، جامعہ محمودیہ، میرٹھ

مسائل جو ان فرقوں سے متعلق ہیں، جواب موجود نہیں رہے، ان پر
بندے نے اختصار سے کام لیا ہے، تا کہ مسائل کا تعارف تو طلبہ کو ضرور
ہو جائے، لیکن ان پر طویل بحثوں کے نتیجے میں دوسرے اہم مباحث کا
حق تلف نہ ہو''(۱)

درس حدیث میں حاضری کی اہمیت اور اس کے فوائد

ان احادیث میں مباحث بھی آئیں گے، لمبی چوڑی تقریریں بھی ہوں گی اور بعض اوقات طلبہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر کتاب کی تقریریں چھپی ہوئی ہیں، اور اگر چھپی ہوئی نہیں ہیں تو طلبہ فوٹو اسٹیٹ کرا کر رکھ لیتے ہیں، اس میں ساری تقریریں لکھی ہوئی ہیں، اگر کوئی سبق چھوٹ گیا یا سبق کا کوئی حصہ رہ گیا تو کچھ غم نہیں، اس واسطے کہ اس تقریر مطبوعہ یا فوٹو اسٹیٹ کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے، اس علم میں تقاریر اور مباحث ثانوی چیز ہے، اس میں اصل مقصود یہ ہے کہ یہ احادیث ہم کو سند متصل کے ساتھ نبی کریم + تک حاصل ہو جائیں، یوں بھی خیال آسکتا ہے کہ بخاری شریف کی اور شروحات بھی چھپی ہوئی ہیں، بس مطالعہ کر لیا جائے، کسی استاذ سے پڑھنے کی کیا ضرورت؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس علم میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ یہ احادیث جب سند متصل کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں تو اس کے انوار و برکات اور اس کے فوائد اور ہوتے ہیں، اور مطالعہ کر کے جو حدیث پڑھ لی جاتی ہے، اس کے فوائد کچھ اور ہوتے ہیں، درس حدیث کے دوران جو یہ جملہ کہا جاتا ہے:

''بالسند المتصل منا إلى الإمام البخاري رحمه الله قال حدثنا الحميدي''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا دامن اس سلسلۃ الذہب کے ساتھ لا کر جوڑ دیا جائے، جس کی انتہا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو رہی ہے، اگر گھر میں مطالعہ کر کے تم حدیث پڑھو، اگر استعداد اچھی ہے تو ترجمہ وہاں بھی آ جائے گا، اور اگر کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا تو شرح اور حاشیہ سے بھی سمجھ میں آ جائے گا، اس سے بھی نہیں آ رہا تو لغت کی مدد سے سمجھ میں آ جائے گا،

(۱) انعام الباری: ۱/ ۴، مقدمہ، مکتبۃ الحراء، کراچی

لیکن احادیث کو"صدرا عن صدر" سینہ بہ سینہ حاصل کرنے کی جو برکات ہیں تنہا مطالعہ کرنے سے وہ حاصل نہیں ہوسکتیں۔

علم حدیث اور استاذ کی حقیقت

جب کسی استاذ کے پاس جا کر حدیث پڑھی جاتی ہے، تو اس کی برکات اور انوار کچھ اور ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا فہم اور فیضان فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اساتذہ کے ذریعے طالب علم کے قلب پر علوم کا فیضان فرماتے ہیں نہ اس کے پاس کچھ قدرت ہے نہ اپنا ذاتی کوئی علم ہے، نہ اسکے پاس کوئی اور طاقت ہے کہ وہ تمہیں کوئی چیز عطا کردے، معطی حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہی دیتے ہیں، لیکن وہ دینے کے لئے بعض اوقات کسی کو واسطہ بناتے ہیں، اور اس کی یہ سنت ہے کہ کسی واسطے سے عطا فرماتے ہیں، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام وادی سینا میں تشریف لے گئے، نبوت عطا ہونے والی ہے، اور اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوں تو یہ بھی کر سکتے تھے کہ اللہ جل جلالہ براہ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوتے، لیکن اس کے بجائے فرمایا کہ یہ شجرہ مبارکہ ہے، شجرہ مبارکہ کے ذریعے اس کو واسطہ بنا کر کلام فرمایا، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ کسی کو واسطہ بناتے ہیں، چاہے وہ فرشتہ ہو، جبرائیل امین ہوں یا شجرہ وادی سینا ہو اس کو واسطہ بنا دیتے ہیں۔

استاذ بھی درحقیقت اللہ عزوجل کا بنایا ہوا ایک واسطہ ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں، دینے والے تو وہی ہیں، بعض اوقات طالب علم کی برکت سے استاذ کے قلب پر اللہ جل جلالہ کی طرف سے وہ علوم القاء ہوتے ہیں، جو استاذ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے، اس واسطے اس طریق میں اساتذہ سے علم حاصل کرنے کی بڑی اہمیت ہے، ورنہ اگر بغیر استاذ کے پڑھنے سے علم آجایا کرتا تو پھر مدرسہ کی ضرورت نہیں تھی، لہٰذا کوشش کرو کہ جتنی احادیث پڑھو استاذ سے پڑھو، کوئی حدیث چھوٹنے نہ پائے، حاضری کا اتنا اہتمام ہو کہ کوئی حدیث بھی استاذ کے بغیر پڑھنی نہ پڑھے اور چھپی ہوئی تقریروں پر بھروسہ نہ کرو۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ ہم نے جب دورہ حدیث پڑھا تو میں نے یہ طئے کرلیا تھا کہ ان شاء اللہ کوئی حدیث بھی استاذ کے بغیر نہیں پڑھوں گا، اور حاضری کا اہتمام کروں گا کہ کوئی سبق یا حدیث کا حصہ چھوٹنے نہ پائے ، میرے ایک ساتھی (مولوی حسن احمد) تھے انہوں نے بھی یہی عہد کرر کھا تھا؛ لیکن اب ظاہر ہے انسان ہے اور دورۂ حدیث میں یہ ہوتا ہے کہ صبح جو پڑھنے بیٹھتے ہیں تو بعض اوقات چار چار، پانچ پانچ گھنٹے مسلسل سبق میں بیٹھنا پڑتا ہے، تو درمیان میں طبعی ضروریات بھی پیش آتی ہیں ، بعض اوقات وضو تازہ کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، اگر وضو کرنے گئے تو اتنی دیر میں اگر دو چار حدیثیں نکل گئیں تو مقصد حاصل نہیں ہوتا، فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ساتھی سے معاہدہ کرلیا تھا کہ جب میں اٹھ جاؤں تو اتنی دیر میں تم استاذ سے کوئی سوال ایسا کرلینا تاکہ جتنا وقت میرا وضو کرنے میں گذر رہا ہے وہ سوال وجواب میں گذر جائے اور جب میں واپس آؤں تو پھر حدیث شروع ہوجائے ، چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم ایسا ہی کرتے رہتے تھے جب اس ساتھی کو وضو کی ضرورت پیش آئی تو اس نے مجھے اشارہ کیا میں نے استاذ سے کوئی سوال کرلیا وہ جواب دینے میں لگ گئے یہاں تک کہ وہ وضو کرکے آگیا۔

کافی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا، کچھ دن کے بعد استاذ سمجھ گئے کہ انہوں نے آپس میں یہ چکر چلایا ہوا ہے تو کہتے ہیں: ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے ساتھی مولوی حسن احمد کو وضو کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے مجھے اشارہ کیا اور اٹھ کر جانے لگے، تو میں نے سوال کیا کہ حضرت آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کی ایک بات نظر سے گذری تھی ، اس میں یہ اشکال ہے، استاذ نے فرمایا: میاں! علامہ ابن ہمام کو چھوڑ، تیرے ساتھی کو وضو کرنا ہے وہ کرکے آجائے میں اتنی دیر کے لئے رک جاتا ہوں، فضول میرا دماغ کیوں کھاتا ہے؛ لیکن اس کے نتیجے میں فرمایا کہ سارے دورہ حدیث میں کسی کتاب کی الحمد للہ کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں گذری جو استاذ کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔(۱)

---

(۱) آپ بیتی: ۵۸/۲

حدیث سے محبت وعقیدت کی وجہ سے آپ ''شیخ الحدیث'' بنے ہیں، آپ کا فیض اب تک دنیا میں پھیل رہا ہے۔

لہٰذا دورہ حدیث کے ایک ایک طالب علم کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ تمام اسباق میں پابندی سے حاضری ہو، اس پابندی سے ان شاء اللہ احادیث کا فیض اور برکات ظاہر ہوں گی ''لقوله عليه السلام : نضر الله امرءا سمع مقالتي الخ''۔

مطالعہ حدیث

دورہ حدیث کے سال میں طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب مطالعہ وتکرار کی تکلیف اٹھالی گئی ہے، اب ہم اس محنت شاقہ کے مکلف نہیں ہیں، یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے، یہ سال تو ہے ہی مطالعہ کا سال، رات کے اسباق جب تک شروع نہ ہوں تکرار بھی کرنا چاہئے، اور مطالعہ بھی، تمام طلبہ میں اس بات کا اہتمام ہونا چاہئے کہ کوئی بھی سبق کم از کم ابتداء میں مطالعہ کے بغیر نہ ہو، تاکہ حدیث کا متن اور عبارت درست ہوجائے، اس کا مطلب سمجھ میں آجائے، مفہوم اور مباحث کا خلاصہ بھی سمجھ میں آجائے، اور جو کتاب پڑھ رہے ہو اس کے حاشیہ کو اچھی طرح پڑھ کر آؤ، ہم اپنے زمانہ میں اس طرح کرتے تھے کہ جب بخاری شریف پڑھتے تھے تو اس کے ساتھ عمدۃ القاری، فتح الباری، اور فیض الباری تین کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، مسلم شریف کے ساتھ ''فتح الملہم'' کا اور ابوداؤد کے ساتھ ''بذل المجہود'' ترمذی کے ساتھ ''العرف الشذی'' نسائی اور ابن ماجہ کے لئے حواشی دیکھا کرتے تھے۔

مبادی علم حدیث کا اچھی طرح مطالعہ

شروع میں اسباق کی کثرت نہیں ہوتی، وقت بھی کافی ہوتا ہے تو اس وقت کو استعمال کرتے ہوئے مقدمہ علم حدیث کی کے مباحث کا اچھی طرح مطالعہ کرلینا چاہئے، میری کتاب درس ترمذی میں علم حدیث تعریف، موضوع، غرض وغایت، حجیت حدیث اور رواۃ حدیث کے طبقات اور احادیث سے متعلق دیگر مباحث تفصیل کے ساتھ آئے ہیں، نیز اس کا مقدمہ بھی اہتمام سے پڑھ لو۔

اگر ممکن ہو تو اعلاء السنن کا مقدمہ (اعلاء السنن حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ہے، بیس جلدوں میں ہے) اس کے دو مقدمے ہیں، ایک کا نام "انہاء السکن إلی من یطالع إعلاء السنن" اور دوسرا ہے: "إنجاء الوطن عن الازدراء بإمام الزمن" اور دونوں مقدمے ایک جلد میں آ گئے ہیں، اگر ہو سکے اور میسر ہو تو اس کا مطالعہ کیا جائے، یہ دو کتابیں اگر آپ نے مطالعہ کر لیں، ایک مقدمہ درس ترمذی، اور دوسرا مقدمہ اعلاء السنن تو ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ آپ کو علم حدیث کے بنیادی مبادی سمجھ میں آ جائیں گے، اور ان کی مدد سے پورے دورۂ حدیث کے مباحث میں آپ کو سہولت ہوگی۔

اردو زبان میں علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب ''آثار الحدیث'' (دو جلدیں) اور علم حدیث میں درجنوں کتابوں کے مصنف مولانا عبد الماجد غوری صاحب کی ''علوم حدیث کے تاریخ وتعارف'' کا مشورہ دیا جا سکتا ہے، بالخصوص ثانی الذکر کتاب دریا بکوزہ ہے قدیم و جدید، عرب وعجم، متقدمین ومعاصرین کے مختصر جامع تعارف پر مشتمل ہے۔

حدیث پڑھنے کا اصل مقصد

دورہ حدیث کے سال میں فقہی اور کلامی مباحث کثرت سے ہوتے ہیں، بخاری، ترمذی، ابوداؤد اور مسلم ان چار کتابوں میں خاص طور پر بعض اوقات لمبی چوڑی تحقیقات ومباحث ہوتی ہیں، ان مباحث سے حدیث کے طالب علم کے لئے معلومات کا راستہ کھلتا ہے، لیکن حدیث پڑھنے کا مقصود اصلی اپنی اصلاح اور اتباع سنت ہے۔

محمد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے جنید بغدادی کو خواب میں دیکھا، تو میں نے پوچھا کہ اللہ تعالی نے کیا معاملہ فرمایا ہے، تو انہوں نے فرمایا:

"طاحت تلك الإشاراتُ، وغابت تلك العباداتُ، وفنيت تلك العلومُ، ونفدت تلك الرسومُ، وما نفعنا إلا ركيعات كُنَّا نَركعُها في الأسحارِ" فرمایا کہ وہ اشارے (اشارے سے مراد علمی اشارے) سب مٹ گئے، جو عبادتیں ہم کی وہ سب غائب ہو گئے، تمام علم دین فنا ہو گئے، تمام رسم ورواج برباد ہو گئیں

اور فائدہ جو پہنچا ان چھوٹی چھوٹی رکعتوں سے پہنچا جو ہم رات کے آخری حصہ میں پڑھ لیا کرتے تھے۔

معلوم ہوا کہ حدیث کا اصل مقصود یہ تحقیقات اور تقاریر نہیں؛ بلکہ اصل مقصود عمل ہے، جو حدیث بھی پڑھو عمل کی نیت سے پڑھو اور حتی الامکان اس کو علم میں لانے کی فکر کرو، خاص طور پر فضائل کی احادیث کو اس لئے پڑھنا ہے کہ عمل کی توفیق ہو، جب خود کو عمل کی توفیق ہوجائے تو دوسرے مسلمان بھائی کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرو۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ: الحمد للہ کوئی حدیث ایسی نہیں پڑھی جس پر کبھی نہ کبھی عمل نہ کرلیا ہو، یعنی بعض ایسی فضائل کی چیزیں ہوتی ہیں جو محض مستحب ہیں، فرض نہیں، واجب نہیں، ہم جیسا کوئی مولوی ہوتو وہ یہ تاویل کرلے گا کہ بھائی کوئی فرض وواجب تو نہیں ہے کہ ضرور کیا جائے، لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی حدیث نہیں چھوڑی جس پر عمل نہ کیا ہو، الحمد للہ، اور عمل ہی سے علم میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اگر عمل نہیں تو علم میں پختگی پیدا نہیں ہوتی، خاص طور پر اخلاق وآداب کی احادیث، جیسے کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور لوگوں سے ملاقات کے آداب پر مشتمل احادیث ہیں، ان میں ایک ایک ہدایت کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کرو۔

حدیث سے زندگی میں انقلاب

ہم نے صرف نماز، روزہ، اور چند عبادات کا نام دین رکھ لیا ہے، حالانکہ معاشرت کے بے شمار آداب دین کا اہم حصہ ہیں، وہ ہم بھلائے بیٹھے ہیں، اور بعض اوقات ان پر عوام تو عمل کرلیتے ہیں، لیکن ہم نہیں کرتے، یہ بڑی خرابی کی بات ہے، خلاصہ یہ کہ دورہ حدیث کے سال میں زندگی میں ایک انقلاب اور تبدیلی آنی چاہئے، اب تک جیسا کچھ وقت گذرا، سو گذرا، اب حدیثِ رسول اللہ ﷺ کے طالب علم کی حیثیت سے اعمال، اخلاق وکردار میں تبدیلی آنی چاہئے، میرے والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ”جاء حمار صغیر ورجع حمار کبیر“ ایسا نہ ہونا چاہئے، بلکہ کچھ لے کر جائیں۔

حدیث سے متعلق تدریسی تجربات

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حضرت علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے حدیث کے طلباء اور اشتغال رکھنے والوں کے لئے چند ایک اصول ومبادی بیان کئے ہیں:

۱۔ پہلی چیز جس کا اہتمام بہت زیادہ ضروری اور اہم ہے، وہ کتب حدیث کے درس وتدریس اور بحث وتحقیق میں اخلاص واحتساب اور تصحیح نیت ہے؛ اس لئے کہ رسول اللہ نے بعض ان خالص دینی واجبات واعمال میں (جس کو انسان محض امرِ الٰہی کی تعمیل اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کرتا ہے) ایمان واحتساب کی شرط لگائی ہے، اس لئے کہ ان اعمال میں بھی بعض مرتبہ ماحول کا دباؤ اور لوگوں کے قیل وقال اور تنقید وملامت کا خوف شامل ہوجاتا ہے اور انسان ان اعمال کو بھی معاشرہ کے اثر سے اور ملامت کے خوف سے کرتا ہے تو آپ نے ان دینی واجبات واعمال میں بھی حصول ثواب ورضائے الٰہی اور حصول تقرب کی نیت کے استحضار کی قید لگادی، اور یہ بات نبی ہی کہہ سکتے ہیں جس پر اللہ کی طرف سے وحی کا نزول ہوتا ہو، اور وہ انسانی کمزوریوں اور خواہشات نفسانیہ کے اسباب اور شیطانی مکائد سے بخوبی واقف ہو، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه وما تاخر"(۱) (جس نے رمضان کے روزے رکھے، ایمان واحتساب کی نیت سے، تو اللہ تعالیٰ اس کے گذشتہ گناہوں کو معاف کردے گا) اسی طرح دوسری جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "من قام لیلة القدر ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه"(۲) (جو لیلۃ القدر میں ایمان واحتساب کی نیت سے عبادت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گذشتہ سب

---

(۱) بخاری: کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایمان واحتسابا

(۲) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب فضیلۃ لیلۃ القدر

گناہوں کو معاف فرمادے گا)۔

توجب انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ رمضان کے روزے اور شبِ قدر کی عبادت کو(جب کہ ان میں مشقت ومجاہدہ ہے اور ان کو صرف تقرب الی اللہ اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے مشروع کیا گیا ہے) ایمان واحتساب سے خالی ہو کر کرے تو وہ اعمال ومساعی جن کے متعدد مقاصد وفوائد ہو سکتے ہیں، ان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؛ اس لئے ان مساعی ومشاغل میں اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے کہ ان میں اجر وثواب کی نیت کا استحضار ہو اور انفرادی واجتماعی فوائد ملحوظ ہوں اور اس کی تبلیغ ودعوت ہو، اس کی روشنی میں معاشرہ کا جائزہ لیا جائے، اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہو کہ

"نضر الله امراء سمع منا شيئا فبلغه كما سمعه، فرب مبلغ أوعى من سامع" (۱)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے! جس نے ہم سے کچھ سنا، پھر ویسے ہی اس کو دوسروں تک پہنچایا، بسا اوقات جس کو اس نے پہنچایا ہے وہ سننے والے سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے) امام بخاری نے اپنی کتاب کی ابتداء بڑی حکمت سے کی ہے اور اس میں توفیقِ الٰہی شامل ہے کہ انہوں نے باب سے پہلے یہ حدیث ذکر کی ہے۔

"إنما الاعمال بالنيات" (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)

اس حدیث سے کتاب کی ابتداء میں امام بخاری کے دو اہم مقاصد ہیں پہلا مقصد تو یہ ہے کہ امام صاحب نے یہ اشارہ فرمادیا کہ ان کی جمع وتالیف کا یہ عمل محض رضائے الٰہی کے حصول اور ثواب کی امید میں ہے اور اس لئے ہے کہ کلامِ رسول اللہ ﷺ جو صحیح سندوں سے ثابت ہے، اس کو عام طور پر مسلمانوں اور خاص طور پر علماء اور حدیث سے اشتغال رکھنے والوں تک پہنچادیا جائے۔

دوسرا مقصد امام صاحب کا یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو بھی تصحیح نیت کی دعوت دیں،

(۱) ترمذی: باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع، حدیث: ۲۶۵۷

اور رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ یاد دلائیں، اس طرح یہ حدیث شریف کی کسی بھی کتاب کے لئے بہترین دیباچہ اور مقدمہ ہے۔

علم حدیث کے طلبہ اور مطالعہ کرنے والوں کے لئے سب سے ضروری یہ ہے کہ وہ اپنی نیتوں کی تصحیح کریں، اپنے اندر اخلاص و احتساب پیدا کریں، تقرب الی اللہ کا جذبہ بیدار کریں، اس کے ثواب اور توفیق کی امید رکھیں، اور طلبِ دنیا اور مادی اغراض و مقاصد کو دل سے نکال دیں، شہرت و ناموری اور حصولِ دنیا کا جذبہ ان کے اندر نہ ہو، اگر بغیر قصد و ارادہ کے بھی یہ بات دل میں پیدا ہو تو اس کو کھرچ دیں۔

۲- ایمان و احتساب اور حدیث نبوی کی قدر و منزلت کی معرفت کے ساتھ ساتھ اس کا وہ ادب واحترام جو اس کے شایانِ شان ہے، تواضع وفروتنی کا اظہار، اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطاء فرمائی ہوئی توفیق وسعادت پر اس کا شکر بجالانا بھی ضروری ہے، اس سلسلہ میں حدیث کے مدرسین و معلمین اور اس کی قدر پہچاننے والے اور اس توفیقِ الٰہی پر اس کا شکر کرنے والے طلبۂ حدیث کے عجیب ومحیر العقول واقعات تاریخ کی زینت ہیں کہ وہ کس طرح اس کے درس ومطالعہ کے وقت باضو رہتے اور آداب ملحوظ رکھتے اور انصاف سے کام لیتے، اور جس نے اس کے خلاف کیا، احادیث اور کتب حدیث کے ساتھ سوءِ ادب اور اہانت کا معاملہ کیا اور سخت تنقیدیں کیں، ان کے بارے میں ایسے واقعات موجود ہیں، جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کس درجہ وہ الحاد و دہریت کا شکار ہو گئے، اور غضب الٰہی کا نشانہ بنے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں اور طالبانِ علوم دینیہ کو اس دردناک انجام سے محفوظ فرمائے۔

۳- قرآن مجید سے یہ بات ثابت ہے کہ بعثتِ شریفہ کے بنیادی مقاصد میں تعلیمِ کتاب وسنت اور تزکیہ نفوس ہے، اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا

لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۱)

''جس طرح (من جملہ اورنعمتوں کے) ہم نے تم میں تم ہیمیں سے ایک رسول بھیجا جوتم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہیں پاک بناتے ہیں اور کتاب (قرآن) اور دانائی سکھاتے ہیں، اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جوتم سے پہلے نہیں جانتے تھے''

تو تزکیہ نفوس بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، اور ان بڑے مظاہر میں سے ہے جن میں معجزہ نبوی، شریعت اسلامی اور اسوۂ رسول ﷺ کا ظہور ہوا اور یہ مسئلہ اخلاقی تہذیب، فضائل سے آراستہ ہونے اور رذائل سے پاک ہونے کا ہے، کہ وہ مسلمان جو اس نبوی مدرسہ وتربیت گاہ سے تربیت یافتہ ہیں، اخلاق کی بلندی اور انسانی اقدار میں کامل نمونہ ہوں، اور یہ سب کچھ نور نبوت اور تعلیمات نبوی کا فیضان ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی عملی تفسیر ہوں:

''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا'' (۲)

''اور تم کو پیغمبر خدا ﷺ کی پیروی (کرنی) بہتر ہے، (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روزِ قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو''

اس لئے خصوصا کتب حدیث اور دواوین سنت سے استفادہ کرتے وقت تزکیہ نفس، تہذیبِ اخلاق، اتباعِ سنت، تعلیمات وآداب نبوی کی پیروی کے پہلو کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ہر حدیث کا طالب چہ جائے کہ معلم ومحقق ہو، اس کو لوگوں کے لئے اخلاق ومعاملات میں طور وطریق میں اسوہ ونمونہ ہونا چاہئے، علم حدیث اور سیرت وسنت سے اشتغال کی تاثیر اس کی زندگی سے نمایاں ہو، اس کا طور وطریق اس کی اثر پذیری پر ایک

---

(۱) سورہ بقرۃ:۱۵۱

(۲) سورہ احزاب:۲۱

روشن دلیل ہو، اور یہ چیز لوگوں کو (خاص طور پر ان ممالک میں جن میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو یا وہاں مغربی تہذیب کا غلبہ ہو) اس امتیاز وتفوق کے اسباب پر غور وفکر پر آمادہ کرے، اوراسلام وسیرت نبوی کے مطالعہ پر مجبور کرے، یہ دعوتِ اسلام کا ایک بہترین ذریعہ اور ذرائع ابلاغ اختیار کئے بغیر ان کو متوجہ کرنے کا ایک اچھا راستہ ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے خاص طور پر ان احادیث صحیحہ کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے جن میں خاص طور پر اس موضوع پر توجہ دی گئی ہے۔

ان اہم ترین کتابوں میں امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری کی ''الادب المفرد'' ہے، دوسری کتاب جو اس موضوع پر تصنیف کی گئی وہ حافظ کبیر ذکی الدین عبدالعظیم المنذری دمشقی کی ''الترغیب والترہیب'' ہے جو چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

تیسری کتاب جو مشہور ومقبول ہے، امام ابوزکریا محی الدین یحی بن شرف نووی کی ''ریاض الصالحین'' ہے۔

اخیر میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ وہ مذاہبِ فقہیہ جن پر زمانہ قدیم سے عمل چلا آرہا ہے جن میں احکام کے استنباط واستخراج کی بنیاد کتاب وسنت ہے، ان کو ہدف ملامت نہ بنایا جائے، اس لئے کہ یہ بے موقع صلاحیتوں کا ضائع کرنا اور دوست سے برسر پیکار ہونا ہے۔ (اس موضوع پر ''حجۃ اللہ البالغۃ'' و''ازالۃ الخفاء'' کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب "الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف" (اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ) کا مطالعہ کیا جائے)۔

بیشک اجتہادی اختلافات کے اظہار کی گنجائش موجود ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو، زہد وتقوی اور اخلاص پایا جاتا ہو، کتاب وسنت کا احترام ہو، اوران کو اساسِ اول قرار دیا جائے، اور جن کو اللہ نے قبولیت دیا ہے ان کا بھی احترام کیا جائے۔

ان تمام چیزوں کے بجائے تمام تر توجہات اور اللہ کی دی ہوئی صلاحیتیں کتاب وسنت کی تحقیق ومطالعہ اور قرآن وحدیث سے استدلال میں صرف کئے جائیں، اور اللہ تعالیٰ

نے جو زور بیان، قوت خطابت و استدلال عطا فرمایا ہے ان کو شرک و بدعات اور ان کے مظاہر کی تردید میں لگایا جائے۔(١)

ڈاکٹر عتیق الرحمان اور مولانا شاہجہاں قاسمی فرماتے ہیں:

''مدارس میں مشکاۃ شریف اور صحاح ستہ تقریبا سب ہی دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ مدارس میں صحاح ستہ کی کتابیں اونچے درجوں کے مختلف سالوں میں ایک ایک دو دو کر کے پڑھائی جاتی ہیں، جس کو دورے کا سال کہا جاتا ہے، تمام صحاح کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں ایک تجویز یہ ہے کہ فن کی اونچی کتابیں پڑھانے کا طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ اس فن کی اعلی کتابوں کی تعلیم پوری شرح وبسط کے ساتھ بتدریج دی جائے تاکہ ہر طالب کے سامنے کوئی علمی گوشہ تشنہ طلب نہ رہ جائے؛ بلکہ ہر بات اس کے ذہن نشیں ہوتی چلی جائے۔ظاہر ہے کہ یہ خوبی صرف ایک سال میں تمام صحاح کی کتابوں کے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوسکتی، اس لئے بہتر ہوگا کہ ہر مدرسہ میں صحاح کی کتابیں اونچے درجات کے مختلف سالوں میں پڑھائی جائیں؛ تاک طلبہ بتدریج یہ کتابیں پڑھ کر اس فن میں بصیرت پیدا کرسکیں''۔(٢)

اصولِ حدیث

حدیث شریف سے پورے طور پر استفادہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے اصول وضوابط سے واقفیت حاصل کی جائے کہ کون سی حدیث صحیح ہے، کس کو حدیث مرسل کہتے ہیں، حدیث ضعیف یا حدیث حسن کی کیا تعریف ہے، ان تمام امور کی جان کاری

(١) مطالعہ حدیث کے اصول ومبادی: ٨٠ تا ٨٤، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، رائے بریلی

(٢) دینی مدارس: مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری،: ٤٢٣ـ ٤٢٤، فضل بک سوپر مارکیٹ، کراچی

اصول حدیث کی کتابوں سے ہوتی ہے؛ اس لئے دینی مدارس میں اس فن کی چند ہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں مختلف مدارس میں مقدمہ مشکاۃ، اور نخبۃ الفکر عموماً پڑھائی جاتی ہیں، اس کے علاوہ اصول حدیث اور تاریخ علوم حدیث (الحدیث والمحدثون) کو شامل نصاب کیا جائے تو علم حدیث کی تدوین اور اس کی تاریخ سے واقفیت ہوسکتی ہے۔(۱)

(۱) حوالہ سابق: ۴۲۵

نصاب دار العلوم میں

خارجی مطالعہ کا نظام

دار العلوم دیوبند میں اس وقت بھی خارجی مطالعہ کا اہتمام موجود ہے، موجودہ دارالعلوم کے نصاب پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر کلاس اور جماعت میں خارجی مطالعہ کا اہتمام موجود ہے، سال سوم میں ''تاریخ ملت''، ''خلافتِ راشدہ''اور سال چہارم میں علوم عصریہ اور تاریخ اسلام کے کے تحت تاریخ ملت: ''خلافت امیہ و بنی عباسیہ''، ''تاریخ جغرافیہ''، ''علم مدنیت''اور سال پنجم میں ''تاریخ سلاطین ہند''اور سال ششم میں مطالعہ کے تحت ''اصح السیر''یہ ساری کتابیں خارجی مطالعہ کے تحت شامل نصاب ہیں۔(۱)

۱۔ **تاریخ ملت:** خلافت راشدہ: یہ جناب زین العابدین سجاد میرٹھی اور جناب مفتی انتظام اللہ سجانی اکبر آبادی کی تالیف کردہ کتاب ہے، تاریخ ملت کے اس دوسرے حصہ میں خلافت راشدہ کا مفصل تذکرہ ہے، اس کتاب میں خلافت راشدہ کے حوالہ سے تمام واقعات کو قدیم وجدید معتبر و مستند تاریخی کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے، بیانان واقعات کے ساتھ ساتھ واقعات کے علل واسباب اور ان کے اثرات ونتائج سے بھی جابجا تعرض کیا گیا ہے، تا کہ طلباء میں ذوقِ تحقیق اور وسعت نظر پیدا ہو۔

۲۔ **تاریخ ملت:** سلاطین ہند: یہ بھی مذکورہ بالا مصنفین کی کتاب ہے، یہ کتاب سلاطین ہند کی کی سیرت اور ان کی ملکی خدمات اور رواداری، تہذیبی علمی ترقی میں ان کے مساعی کو بیان کرتی ہے، فتوحات کے ساتھ مفتوحین کے ساتھ ان کے حسن

---

(۱) قواعد داخلہ، دار العلوم دیوبند: ۲۲

سلوک کو بیان کرتی ہے۔ ہندوستان کے ہر طرح کے لوگوں میں تعلیم کو رائج کیا جب کہ تعلیم صرف ہندوستان برہمن طبقہ کا حق سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ **اصح السیر**، یہ حضرت مولانا ابوالبرکات صاحب داناپوری کی حضرت خیر البشر ﷺ کی سوانح اقدس پر مشتمل یہ کتاب ہے، یہ کتاب سیرت نبوی اور خصوصا مغازی رسول اللہ ﷺ کو بہت بہترین انداز میں باحوالہ اور مدلل پیش کرتی ہے، اس کتاب میں مقدمہ سیرت مع تاریخ عرب قبل البعثت مختصر مگر نہایت جامع ہے، پھر سیرت رسول اللہ ﷺ از ولادت تا وفات انساب کا حال، مکمل کتاب المغازی، مکمل کتاب الاموال، کتاب الوفود، حضور ﷺ کے قاصد، مکاتیب، حجۃ الوداع کا مفصل حال، ازواج النبی ﷺ کے حالات اور بے شمار معلومات کا خزینہ ہے، بہت سے اہم معرکۃ الآراء مسائل پر عالمانہ بحث ہے اور یہ تمام چیزیں اصح ترین روایات سے ماخوذ ہیں۔

علم تاریخ کی اہمیت ہم مسلمانوں کے لئے یوں بھی اوروں سے بڑھ کر ہے، ممکن ہے بعض معاصر اقوام تاریخ سے تغافل اور تجاہل کی متحمل نہیں ہوسکیں، ممکن ہے کہ ہماری پڑوسی اقوام اپنی بعض تاریخی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اپنی حقیقی تاریخ کو نظر انداز کردینے ور خود بھلادینے اور دوسروں کو بھلوادینے پر مجبور ہوں (اگرچہ وہ ماضی بعید کی فرضی اور اساطیری داستانوں کو تاریخ کے نام سے منوانے اور ماضی قریب کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں میں دن رات مصروف ہیں) لیکن ہمارے لئے تاریخ سے تجاہل وتغافل ایک قومی خودکشی کے مترادف ہے، ہمارا دستور حیات قرآن مجید بار بار تاریخ پر زور دیتا ہے، اور اس سے سبق آموزی کی بار بار تلقین کرتا ہے، عصر حاضر کے ایک بالغ نظر مفکر کی رائے میں قرآن مجید نے تاریخ اور اس سے سبق آموزی پر بار بار زور دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق خداوند تعالیٰ تاریخ سے یعنی زمانے کے تسلسل اور اس کے اندر جو کچھ ہوتا ہے، اس سے اور خصوصا انسانی تاریخ سے ہرگز غافل نہیں ہے، بلکہ اس پر ہر وقت نگران ہے، جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ صحیح راستے سے بھٹکتی نظر آئے تو اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اس کے اندر دخل اندازی کرکے کچھ عناصر کو نیچے اور کچھ عناصر کو اوپر کردیتا ہے، قرآن مجید کا یہ ایک بنیادی سبق ہے۔

اس کے علاوہ قرون اولی کے مسلمان خود بھی انسانی تجربات ومشاہدات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے، اور خیالی دنیا بسانے کے بجائے واقعات کو نظر میں رکھنے اور ان پر غور وخوض کرنے کے عادی تھے، اس لئے بہ نسبت یونانیوں کے مسلمانوں نے اور علوم کے ساتھ

علم تاریخ پر بھی پوری توجہ مبذول کی، ہندوؤں کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کے یہاں تاریخ کا کوئی تصور ہی نہیں، دوسری قدیم اقوام میں سے کسی نے بھی تاریخ پر اتنی توجہ نہیں کی، جتنی مسلمانوں نے کی، تاریخ کو ایک مربوط اور منظم علمی شکل میں، اسلامی تعلیم جس کی مقتضی تھی، سب سے پہلے ایک مسلمان ابن خلدون ہی نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔(۱)

مولانا رضوان القاسمی علیہ الرحمۃ تاریخ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''تاریخ وسیر کو ہمارے یہاں سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کا اور علماء اسلام کا خاص فن تھا، اور یہ ایسا فن ہے جس کے کسی بھی زمانہ میں غیر اہم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، آج اسلام کے خلاف مغربی دنیا نے جو خانہ زاد پروپیگنڈہ کررکھا ہے، اس کی بڑی وجہ علماءِ اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت اور بے اعتنائی ہے، سرکاری درسگاہوں میں یہ موضوع مستقل اور لازمی حیثیت سے داخل ہے، جہاں بطور خاص تاریخ اسلامی کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مگر ہمارے فضلاء کو ان کی ہوا تک نہیں لگتی، ادھر کی چند صدیوں کی بین الاقوامی اہم شخصیتوں کو تو چھوڑیئے، غیر مسلم تاریخ کو پسِ پشت ڈالئے، خود اسلام کے قرونِ اولی کی تاریخ پر ان کا انتہائی سطحی اور سرسری مطالعہ ہوتا ہے، یہ ایک المناک حادثہ ہے، اس لئے تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور تاریخ عالم کے موضوع پر بعض کتابیں ضرور داخلِ نصاب ہونی چاہئے۔

یہ زمانہ معروضی مطالعہ کا اور براہِ راست چیزوں کو ان کے مآخذ اور اصل مصادر سے سمجھنے کا ہے، ہمارے دشمنوں نے اسلامیات کی تعلیم، اس پر گہری بصیرت اور واقفیت کے لئے بڑی بڑی درسگاہیں قائم کی ہیں، ہماری تاریخ، عقائد، الٰہیات، علم کلام اور فقہ وقانون پر ان کی اتنی وسیع نگاہ ہے کہ بسا اوقات حیرت ہوتی ہے وہ اس تعلیم کو اپنے ناپاک عزائم کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور اسلام پر خطرناک نشتر چلاتے ہیں۔

(۱)　محاضرات تعلیم:۲۲۹

ضروری ہے کہ ہمارے مدارس میں کچھ ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جن میں تمام مذاہب کا تعارف، ان کے بنیادی عقائد، ان کے معاشرتی اور معاشی اصول اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی سیرت، ان کے اصل اور مستند مآخذ کے حوالے سے جمع کی گئی ہوں، جدید دنیا کے جو اہم معاشرتی اور معاشی نظام ہیں اور جو مشہور تخلیقی اور کائناتی نظریات ہیں، جیسے کارل مارکس، لینن، فرائڈ، ڈارون وغیرہ کے افکار، ان سے طلباء کو واقف کرایا جائے، فقہ اسلامی کے خاص خاص موضوع پر ''بین الاقوامی قوانین'' اور ''انٹرنیشنل لا'' کا ایک سرسری مطالعہ بھی ان کی نظر سے گذر جائے، جب تک اس طرح کا تقابلی مطالعہ کا مدارس میں رواج نہ ہوگا اور تعلیم میں اس کو بنیادی اہمیت نہ دی جائے گی جدید چیلنج کا مقابلہ ناممکن ہے''۔(۱)

تاریخ کے فوائد

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تاریخ کی اہمیت کے تعلق سے فرماتے ہیں:

۱) بہت سے ایسے واقعات کا علم ہونا جن کے جاننے سے عقل وبصیرت عاجز ہوتے ہیں۔

۲) ایسے عجیب واقعات کا علم ہونا جو گویا نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، ان کے استحضار سے سستی اور کاہلی دور ہوتی ہے اور ہمت بندھ جاتی ہے۔

۳) گذرے ہوئے لوگوں کے واقعات سے عبرت حاصل ہونا (سعادت مند وہ شخص ہے جو دوسروں کے ذریعہ وعظ قبول کرے) (الحدیث)

۴) عقل کی تقویت اور درست رائے کا حاصل کرنا گویا کہ تجربہ اور مشورہ حاصل کرلیا جائے، بہت سے ایسے لوگوں سے جن کی تعداد کثیر ہے اور جن کی عقل بڑی ہے ایسے لوگ ایک وقت اور زمانہ میں نہیں جمع ہوسکتے جن کو فن تاریخ نے یکجا کردیا ہے۔

۵) امثال کثیرہ اور مواعظ وحکم کا حاصل ہونا جو حکایات اور واقعات ہے اور کمال ایمان کا سبب ہے۔

(۱) دینی مدارس اور عصر حاضر: ۲۸، ۹۲ محمد رضوان القاسمی

۶) اللہ کا انعام اور انتقام کا علم ہونا جو امید وخوف کا موجب بنتا ہے اور کمال ایمان کا سبب بن جاتا ہے۔

۷) علم تاریخ کے ذریعہ انسان اچھے اخلاق بنانے کی کوشش اور برے اخلاق کو زائل کرنے کی سعی کرتا ہے، کیوں کہ اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ کے نتائج اس کے سامنے آجاتے ہیں۔

۸) جب تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور پھر کشادگی پیدا ہوئی تو مصیبت پر دل کو ثبات وقرار حاصل ہوجاتا ہے۔

۹) اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کے بارے میں عجیب وغریب مظاہر قدرت پر استدلال حاصل ہونا۔

۱۰) بڑے بڑے کاموں کے کرنے کے لئے ہمت وحوصلہ پیدا ہوجانا۔

۱۱) موت وفنا کا نگاہوں کے سامنے آجانا جس سے آدمی مسافر کی طرح ہوجاتا ہے ’’کن فی الدنیا کأنك غریب أو عابر سبیل‘‘ (الحدیث) تکبر وتجبر سے تائب ہوکر ایک ذلیل غلام بن کر رہتا ہے، اور بخدا یہ بڑی کامیابی ہے جس کا حاصل کرنا قوت حافظہ سے سہل ہے زیادہ محنت ومشقت کی ضرورت نہیں۔ (۱)

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

’’درس نظامی میں تاریخ بطور مضمون اس لئے با قاعدہ شامل نہیں کیا گیا کہ قوت مطالعہ پیدا ہونے کے بعد یہ مضمون ذاتی مطالعہ سے بھی بخوبی حاصل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اب تجربہ یہ بتارہا ہے کہ ذاتی مطالعہ کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے؛ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی درجات کے نصاب میں تاریخ اور سیرت کو باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب کیا جائے‘‘۔ (۲)

---

(۱) علوم وفنون اور نصاب تعلیم، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی: ۱۲۲، ادارہ فادات اشرفیہ ہتھورا، باندہ، یوپی

(۲) درس نظامی کیسے پڑھائیں: ۵۱، ہمارا تعلیمی نظام: ۹۸۔۹۹

حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب تاریخ و مغازی کی اہمیت پر زور ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایک چیز جس کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، وہ ہے ''سیرت و تاریخ اسلام کا باب'' مدارس میں اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر نصاب ہی نہیں ہے، حال آں کہ اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اور حضرات اسلاف نے اس کی جانب خاصی توجہ دی ہے اور خود حضرات صحابہ کے درمیان واقعات اسلام کو جاننے اور اس کی تعلیم و نقل و روایت کا جو اہتمام تھا، اس سے بھی اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت محمد بن سعد بن ابی وقاص اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں:

" كان أبي يعلمنا المغازي والسرايا، ويقول: يابني: إنها شرف آبائكم فلا تضيّعوا ذكرها" (۱)

میرے والد ہمیں مغازی اور سرایا کی تعلیم دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اے بیٹو! یہ تمہارے آباء واجداد کا شرف ہے، تم لوگ ان کی یادداشت کو ضائع نہ کرو۔

اور ''مختصر تاریخ دمشق'' میں اسی قول کو محمد بن سعد کے صاحب زادے اسماعیل بن محمد کی طرف ذرا سے الفاظ کے فرق کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ (۲)

اور حضرت زین العابدین علی بن الحسین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" كنا نعلم مغازي رسول الله صلى الله عليه وسلم كما نعلم السورة من القرآن" (۳)

ہم مغازی رسول اللہ ﷺ اس طرح پڑھاتے تھے، جس طرح ہم

(۱) سیرة حلبية ۱/۱، محمد رسول الله: ۱/ ۲۰۳

(۲) مختصر تاریخ دمشق: ۱/ ۱۰۳

(۳) البداية والنهاية: ۳/ ۲۴۲

قرآن کی سورت پڑھاتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے درس کا جونصاب تھا، اسمیں من جملہ اور امور کے ایک حصہ ''مغازی'' کا بھی تھا، حضرت ابن عباس کے شاگرد ''عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ'' رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولقد كان يجلس يوما ما يذكر فيه إلا الفقه ويوما التاويل، ويوما المغازى، ويوما الشعر، ويوما أيام العرب"(۱)

آپ ایک دن صرف کا، ایک دن صرف تفسیر کا، ایک دن صرف مغازی کا، ایک دن صرف شعر اور ایک دن صرف ایام عرب کا بیان کرتے تھے۔

یہی نہیں! اہل سیر و مغازی کی تعلیم کے لئے اساتذہ کا تقرر بھی ہوتا تھا، حضرت قتادہ النعمان کے پوتے حضرت عاصم بن عمر رحمہ اللہ کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جامع مسجد میں سیر و مغازی اور مناقب وفضائل صحابہ کی تعلیم کے لئے مقرر فرمایا تھا، جس کا ذکر ابن حجر رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

" كان رواية للعلم، وله علم بالمغازى والسير، أمره عمر بن عبد العزى أن يجلس فى مسجد دمشق فيحدث الناس المغازى ومناقب الصحابة ففعل" (۲)

آپ علم کے روایت کرنے والے تھے، اور مغازی کا بھی آپ کو علم تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ دمشق کی مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب صحابہ کی تعلیم دیں۔

الغرض سیر و مغازی کی تعلیم بھی ایک مہتمم بالشان کام ہے، جس کی جانب توجہ اہل مدارس کو دینا چاہئے اور اسلاف کے طریقے کے مطابق اس کا خصوصی اہتمام بھی ہونا چاہئے۔

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۳/ ۳۶۸

(۲) تہذیب التہذیب: ۵/ ۴۸

اب جب کہ مستشرقین کے بعد مغربی میڈیا کے اعتراضات ، دہشت گردی کا الزام، اسلامی تاریخ کی شبیہ بگاڑنے کا یا اس کے خوبصورت چہرہ کو مروجہ نظام تعلیم سے حذف کرنے کی خیانت ہوچکی ہے، خود ہندوستان میں کبھی اورنگ زیب پر کبھی ٹیپو سلطان کو غداری، وطن سے بے وفائی کا طعنہ دیا جاتا ہے، ایسے حالات میں تو ارباب انتظام اس باب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں، کوئی کسر رہنے نہ دیں۔

جغرافیہ ایک اہم فن ہے، جس میں کسی علاقے یا ملک کے حدود اربعہ، آبادی، موسم، پہاڑ، پیداوار وغیرہ جیسے ضروری امور سے بحث کی جاتی ہے۔

فن جغرافیہ ایک فطری فن ہے، ہر شخص کو کسی نہ کسی درجہ میں جغرافیہ کا علم ہوتا ہے، مثلاً ہر شخص کو اتنا علم تو ہوتا ہی ہے کہ وہ کس جگہ پیدا ہوا، اس جگہ کا نام کیا ہے؟ وہاں کی آب وہوا کیسی ہے؟ وہاں کا ماحول کیسا ہے؟ لوگوں کا مزاج و مذاق کیا ہے، وہاں کی زمین کا رقبہ کیا ہے، زمین کیسی ہے؟ وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں، لوگوں کی معاشرتی زندگی کیسی ہے، وہاں کے ندی، نالے، پہاڑ وغیرہ کی تعداد کیا ہے، بس یہی علم جغرافیہ کی حقیقت ہے، اور اسی زاویہ سے پورے عالم کو جاننے کا نام جغرافیہ ہے۔

مسلمانوں نے علم جغرافیہ پر خاص توجہ کی اور جس واقعیت پسندی اور محققانہ بصیرت کے ساتھ اس علم پر محنت کی، ان کے پیش نظر احوالِ عالم اور کوائف دنیا پر غور وفکر کرنے کی بار بار دعوت دی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، جس نے سیاسیات میں بھی اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا ہے، جو ٹھوس حقائق اور مفید عناصر پر مبنی ہے، اس کے مقابلے میں عصر حاضر میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں جو دنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہیں، لیکن یہ نظریات کہاں تک صحیح ہیں، انسانوں کے لئے مفید ہیں یا غیر مفید؟ انسانوں کے لئے مناسب ترین سیاسی نظام کیا ہوسکتا ہے؟ ان تمام باتوں سے واقفیت ایک عالم دین کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ ایک دینی قائد ہونے کی بناء پر دنیا کے سامنے صحیح سیاسی نظام پیش کر سکے، کتاب الحدود والدیات میں اسلام کا قانون جرم وسزا، کتاب القضاء میں اسلام کا نظام عدلیہ، کتاب السیر میں بین الممالک قانون، دار الاسلام ودار الحرب کی وضاحت ہے، دنیا میں مغربی معاشی، سیاسی اور سماجی نظام کبھی کے تباہ ہو چکا، فضلاء مدارس دوران طالب علمی ان مضامین سے اتنا تو گذر چکے ہوں گے کہ آئندہ چل کر اس کام کو بڑھا سکیں، معذرت خواہی، شکست خوردگی کے بغیر مغرب کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر علمی استدلالی انداز میں اسلام کی برتری کو ثابت کرسکیں، کوئی مدرسہ، خانقاہ، دینی مرکز خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، سیرت اور سوانح اکابر کے اس پہلو کی آج کی بدلتی دنیا میں زیادہ سمجھنے کی ضرورت ہے، اور انسانوں کے تمام خود ساختہ سیاسی نظریات کو رد کر کے اسلام کے سیاسی نظریہ کی فوقیت اور برتری اور فوائد ثابت کر سکے، ضرورت ہے کہ تمام دینی مدارس میں اس طرح کی کتابیں داخل درس کی جائیں۔

سیاسیات اور حکمرانی سے متعلق بھی کچھ کتابیں شامل نصاب کی جائیں، جس میں دستور ہند وغیرہ کی شمولیت ہو، ہمارے اسلاف نے سیاست کے اس بگاڑ اور خرابی کے

زمانے میں سرگرم سیاست میں حصہ لیا ہے، جن کی تعداد اور فہرست لمبی ہے، انہوں نے خدمت خلق کو اپنا پیشہ بنایا اور سیاست کو صحیح رخ دینے اور سیاست کے ذریعے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی انتھک کوشش کی۔

اکابر اور سیاست

☆ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ

جو بانی دارالعلوم دیوبند ہیں، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں عملی اور قائدانہ حصلہ لیا، جنگ شاملی خود سپاہیانہ شریک ہوئے اور جنگی کی اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی ۱۸۵۷ کے انقلاب میں حضرت نانوتویؒ کے دوش بدوش رہے، جن لوگوں نے ان سیاسی اور جہادی اور ملکی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے خواہ اپنی لاعلمی اور معاملات سے بے خبری کی بنا پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے ان کی مصلحت اندیشی کا کوئی اعتبار نہی اور باخبر لوگوں کے یہاں لغو اور بیکار ہے، اسی طرح شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ جو نانوتوی کے ارشد تلامیذہ اور دارالعلوم کے بے نظیر استاذ تھے درس وتنصیف اور تلقین وارشاد اور جذبہ جہاد اور وطن کی خدمت میں پیش پیش رہے، آپ کا ایک ایک شاگرد دارالعلوم کا ستون اور مایہ ناز فرزند کی حیثیت رکھتا ہے، آپ کی سیاسی خدمات بھی بہت وسیع تر رہی ہیں، آپ نے ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست انقلابی تحریک چلائی جس کو ریولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ''ریشمی رومال تحریک'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، یہ تحریک بہت زیادہ مؤثر تھی مگر راز میں نہ رہ سکی اور ناکام ہوگئی، پھر بھی اس کی آگ جن کے دلوں لگی ہوئی تھی، انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا، تقریبا پانچ برس مالٹا میں قید رہے۔(۱)

☆ حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان کے تمام مقتدر رہنما نظر بند کر دیئے گئے تھے،

(۱) تاریخ دارالعلوم: ۵۳، مرتب حضرت مولانا قاری طیب صاحب، دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی

اور حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ، اور آپ کے رفقاء کار حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عزیز گلؒ، مولانا حکیم نصرت صاحب مرحومؒ، مولانا وحید احمد مرحوم کو مکہ معظّمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیا گیا، اور آپ کے جو ساتھی ہندوستان میں موجود تھے وہ تقریبا سب کے سب ہندوستان میں نظر بند کر دیئے گئے، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا آزادؒ کو بھی حکومت ہند نے گرفتار کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا تھا، حکومت کی اس متشددانہ پالیسی کے باوجود جن حضرات نے حوصلے اور پامردی کے ساتھ ملک کی رہنمائی کی ان میں سب سے پہلے مفتی اعظم ہند محمد کفایت اللہؒ اور آپ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان مرحوم اور حضرت مولانا عبدالباری مؒ فرنگی محلی کے اسمائے گرامی ہندوستان کی تاریخ سیاست کے صفحہ اول پر نظر آتے ہیں، برطانوی استعمار کے خلاف نظر بندوں کی رہائی کے مطالبہ کے عنوان سے تحریک کو منظم طریقے سے چلانے کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ ہندوستان میں جو لوگ تھے انہوں نے اس تحریک کو چلایا، اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ کے ذہن میں جمعیۃ علماء ہند کے نام سے ایک جماعت کے بنانے کا خیال آیا، چنانچہ مفتی صاحبؒ نے ۱۹۱۹ء میں ''جمعیۃ علماء ہند'' کی بنیاد ڈالی، اس کے قیام اور انتظام وانصرام میں حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ، حضرت مفتی صاحبؒ کے شریک کار تھے، چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ کی دعوت پر ہندوستان کے تمام صوبوں سے چیدہ چیدہ علماء دہلی تشریف لائے۔

اس سے کچھ پہلے ''خلافت کمیٹی'' کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، اس کے بنانے میں بھی حضرت مفتی صاحب کا بڑا حصہ تھا، اس میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا حسرت موہانی مرحوم، مولانا عارف ہنسوی، سب حضرت مفتی صاحب کے شریک کار تھے، انہی دنوں میں گاندھی جی نے کانگریس کی ابتداء کر دی، اس کام میں بھی گاندھی کے سب سے زیادہ مشیر حضرت مفتی صاحب تھے، ان دنوں علی برادران اور مولانا آزاد جیلوں میں تھے، کام کی اہمیت نے اور اخبارات نے مفتی

صاحب کے نام کا تعارف ملک میں کروادیا، اہل علم وہ خواہ مسلم تھے یا غیر مسلم، سب ہی مفتی صاحب کے علم و دانش کے قائل ہو گئے تھے۔

آپ آل انڈیا خلافت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ ممبر رہے، ورکنگ کمیٹی میں آپ نے بڑے بڑے الجھے ہوئے مسائل کو منٹوں میں حل کر دیا، آپ نے کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء میں رہ کر جن مسائل میں رہنمائی فرمائی اس کا اندازہ صرف انہی حضرات کو ہوسکتا ہے جو آپ کے ہر وقت ساتھی تھے، لیکن دنیا نے کبھی مفتی صاحب کے نام کو ان کے کاموں کے ساتھ شہرت کی جگہ پر نہیں پایا، وہ مٹ کر کام کرنے کے عادی تھے۔

جہاں آپ کو فہم رسا کی وجہ سے سیاسیات میں غیر معمولی درجہ حاصل تھا، وہاں آپ کی شخصیت کو بہ حیثیت عالم دین ہونے کے نمایاں حیثیت حاصل تھی، ''علم دین'' میں آپ کا درجہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ آپ کو حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری کے ان الفاظ سے بخوبی ہو جائے گا کہ جب کبھی حضرت شاہ صاحب مفتی صاحب کا ذکر فرماتے تو ان کے لئے ''عالم الدین والدنیا، مفتی کفایت اللہ'' فرمایا کرتے تھے۔

تحریک خلافت میں حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور گاندھی جی نے جیل جانے سے روک دیا تھا، لیکن ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں مفتی صاحب بہ حیثیت کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر جیل میں تشریف لے گئے، اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۳۲ء میں آپ کو ڈیڑھ سال کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا اور آپ کو دہلی جیل سے نیو سنٹرل جیل ملتان بھیج دیا گیا۔(۱)

☆ سحبان الہند، حضرت مولانا احمد سعید دہلوی

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے بعد جن علمائے کرام نے اس کو روز اول سے ہی اپنایا، ان میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب کا نام نامی بھی شامل ہے، اس کے یوم تاسیس سے مولانا ۱۹۴۰ء تک مستقل ناظم عمومی رہے، صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب

(۱) مفتی اعظم ہند، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، ایک مطالعہ، ۱۱۱=۱۱۳، فرید بک ڈپو، دہلی

تھے، ان حضرات کی کوششوں سے جمعیۃ علمائے ہند نہ صرف ہندوستان اور برما؛ بلکہ پورے عالم اسلام میں روشناس ہوئی۔

مفتی کفایت اللہؒ صاحب کے زیر تربیت فارغ التحصیل ہوئے، پہلے انہوں نے مذہبی مناظروں میں حصہ لیا، پھر سرگرم سیاست میں حصہ لیا، یہ وہ دور تھا جب عدم تعاون تحریک زوروں پر تھی، آپ نے اس تحریک میں حصہ لیا اور پہلی بار گرفتار ہو کر جیل میں رہے، وہ اپنی زندگی میں آٹھ بار جیل گئے اور زندگی کے پندرہ برس جیل میں گذارے، زیادہ تر ملتان، گجرات اور میانوالی کے جیلوں۔ میں رہے۔

جمعیہ علمائے ہند کے قیام کے بعد ملک میں سیاسی تحریکات نے زور پکڑا، رولٹ بل کے خلاف تحریک خلافت کے واسطے سے بہت شور وغوغا ہوا، مسلمانوں نے جمعیۃ علمائے ہند کی قیادت میں تحریک آزادی میں حصہ لیا، ہندو مسلمانوں کا اتحاد اس وقت نقطہ عروج پر تھا، جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے بے دھڑک جیل جا رہے تھے، مولانا احمد سعید صاحب ان تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں گرفتار ہو کر جیل میں رہے، ایک سال قید با مشقت کی سزا ہوئی، ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو رہائی ہوئی، ۱۹۳۰ء کی تحریک میں اور پھر ۱۹۳۲ء کی تحریک میں حضرت مولانا کفایت اللہ کے ساتھ گجرات جیل میں اور پھر ملتان جیل میں رہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں پر جو مصیبتیں ٹوٹیں، خاص کر دلی اور پنجاب کے مسلمانوں کو تباہی، وبربادی اور قتل وغارت گری کا جو عذاب سہنا پڑا، اس خطرناک دور میں آپ نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا اور دلی میں مسلمانوں کے قدم جمانے میں اہم رول ادا کیا۔

ان فسادات کی روک تھام کے لئے مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمن، حافظ عزیز حسن بقائی اور سید محمد جعفری صاحب کا وفد روزانہ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتا تھا، جو تینوں کو بتایا کرتا تھا کہ کل مسلمانوں پر کیا گذری،

ایک دن گاندھی جی مسلمانوں کے پاس تشریف لائے، کونے کونے کے مسلمان سمٹ کر مولانا احمد سعید صاحب کے علاقے میں جمع ہو گئے، دلی کے اور محلے مسلمانوں سے تقریباً خالی ہو چکے تھے، مہاتما گاندھی کا جلسہ مسٹر آصف علی والے مکان کوچہ چیلان میں منعقد کیا گیا، مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کرنی شروع کی، اور دو چار لفظ ہی بول پائے تھے کہ لفظوں کی جگہ آنسو بہنے لگے، مولانا تقریر نہ کر سکے، اور مولانا حفظ الرحمن صاحب نے تقریر کی، مولانا روزانہ مہاتما گاندھی سے شکایت کرتے، وزیر داخلہ سردار پٹیل کی ناراضگی بھی مول لی، مگر آپ نے کلمہ حق کہنے سے بھی کبھی گریز نہیں کیا، حکومت خود فساد کرانے والوں کے نرغے میں تھی، تقسیم وطن کے نتیجے میں خوف وہراس اور دل شکستگی کا دور دورہ تھا، امن کمیٹی کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، ٹاؤن ہال جو امن کمیٹی کا مرکز تھا اس کے چاروں طرف روزانہ ہی لاوارث لاشیں ملتی تھیں۔ ہندو دوستوں نے از راہ ہمدردی مشورہ دیا کہ مسلمانوں کو لے کر اوکھلا منتقل ہو جائیں جہاں ان کی حفاظت کا انتظام ہوگا، مگر انہوں نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور خود کو عوام سے علاحدہ ہونے نہ دیا۔(۱)

☆ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاریؒ

آپؒ عنفوان شباب ہی سے جمعیۃ علماء و تحریک خلافت و کانگریس میں آزادی وطن کے لئے طوفانی دوروں اور پر اثر تقریروں سے ہر جماعت کے محاذ پر سرگرم رہے اور وہ خدمات انجام دیں کہ ملک کے ممتاز اور سرگرم لیڈروں میں مقام حاصل کر لیا، مدراس کے قیام کے دوران ۱۹۲۸ء میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں اپنے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں کلکتہ چلے گئے، وہاں دو سال مقیم رہے، وہیں سے مولانا نے اپنے زور بیان اور ترجمہ قرآن کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کیا، پھر امروہہ میں تین سال تدریس کے بعد ۱۹۳۸ء میں دہلی آئے، ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی، ایک ادبی رسالہ ''برہان'' بھی اس ادارہ سے نکالا۔

(۱) سحبان الہند، مولانا احمد سعید دہلوی، ایک سیاسی مطالعہ، ۱۰۲ تا ۲۰۵، فرید بک ڈپو، دہلی

جمعیۃ علماء کی وابستگی اور مولانا کی خدمات وخلوص سے متاثر ہوکر اکابرین نے مولانا مرحوم کو ۱۹۴۲ء میں جمعیہ علماء کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا، یہ سلسلہ تادم واپسیں قائم رہا، جمعیۃ کی بقا کے لئے فنا فی الجمعیۃ ہوکر کام کیا، اپنے گھر واہل عیال کے مستقبل سے اللہ کے توکل پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہمیشہ لاپرواہ رہے، کبھی آرام کرنا نہ جانا، بیمار ہو یا تندرست جاڑا ہو یا گرمی، آج یہاں ہیں تو کل وہاں، جوش خدمت خلق میں اپنی صحت تک کا خیال نہ رکھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں کئی مرتبہ بچے، گولیاں سر پر سے اور دائیں بائیں قریب سے گذر گئیں، اللہ کریم کو اب تک زندہ رکھنا تھا، اب تک زندہ رہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری فرمایا کرتے تھے:

''مولانا حفظ الرحمن کی ۱۹۴۷ء کے خونی دور کے ایک دن کی خدمت ہم خانقاہی لوگوں کی تمام عمر کی عبادت سے زیادہ ہے۔

مرحوم کچھ دنوں، یوپی، اسمبلی کے ممبر رہے، چند مہینوں کے بعد ہی پارلیمنٹ کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور تاحیات کامیاب ہوتے رہے۔

دفتر جمعیۃ علماء ہند کی مصروفیتوں کے علاوہ مولانا نے اپنی مرضی کے خلاف ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب سابق صدر جمہوریہ ہند کے اصرار پر سنی اوقاف دہلی کی صدارت قبول فرمائی۔ اور اس سے متعلق تمام اداروں کی ذمہ داری قبول کی، جن میں مدرسہ عالیہ فتحپوری، مسلم ہائر سکنڈری اسکول فتح پوری، دلی کالج اجمیر گیٹ، فتحپوری پبلک لائبریری، انجمن ترقی اردو، حج کمیٹی بمبیء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شامل تھے۔

کانگریس وغیرہ کی میٹینگوں میں مستعدی اور پابندی سے اپنے فرائض ادا کرتے، حج کمیٹی کے دوران پارلیمانی امور کو بھی سبکدوش فرماتے رہتے۔

مولانا مرحوم کی ساری زندگی سیاسی تگ ودو میں کانگریس کے ساتھ گذری اور اس درجہ کے کانگریسی شمار کئے گئے، بعض لوگوں نے انہیں وظیفہ خوار تک قرار دیا، لیکن مولانا مرحوم نے ملکی اور قومی مفاد کی وجہ سے اپنی وضع نہ بدلی، پورے خلوص کے ساتھ کانگریسی

رہے، پھر بھی انتخابات ختم ہوتے ہی مولانا کا انداز حزب مخالف کے لیڈروں جیسا ہوجاتا اور وہ یہ کہتے کہ جتنا وطن عزیز کا میرے اوپر حق ہے، اتنا ہی مسلم اقلیت کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے مسلمانوں کا بھی حق ہے، چنانچہ حکومت اور کانگریس دونوں سے مسلمانوں کے لئے دشمن کی طرح لڑتے، ہندو، سکھ حضرات کیس بھی اگر لے کر کھڑے ہوئے تو ان کا رویہ وہی ہوتا جو مسلمانوں کے لئے ہوتا تھا، کوئی تفریق نہ ہوتی، یہی وجہ تھی کہ جب بھی انتخابات میں حصہ لیا، بھاری تعداد میں ہندو ووٹوں سے کامیاب ہوئے، مسلمان ووٹ تو انہیں نوے فیصدی ملتے ہی تھے، ہندو کے بھی دوسری پارٹیوں کے زور لگانے کے باوجود مولانا ہی کو ووٹ ملتے''۔(۱)

☆ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ

مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کی اسارت مالٹا کا دور ہے جہاں سے مولانا کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، مولانا کی سیاسی زندگی کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر سیاسی مسائل میں اور لوگوں سے مختلف تھا، اس لئے کہ آزادی کی جنگ میں شریک ہونے والے بہت سے مسلمان آزادی حاصل کرنے اور انگریزوں کو بھگانے کے جوش میں اس کو فراموش کرجاتے تھے کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن کیا ہوگی، اس وقت مولانا سجاد رحمہ اللہ کے سامنے ایک ''مثبت'' پروگرام تھا یعنی ''امارت شرعیہ'' کا قیام؛ تاکہ آئینی حدود میں رہ کر اس کے ذریعہ مسلمان اپنے دینی اقدار کو محفوظ رکھ سکیں، یہاں تک کہ آزادی کے بعد بھی مذہبی تشخص کو ان کا دستوری حق تسلیم کرلیا جائے اور اسی مشترکہ پلیٹ فارم سے آزادی کے مجاہدین کا تعاون بھی کیا جاسکے۔

مولانا کی اس سیاسی پالیسی کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ مولانا کے نزدیک ملی مسائل کو ملکی مسائل پر ترجیح حاصل تھی، وہ قوم پرست لیڈروں کے ساتھ اتنی دور نہیں جاسکتے

---

(۱) مجاہد ملت، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ، ایک سیاسی مطالعہ ۳۲=۳۳=۳۴، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، فرید بک ڈپو، دہلی

تھے کہ جہاں جا کر مذہبی معاملات میں مداہنت کا شکار ہونا پڑتا، یہی وجہ ہے کہ مولانا ہمیشہ کانگریس میں مشروط شرکت کے قائل رہے، اور جہاں بھی دین میں مداخلت، یا مسلمانوں سے ناانصافی محسوس کی تو مصلحت شناسی اور رواداری ان کی زبان بند نہ کرسکی اور پوری جرأت کے ساتھ انہوں نے مخالفت کی۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زرعی انکم ٹیکس کا قانون پاس کیا اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی، مسلم ممبران اسمبلی کے ذریعہ اس کے خلاف اسمبلی میں آواز اٹھائی فضاء ہموار کی بالآخر ۲۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اسمبلی میں حکومت بہار نے مولانا کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور وقف جائداد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا، اور پھر اس کے بعد آپ نے مسلم اوقاف کا ایک بل مرتب فرمایا اور اسے بہار اسمبلی میں پیش کر دیا، جو منظور ہوا، جب گاؤکشی کا مسئلہ اٹھا تو کانگریس پارٹی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو رضا کارانہ طور پر اسے تسلیم کرلینا چاہئے، اور گائے کی قربانی نہیں کرنی چاہئے، مولانا نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی اور اس پر اپنا تفصیلی فتوی تحریر فرمایا، جو مولانا کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے اور فتاوی امارت شرعیہ بہار کی پہلی جلد میں شامل ہے۔

۱۹۳۹م میں ایک قانون پاس ہوا، جس میں دَین مہر اور جہیز کو قانونی جرم قرار دیا گیا، مولانا نے اس کی مخالفت کی اور امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ۔ جو مولانا کی تائید سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔۔۔۔کے ذریعے بہار اسمبلی میں اپنے موقف کی ترجمانی کرائی، بالآخر مسلمان اس سے مستثنیٰ کر دیئے گئے، جب شدھی تحریک شروع ہوئی تو کانگریس کے اعلی قائدین کی رائے تھی کہ مسلمان اس کی مخالفت میں زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ کریں گے اور کانگریس کے مسلم قائدین بھی تذبذب میں تھے؛ تاکہ ہندو مسلم نفرت کی فضاء پیدا نہ ہو، جو انگریز چاہتے تھے، لیکن مولانا کی اسلامی حمیت نے اس معاملے میں کسی رواداری کو گوارہ نہ کیا، آپ نے پوری قوت وشدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور عملی طور پر فرقہ پرستوں کی اس مہم کو ناکام بنا دیا۔

۱۹۳۷ء میں جب بہار میں الیکشن ہوا تو مولانا نے ''مسلم انڈی پینڈینٹ پارٹی''

قائم کی، مولانا خود اس پارٹی کے سرپرست تھے، اور امارت شرعیہ اس کی تائید کرتی تھی، کانگریس کے بعد جب سب سے زیادہ سیٹیں اسی پارٹی کو حاصل ہوئیں؛ لیکن کانگریس نے حکومت بنانے سے انکار کردیا، مولانا نے محسوس کیا کہ اگر مسلم انڈی پینڈینٹ پارٹی حکومت بنالیتی ہے تو یہ مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا؛ چنانچہ اس پارٹی نے حکومت بنائی اور جناب محمد یونس وزیر اعلی بنائے گئے، اس حکومت نے مسلمانوں کے حق میں کئی اہم فیصلے کئے جن میں ایک اردو زبان سے متعلق تھا، یہاں تک کہ کانگریس کے فرقہ پرست لیڈر محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے حکومت نہ بناکر غلطی کی ہے۔

مولانا اس سلسلہ میں سب سے پہلا اقدام یہ کیا کہ ''مدرسہ انوار العلوم'' گیا کے سالانہ جلسہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پورے صوبہ کے علماء کو دعوت دی اور علماء کی کثیر تعداد کو اکٹھا فرماکر ان کی ایک متحدہ تنظیم بنائی، جو''انجمن علماء بہار'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

جب خلافت کمیٹی بنی تو اس کے مؤسسین اور بانیین میں مولانا سجاد صاحب بھی تھے، مولانا سجاد صاحب نے اس حوالہ سے مولانا عبد الباری صاحب سے تبادلہ خیال کیا اور انہیں دونوں بزرگوں کی تحریک پر مولانا محمد علی جوہر، مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان اور بعض دیگر علماء وقائدین کی مشاورت سے ممبئی میں خلافت کمیٹی کی بنیاد پڑی۔

مولانا ممبئی سے واپس آئے اور گیا میں دوسری اور پھلواری شریف میں تیسری خلافت کمیٹی کی صدارت امیر شریعت ثانی شاہ محی الدین صاحب نے فرمائی، اس کے بعد برابر مولانا اس تحریک کے دل ودماغ بنے رہے، مولانا کی یہی صلاحیت تھی کہ ۱۹۹۲ء میں گیا میں ہونے والی آل انڈیا خلافت وجمعیۃ علماء کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر معروف عالم ابوالبرکات مولانا عبد الرؤف دانا پوری صدر مجلس استقبالہ نے برسر عام مولانا کے متعلق اعتراف کیا کہ ہندوستان اگر ابھی آزاد ملک ہوتا تو گورنر جنرل مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو بنایا جاتا اور مولانا حبیب الرحمن مہتمم دار العلوم دیوبند نے اس کی تائید فرمائی۔

اس کے علاوہ مولانا بے شمار مواقع سے امت مسلمہ کی رہنمائی اور رہبری اور حکومت وقت سے مسلمانوں کے حق میں فیصلے کروائے ہیں۔(۱)

ان سوانحی خاکوں کو ذکر کرنے کا مقصود یہ ہے کہ ہمارے اکابر عالمی اور ملکی مسائل سے نابلد نہیں تھے، قانون کی باریکیاں، اقوام کی طبائع، میدانِ سیاست کا اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھے، حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ سے لے کر شیخ الہند تک نے اپنی بساط کے موافق میدانِ سیاست میں بھی رہنمائی واصلاح کا کام کیا، کارزار سیاست میں عملی حصہ لینے والے عملی سیاست میں رہ کر ان کا زہد واستغناء، مذہبی تصلب اور اعمال کی مواظبت یہ وہ کمالات تھے جو آج ہمارے لئے لائق تقلید ہیں، پھر ہمارے علماء اسلام نے نظریاتی اعتبار سے خارجی دنیا سے الگ تھلگ نہیں تھے، مسلم حکمرانوں کا احتساب وقتاً فوقتاً ان کی رہبری، مخالف مسلمان فیصلوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاریخ ہمارے ملک میں قریبی زمانے کی مثال ہے۔

مغربی جمہوری نظام حکومت کے مقابلہ میں اسلامی نظام سیاست کی برتری اسی وقت ثابت کی جاسکتی ہے جب کہ اسلام کے ابواب سیاست کا عصر حاضر کے سیاسی نظاموں کے تناظر میں مطالعہ کیا جائے، جیسے اسلامی معاشی نظام کی جزئیات، سودی نظام سے تقابل پر جیسا کام ہوا ہے ویسا کام اردو عربی میں سیاسی مسائل پر نہیں ہے، اس لئے سیاست کا بقدر ضرورت مواد، ضروری خدو خال طلبہ کو سمجھاتے جائیں، پارلیمنٹ، اسمبلی، انتخابات وغیرہ کا مذاکرہ کرایا جائے۔

(۱) وہ جو بیچتے تھے دوائے دل: ۱۱۴۔۱۳۸ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

فن تصوف

جہاں تک دینی مدارس کے نظام کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کے نظام میں اسلامی اقدار کی پرورش، دینی اخلاق کی نشوونما اور مذہبی روایات وصفات کی تربیت کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے، انحطاط زمانہ اگرچہ تربیت واصلاح کی وہ مردم ساز فضا تو اب نہیں رہی جوان مدارس کے شروع اور بعد کے عہدوں میں تھی اور جہاں داخل ہوکر بڑے زنگ آلود سکے منجھ کر نکلتے تھے، تاہم تربیت واصلاح کی موجودہ فضا بھی دوسرے تعلیمی اداروں کی بہ نسبت بسا غنیمت ہے ن استاذ اور شاگرد کے درمیان شفقت وادب، محبت واحترام اور اخلاص وعزت کا اسلامی اور مشرقی تصور کا خارجی وجود ان ہی مدارس میں نظر آتا ہے، برصغیر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس میں ہڑتال، طلبہ کے اجتماعی جارحانہ اقدامات اور مدرسہ یا اساتذہ کے خلاف طلبہ کی یورش وفساد کی خبر آپ نے نہیں سنی ہوگی، جو یہاں کے نظام تربیت پر اسلامی تعلیم کی مضبوط گرفت کا اثر ہے، یہ اس نظام تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہے کہ یہاں سے نکلنے والے (اپنی بعض علمی کمزوریوں اور عملی کوتاہیوں کے باوجود) دین، اخلاق اور اسلامی خیالات ورجحانات کے حامل اور داعی ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دینی مدراس ے وجود میں آنے کے بعد تمام اسلامی تحریکوں کو بنیادی ایندھن یہیں سے فراہم ہوتا رہا ہے، دینی مدارس میں اصلاح وتربیت کے نظام میں مسلسل انحطاط بھی قابل فکر ہے، تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت مدارس میں رہائش اختیار کرتی ہے، ان کی تربیت کا بہترین زمانہ اوروقت مدرسہ کے سپرد ہوتا ہے، اب یہ ارباب مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصلاح وتربیت کا اس طرح مرتب کریں کہ پڑھنے والے میں ایک عالم دین کے اخلاق وصفات

پیدا ہوں اور اسلامی صحت مند عادات واطوار پران چڑھے، اس کے لئے جہاں اکابر واسلاف کی زندگی کے واقعات، تصوف واخالق کی کتابوں کا مطالعہ اور نیک وبلند اخلاق اساتذہ اور بزرگوں کی صحبت ضروری ہے، انسانی عمر کے مختلف تقاضوں اور رجحانات کا خیال رکھنا اور نگرانی کرنا بھی ضروری ہے، انسانی عمر کے مختلف مراحل کے کچھ تقاضے اور رجحانات کا خیال رکھنا اور نگرانی کے پرزے ذرا بھی ڈھیلے ہوجائیں تو کسی بھی وقت کوئی بھی رجحان زندگی کو غلط راستہ پر ڈال سکتا ہے، فکری گمراہی، عملی خرابی اور اخلاقی بے راہ وری کے کانٹے دامن حیات کو تار تار کرسکتے ہیں، مدارس کا نظام تربیت اس پہلو سے قابل توجہ ہے جس کے لئے خانہ پوری کرنے والے بے درد اساتذہ کی نگرانی ہرگز ہرگز کافی نہیں، اس کے لئے ایسے صاحب درد اساتذہ کی ضرورت ہے جن میں اخلاص، للّٰہیت ہو، تقوی وخشیت ہو، جو سینے کے اندر شفقت سے معمور دل رکھتے ہوں، اور جو طلبہ کو بچوں اور چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتے ہوں۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ''یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا، جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا، نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھا رہے ہیں، طریقت سکھا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرز عمل، ان کا کردار، کیریکٹر وہ تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہوجاتے تھے، تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے اور کمی کی بناء جو کچھ بھی ہو، مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیہ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے، جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے''۔(۱)

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

---

(۱) البلاغ: صفر المظفر ۱۴۳۹ھ، ص: ۷۹

''یہی حال تصوف اور اخلاق کا ہے کہ اس کو باقاعدہ درس میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ مدارس کا ماحول بذات خود اخلاق وطریقت کی عملی تربیت کرتا تھا، اور باقی ماندہ کسر ذاتی مطالعہ اور کسی مرشد کے تعلق سے پوری ہوجاتی تھی؛ لیکن اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور اخلاق کی کتب باقاعدہ داخل درس ہوں، اس مقصد کے لئے حضرت امام غزالی ''ہدایۃ الہدایۃ'' اور ''اربعین'' ''احیاء العلوم'' کے منتخب حصے، حضرت امام سہروردی کی ''عوارف المعارف'' حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ''التکشف'' اور ''التشرف'' وغیرہ مختلف درجات میں رکھی جاسکتی ہیں''۔(۱)

ہمارے ملک ہندوستان میں مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ کی مشکاۃ الآثار اور بعض مدارس میں مولانا عاشق الٰہی بلندشہری علیہ الرحمہ کی زاد الطالبین داخل نصاب ہے، ندوہ اور اس سے ملحق مدارس میں علامہ حکیم عبدالحئی لکھنوی کی تہذیب الاخلاق، مگر یہ کتابیں اصلاح باطن، تزکیہ نفوس، سیرت سازی، نفس وشیطان کے مکر سے آزادی کے ارادے سے نہیں؛ بلکہ نحو وصرف، لغوی تحقیق، ترجمہ وعبارت کے ساتھ ہی گذار دی جاتی ہیں، اب تک کہیں نہیں سنا گیا کہ ان مقاصد کو بھی کسی نے سامنے رکھا ہے؛ بلکہ اکثر وبیشتر متعلقہ استاذ سہل عبارت کی وجہ سے کتاب کی کماحقہ تیاری نہیں کرتا؛ یا سرسری طور پر جلدی آخر سال میں بوجھ سر سے اتار دیا جاتا ہے۔

مدارس کی اصل روح کا احیاء اور اس کے لئے چند تجاویز

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

''لہٰذا مدارس کے نصاب ونظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۵۲، حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب، زمزم بک ڈپو دیوبند، ہمارا تعلیمی نظام: ۹۹

سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ مدارس کی روح کے احیاء کی فکر کی جائے، اس روح کے احیاء کا تعلق اصل میں تو اہل مدارس کی قلبی لگن سے ہے؛لیکن اس سلسلے میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں:

(۱) تمام مدارس میں تصوف واحسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے۔

(۲) اساتذہ وطلبہ پر لازم ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہوکر بزرگانِ دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں ، اس میں حضرت تھانویؒ کی ''ارواح ثلاثۃ'' ''تذکرۃ الرشید'' ''حیات قاسمی'' ''تذکرۃ الخلیل'' ''حیات شیخ الہند'' ''اشرف السوانح'' اور حضرت شیخ الحدیث کی ''آپ بیتی'' کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

(۳) ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کے لئے کسی شیخ طریقت سے باقاعدہ اصلاح تربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں ان کے اس پہلو کو بطورِ خاص نظر میں رکھا جائے۔

(۴) جس مدرسہ کے قریب کوئی صاحب ارشاد بزرگ موجود ہوں وہاں کے اساتذہ اور طلبہ ان کی صحبت وخدمت غنیمت کبری سمجھ کر اختیار کریں اور کبھی کبھی مدرسے میں ان کے اجتماعی وعظ ونصیحت کا اہتمام کیا جائے''۔(۱)

مدارس میں مجالس ذکر

ضرورت ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کا خاص اہتمام ہو؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت نازل ہو۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے حضرت مفتی شفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے نام مدارس میں ذکر کی اہمیت کے سلسلہ میں جو مکتوب ارسال فرمایا اس کو نقل کرتا ہوں۔

---

(۱) ہمارا تعلیمی نظام:۹۵

بنام مولانا محمد یوسف صاحب بنوری و مفتی محمد شفیع صاحب رحمہا اللہ

مدارس کے روز افزوں زوال، طلبہ کی دین سے بے رغبتی، بے توجہی اور لغویات میں اشتغال کے متعلق کئی سال سے میرے ذہن میں یہ ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی بہت کمی ہوتی جارہی ہے، بلکہ معدوم، بلکہ اس لائین سے تو بعض میں تنفر کی صورت دیکھتا ہوں، جو میرے نزدیک بہت خطرناک ہے، ہندوستان کے مشہور مدارس دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم، شاہی مسجد مرآدآباد، وغیرہ کی ابتداء جن اکابر نے کی تھی وہ سلوک میں امام الائمہ تھے، ان ہی کی برکات سے یہ مدارس ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اب تک چل رہے ہیں:

میں اس مضمون کو کئی سال سے اہل مدارس، منتظمین اور اکابرین کی خدمت میں تحریرا اور تقریرا کہتا اور لکھتا رہا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ آپ جیسے حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں تو مفید اور مؤثر زیادہ ہوگا، مظاہر العلوم میں تو میں کسی درجہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا ہوں اور دارالعلوم کے متعلق جناب الحاج قاری محمد طیب صاحب سے بار بار تقریرا و تحریرا عرض کر چکا ہوں، اور بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل مدارس کو متوجہ کرتا رہتا ہوں، مدارس کے روز افزوں فتنوں سے بہت ہی طبیعت کو کلفت پہنچتی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ فتنوں سے بچاؤ کی صورت صرف ذکر اللہ کی کثرت ہے، جب اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا تو دنیا ختم ہوجائے گی، جب اللہ تعالیٰ کے پاک نام اتنی قوت ہے کہ ساری دنیا کا وجود اسی سے قائم ہے تو مدارس بے چارے ساری دنیا کے مقابلہ میں دریا کے مقابلہ میں قطرہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو ان کی بقاء اور تحفظ میں جتنا دخل ہوگا وہ ظاہر ہے، اکابر کے زمانہ میں ہمارے یہ جملہ مدارس میں اصحاب نسبت وذاکرین کی کثرت جتنی رہی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں اور اب اس میں جتنی کمی ہوگئی ہے، وہ بھی ظاہر ہے، بلکہ اگر یوں کہوں کہ اس پاک نام کے مخالف حیلوں بہانوں سے داخل ہوتے جارہے ہیں تو میرے تجربہ میں غلط نہ ہوگا۔

اس لئے میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں کچھ ذاکرین، کی تعداد ضرور ہوا کرے، طلبہ کے ذکر کرنے کے تو ہمارے اکابر بھی خلاف رہے ہیں، اور میں بھی موافق نہیں، لیکن منتہی طلبہ

یا فارغ التحصیل یا اپنے سے یا اکابرین سے تعلق رکھنے والے ذاکرین کی کچھ تعداد مدارس میں علی التبادل ضرور ہوا کرے اور مدرسہ ان کے قیام کا کوئی انتظام کر دیا کرے، مدرسہ پر طعام کا بار ڈالنا تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ طعام کا انتظام تو مدرسہ کے اکابر میں سے کوئی شخص ایک یا دو اپنے ذمہ لے لے یا باہر سے مخلص دوستوں میں سے کسی کو متوجہ کر کے ایک ایک ذاکر کا کھانا اس کے حوالہ کر دے جیسا کہ ابتداء میں مدارس کے طلبہ کا انتظام اسی طرح ہوتا تھا؛ البتہ اہل مدارس ان کے قیام کی کوئی صورت اپنے ذمہ لے لیں، جو مدرسہ میں ہو اور ذکر کے لئے کوئی ایسی مناسب شکل تجویز کریں کہ طلبہ کا کوئی حرج نہ ہوں نہ سونے والوں کا، نہ مطالعہ کرنے والوں کا۔

لہٰذا میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں دد چار ذاکرین مسلسل ضرور رہیں کہ داخلی اور خارجی فتنوں سے بہت سے امن کی امید ہے، ورنہ مدارس میں جو داخلی وخارجی فتنے بڑھتے جا رہے ہیں، اکابر کے زمان سے جتنا بعد ہوتا جائے گا ان میں اضافہ ہی ہوگا۔(۱)

---

(۱) دینی اداروں اور جماعتوں کی ذمہ داریاں: ۱۴۷-۱۵۰، حضرت مولانا قمر الزمان صاحب الہ آبادی، مکتبہ معارف، الہ آباد

مغرب سے الحاد کا جو سیلاب آ رہا ہے اور اسلام کے پیش کردہ نظام حیات پر جو اعتراضات ہو رہے تھے ان کا صحیح حل یہ تھا کہ ''اسرار شریعت'' کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے نصاب میں داخل کر لیا جاتا، اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) حجۃ اللہ البالغۃ، امام ابن قیم کی ''اعلام الموقعین'' کے کچھ منتخب حصے یا امام غزالی کی شہرہ آفاق اور اپنی منفرد نوعیت کی تصنیف ''احیاء علوم الدین'' کے وہ ابواب جو سیاست مدنیہ اور معاشرت سے متعلق ہیں کو داخل نصاب کیا جا سکتا تھا، یا اس قسم کی کوئی اور کتاب پڑھائی جا سکتی تھی؛ مگر چوں کہ ملا نظام الدین سہالویؒ کے قدیم نصاب میں اس موضوع کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی، ماضی قریب میں بعض مدارس نے اس کو داخل نصاب کیا ہے، مگر پھر بھی ان کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جو ان کا حق ہے۔(۱)

---

(۱) دینی مدارس اور عصر حاضر، ۲۶، محمد رضوان القاسمی، مرکز دعوت و تحقیق حیدر آباد (الہند)

تعارف ادیان و مذاہب وفرق ضالہ

ادیان و مذاہب کے مطالعہ کے سلسلے میں فکر نانوتوی اور گنگوہی کا بہت زیادہ اثر ہے، حضرت نانوتویؒ کے بنیادی افکار یہ ہیں کہ حضرت حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ کے اسلامی تصور کو سامنے رکھ کر فکر اسلامی کی نئی تعبیر وتشریح اسلام کے اصول ومبادی اور اس کے اولین روایات کی حفاظت وصیانت اور ان میں ترمیم وتبدیلی سے گریز کے ساتھ زمان ومکان کی رعایت، عصری مشکلات ومطالبات کو پیش نظر رکھنا، جس کی بدولت دین اپنی اصلیت و ماہیت کو بدلے بغیر اپنی روایت کو تجدید واجتہادی تسلسل کے ساتھ قائم رہے اور ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے ایک جامع ومعتدل اور مثالی وعملی نظام حیات فراہم کرے، ''فکر'' نانوتوی کا خلاصہ کوئی فلسفیانہ مکتب فکر، یا اہل سنت والجماعت سے الگ کوئی گروہی تصور نہیں؛ بلکہ کتاب وسنت کی جامع تعلیمات کے علم اور اس کے مطابق نظام فکر وعمل کا نام ہے جو عصری مشکلات ومطالبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جحت طلبیوں اور حسیاتی ازموں کی نفسیات کو مکمل طور پر اپیل کرنے والا ایک سائنٹفک انداز ہے، جس کی بنیاد شاہ وی اللہ رحمہ اللہ نے ڈالی تھی، دوسرے لفظوں میں وہ کلیتا اہل سنت والجماعت ہی والا مکتب فکر ہے، جس میں افراط ہے، نہ تفریط، غلو ہے، نہ مبالغہ؛ بلکہ اس میں کمالِ اعتدال اور جامعت کا جوہر پیوست ہے، نیز اس میں کلامی طور پر ماتریدیت واشعریت، فقہی طور پر حنفیت اور وقت ضرورت دوسرے مسالک فقہیہ سے استفادہ، وجدانی طور پر احسان وتصوف اور سیاسی طور پر اعلائے کلمہ اللہ اور اظہار دین اسلام کے عناصر ورجحانات نمایاں ہیں۔(۱)

(۱) فکر نانوتوی اور دور حاضر میں اس کی معنویت: ۸، محمد ابو بکر قاسمی پورنوی معهد الامام ولی الله الدهلوی، للدراسات الاسلامیۃ

تاریخ دارالعلوم دیوبند مرتب قاری طیب صاحب میں مذکور ہیں:

''متعدد مناظرے عیسائیں اور آریہ سماجیوں سے کئے، تصانیف اور تقریروں کے ذریعہ ولی اللہ مسلک کی وضاحت اور اشاعت کی متکلمانہ اور عارفنہ انداز سے دلائل اصول اسلامیہ اور اساسی عقائد دین کو عقلی دلائل سے مستحکم اور مضبوط کیا اور دین اسلام کی سرحدات کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اغیار کے حملے ان پر اثر انداز نہ ہوسکیں''(۱)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''ایک عالم دین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جن دوسرے مذاہب وادیان کا براہ راست اسلام سے تصادم رہا ہے اور جن کے تبلیغی مشن اب بھی سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں، نیز خود مسلمانوں کے وہ فرقے اور گروہ جنہوں نے اپنے کچھ مخصوص نظریات کی بناء پر اپنا مستقل وجود قائم کیا ہوا ہے، ان سب کے بنیادی عقائد وافکار سے وہ فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو؛ تا کہ بوقت ضرورت ان کی جواب دہی کر سکے، لہٰذا درس میں ''الملل والنحل'' یا ''الأ دیان والفرق'' کے نام سے ایک مستقل موضوع کا اضافہ ہونا چاہئے، جس میں ان ادیان وفرق کا مختصر تعارف، ان کے بنیادی عقائد وافکار اور ان کی تردید کے بنیادی دلائل بیان کر دیئے جائیں جن کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کو زیادہ واسطہ پیش آتا ہے، تا کہ ان سے متعلق ضروری اجمالی معلومات ہر طالب کو علم ہو جائیں اور جن لوگوں کو بعد میں ان میں سے کسی مذہب یا فرقے پر خصوصی کام کا موقع ملے، اس کے لئے یہ تعارف ایک بنیاد کا کام دے سکے''۔(۲)

---

(۱) تاریخ دارالعلوم: ۵۳، مرتب حضرت مولانا قاری طیب صاحب، دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی

(۲) ہمارا تعلیمی نظام: ۹۹

وحدتِ انسانیت پر تمام مذاہب کو اور وحدت امت پر تمام فرق ضالہ کو متحد کیا جا سکتا ہے، وجوہِ اختلاف اور مشترکہ اقدار کا اندازہ ہونا ضروری ہے، بے جا صلح کل یا غلط شدت پسندی دونوں مذموم ہیں، سب جانتے ہیں کہ اتحاد حق پر مطلوب ہے، اختلاف باطل کے لئے ہوسکتا ہے۔

محاضرات علمیہ (مطالعہ ادیان وفرق)

دار العلوم اپنی مرکزیت کے پیش نظر دین و مذہب کے متعلق باصلاحیت افراد تیار کرنا اپنی ذمہ دار تصور کرتا ہے، امت مسلمہ کو راہِ راست سے ہٹانے کے لئے نت نئے باطل نظریات اور فتنے پیدا ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں دار العلوم نے اپنی ذمہ داری محسوس کی کہ فرزندان دار العلوم کو امت کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کے لئے خصوصی طور پر تیار کیا جائے، اس مقصد کے لئے ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۴ء میں طلبہ کی تربیت کا ایک سلسلہ ''محاضرات علمیہ'' کے عنوان سے شروع کیا گیا جس میں اس وقت سات موضوعات پر طلبہ کو تربیت دی جارہی ہے وہ موضوعات حسب ذیل ہیں:

۱) ہندومت۔

۲) عیسائیت۔

۳) شیعیت۔

۴) قادیانیت۔

۵) غیر مقلدیت۔

۶) بریلویت۔

۷) مودودیت۔

ہر موضوع پر سال بھر میں متعدد محاضرے پیش کئے جاتے ہیں، ہر موضوع کے لئے الگ الگ اساتذہ مقرر ہیں جو متعلقہ موضوع پر تیار شدہ مقالہ پیش کرتے ہیں، محاضرات میں صرف دورہ حدیث سے فارغ شدہ (افتاء وتکمیلات) کے طلباء شرکت کرتے ہیں۔

فن	تعداد	نصاب
یہودیت وعیسائیت	٦	محاضرات یہودیت، مولانا نعمت اللہ اعظمی
ہندوازم	۴	محاضرات ہندوازم، مولانا عبدالحمید نعمانی
قادیانیت	۵	محاضرات قادیانیت، مولانا قاری عثمان منصور پوری
شیعیت	٦	محاضرات شیعیت، مولانا محمد جمال میرٹھی
رضاخانیت	٦	محاضرات غیر مقلدیت، مولانا مفتی امین صاحب پالنپوری
غیر مقلدیت	٦	محاضرات غیر مقلدیت، مولانا مفتی محمد راشد اعظمی
مودودیت	۵	محاضرات مودودیت، مولانا عبدالخالق سنبھلی (۱)

(۱) دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ: ۱۳۹، محمد محمد اللہ صاحب، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند

انگریزی زبان

ذیل کے مضمون کا خلاصہ یہ ہیکہ دارالعلوم دیوبند کے دینیات کے نصاب میں ہندی اور انگریزی داخل ہے؛ لیکن اس کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے طالب علم اس سے نابلد ہی آتا ہے، اکابر کا ہمیشہ خیال رہا ہے کہ فارسی کی مقدار کچھ کم کر کے انگریزی پر اچھی محنت کرائی جائے ،لیکن اصل نصابی سرگرمیاں ہرگز متاثر نہ ہوں، طالب علم کی منزل نہ بدلے، یقیناً عصری لب ولہجہ حاصل ہوجاتا ہے، زمانے کی اصطلاحات سے واقفیت ہوجاتی ہے، اہل زمانے سے تبادلہ خیال میں زیادہ دشواری نہیں پیش آتی ہے، اگر فراغت کے بعد چاہےتو دارالعلوم دیوبند میں قائم ''کلیہ اللغۃ الانجلیزیۃ'' کی طرح ادارہ میں داخلہ لے کر زبان وبیان، تحریری وتصنیف کا کام آگے بڑھایا جاسکتا ہے، تلاش ہوتو علماء کرام کے قدرداں انگریزی زبان کے معلمین مل سکتے ہیں، مالیہ فراہم ہوسکتا ہے، نہ یہ مقصد ہے کہ ڈگریوں کا بوجھ نظام کو بے روح کردے، نہ یہ پسندیدہ ہے کہ اب بھی انگریزی سکھانے کے ضروری معتدل نظام کو بھی رواج نہ دیا جائے۔

اس وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ انگریزی کو بھی شامل نصاب کیا جائے، ہمارے اکابر نے انگریزی کو شجر ممنوعہ نہیں کہا، زبانیں کسی کی میراث نہیں ہوتی، وقت اور حالات کے تحت ان کو اپنایا جاسکتا ہیں، نبی کریم ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ یہودیوں کی زبان عبرانی سیکھیں۔(۱)

''آزادی کے بعد'' اور ''آزادی سے پہلے'': کے ہندوستان کا معاملہ یکساں نہیں

(۱) ترمذی، حدیث:۲۷۱۵

ہے، آزادی سے پہلے اس ملک میں مسلمان ''حکمراں اور مقتدر کی حیثیت سے رہ رہے تھے، اس وقت کی زبان، علم وہنر کی زبان اور تعلیم کی زبان تھی، مگر اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، اب برادران وطن کی تہذیب ان کا کلچر اور ان کی زبان ہی کو ''مقتدی'' کی حیثیت حاصل ہے، اس ملک میں انہی کی غیر معمولی اکثریت ہے، اور ہماری زبان کو یہاں کے ''سیاسی حالات'' نے ''پرائی زبان'' بنادیا ہے، اس کے علاوہ آج سے چند صدی پہلے بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی ساکھ قائم تھی،، ان کی زبان علم وتحقیق کی زبان، ترقی یافتہ صنعت وٹکنالوجی کی زبان اور اربابِ فکر ونظر کی زبان تھی، اس لئے اس کو اپنوں کے علاوہ بیگانے اور دوستوں کے علاوہ دشمن بھی سیکھا کرتے تھے؛ مگر اب معاملہ اس کے برعکس ہے ن یج کی دنیا میں بین الاقوامی سطح پر صنعتی اور علمی زبان انگریزی ہے اور جغرافیائی اعتبار سے ہمارے لئے اس کے بعد؛ بلکہ بعض حیثیت سے اس سے زیادہ اہم ''ہندی زبان'' ہے، اس زبان میں پوری منصوبہ بندی سے اسلامی سرمایہ کو ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علماء چونکہ ان زبانوں سے نا آشنا ہیں، اس لئے ان کو ان زبانوں میں پھیلائی جانے والی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی اور نئی نسل (جس نے اقتصادی اور صنعتی تقاضوں کے پیشِ نظر انہیں زبانوں کو پڑھا ہے) یا دوسری قومیں جب اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں تو اسی زبان کے لٹریچر پڑھتی ہیں، جو اکثر مستشرقین اور اسلام دشمن مصنفین کی ہوتی ہیں، اور اسلام کی طرف سے ان کے دل میں نفرت کے تخم پڑ جاتے ہیں، اسی طرح بہت سے دکھے ہوئے بے چین اور مضطرب ''دل ودماغ'' جو حق کی تلاش میں ''قبول حق'' کا جذبہ لے کر اسلام کی طرف بڑھتے ہیں، بدگمانی اور نفرت کے احساسات کے ساتھ واپس ہوجاتے ہیں، ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ اس میں بڑی حد تک ہماری غفلت کو دخل ہے، جدید چیلنج کے مقابلے کے لئے نا گزیر ہے کہ کم از کم ان دو زبانوں پر اسلامی درسگاہوں سے نکلنے والے طلباء ایسی نظر رکھتے ہوں کہ بے تکلف اسلام کے ناقدین کو

پڑھ سکیں، اور جدید حلقہ میں داعیانہ کردار ادا کریں، ''فارسی'' اسلام کی الہامی زبان نہیں ہے، مگر ہمارے اسلام نے دعوتی نقطہ نظر کی اساس پر ایسی مہارت حاصل کی کہ آج ''فارسی'' کو مسلمانوں سے علاحدہ کر کے سوچا بھی نہیں جا سکتا، اسلام نام ''زبان'' کا نہیں ہے ''پیغام'' کا ہے، اس پیغام کو عام کرنے کے لئے ہمیں اپنے سلف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان زبانوں پر ایسی مہارت حاصل کرنی چاہئے کہ ہمارے لئے وہ پرائی زبان محسوس نہ ہو، آخر زید بن ثابت جو چھ زبانوں کے ماہر تھے، ہمارے ہی اسلاف میں سے تو ہیں؟ قرآن کی آیت ''وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ'' (ہم نے رسولوں کو ان کی قومی زبان میں پیغام لے کر بھیجا) کا مفہوم اور تقاضا بھی یہی ہے۔(۱)

اسی حدیث کی بنیاد پر ہمارے اکابر نے کسی زبان کو سیکھنے سے منع نہیں کیا؛ بلکہ انگریزی کے حق میں تو انہوں نے فتوے تک دیئے کیوں کہ ہر حال میں یہ پہلے کے رابطے کی اہم زبان تھی، اور آج بھی اس کی اہمیت بہت ہے، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے کسی سائل کے جواب میں یہ فتوی دیا تھا کہ ''انگریزی لکھنے پڑھنے اور ان کی اصطلاحات اور زبان کے سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں''۔(۲)

اسی طرح ایک فتوی حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلی کا بھی ہے کہ ''فی الواقع نفس تعلیم انگریزی شرعاً ممنوع نہیں ہے، آنحضرت ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو زبان یہود سیکھنے کا حکم دیا تھا، جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہے، ملا علی قاری کی شرح مشکاۃ میں ہے کہ شریعت میں کسی زبان کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو ایسی کوئی بات دلیل سے معلوم نہیں ہوتی ،خواہ لغت سریانی ہو، یا عبرانی ہو یا ترکی یا فرانسیسی ہو'' (۳)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے سوانح نگار حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے

(۱) دینی مدارس اور عصری تقاضے: ۴۲

(۲) ضمیمہ فتاوی شاہ عبد العزیز: ۱۹۵

(۳) مجموع فتاوی عبد الحیؒ ۱/ ۸۰۰

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ’’حضرت امام ربانی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفے سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیوی نفع کی امید تو ہے‘‘۔

بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کو انگریزی نہ سیکھنے کا اس وقت بڑا املال ہوا جب آخری سفر حج میں ایک انگریز سے ان کی ملاقات ہوئی، اور اس انگریز سے بات کے لئے ترجمان کا سہارا لینا پڑا۔(ہمارے مدارس : مزاج و منہاج: ۲۱۱، دار الکتاب، دیوبند) حضرت نانوتویؒ کے خیالات و افکار سے وہ انگریز اس قدر متأثر ہوا، قریب تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیتا، مگر شاید اسلام اس کے مقدر میں نہیں تھا، یا شاید ترجمانی میں کچھ کمی رہ گئی تھی، بہر حال اس واقعے کا حضرت نانوتویؒ پر اس قدر اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی میں یہ عزم کر لیا کہ میں واپس ہونے کے بعد انگریزی زبان خود سیکھوں گا۔(۱)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ’’اس کے بعد (یعنی دار العلوم دیوبند کے نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو یہ بات ان کے کمال میں زیادہ مؤید ہوگی۔(۲)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی رائے تھی کہ: انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے۔(۳)

یہ فتوی ایسے وقت میں دیا جا رہا ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی، اور علماء اس حکومت کے خلاف برسر پیکار تھے، اس سے بھی پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں محدث کبیر حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ کا فتوی بھی یہی تھا کہ ’’انگریزی پڑھنا جائز ہے‘‘(۴)

---

(۱) سوانح قاسمی: ۲/ ۲۹۹

(۲) تاریخ دار العلوم: ۲/ ۲۰۲

(۳) فتاوی رشیدیہ: ۱/ ۶۴

(۴) تاریخ دار العلوم: ۲/ ۳۰۵

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قیام کے موقع پر فرمایا تھا:

''آپ حضرات میں سے جو محقق اور باخبر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میرے بزرگوں نے کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوم کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوی نہیں دیا''(۱)

مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے اپنے بیٹے جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کی تصنیف ''علوم القرآن'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اصل میں یہ کتاب مجھے لکھنی تھی؛ مگر میں نے دو وجہوں سے یہ کام اپنے بیٹے کے سپرد کیا، ایک تو یہ کہ میں مختلف امراض میں مبتلا ہوں اور روز افزوں ضعف بھی ہے، یورپ کی ان کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا، جن میں انہوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہر آلود تلبیسات سے کام لیا ہے، برخوردار عزیز نے چونکہ انگریزی میں بھی ایم اے، ایل ایل بی اعلی نمبروں میں پاس کیا، انہوں نے ان تلبیسات کی حقیقت کھول کر وقت کی اہم ضرورت پوری کردی۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو انگریزی زبان کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیا ہے۔(۲)

ہندوستان کے علماء اور بالخصوص علمائے دار العلوم کے خلاف یہ الزام شہرت پا گیا ہے کہ انہوں نے انگریزی تعلیم کے خلاف فتوی دے کر مسلمانوں کو انگریری تعلیم سے باز رکھا، جس کی وجہ سے مسلمان دنیوی ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے، یہ الزام صحیح نہیں ہے، علمائے کرام صرف ایسے نصاب تعلیم کے مخالف تھے جو مسلمانوں کو الحاد اور بے دینی کی طرف لے جانے والا ہو، خود علی گڑھ میں خطرہ محسوس کیا جارہا تھا، چنانچہ اس کے سدباب کے لئے وہاں دینیات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا، اور حضرت مولانا محمد قاسم

---

(۱) موج کوثر:۹۰

(۲) دینی وعصری درسگاہیں-تعلیمی مسائل:۱۷۹

نانوتویؒ صاحب کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو طلب کیا گیا تو دیوبند کی جانب سے فوراً اس پیش کش کو قبول کیا گیا، مولانا عبداللہ انصاری تا حیات اس منصب پر فائز رہے، بعد ازاں انکے فرزند مولانا احمد میاں انصاری اس منصب پر مامور کئے گئے، یہ بھی دارالعلوم کے فاضل تھے، ظاہر ہے کہ مخالفت کی صورت میں یہ بات ممکن نہ تھی۔

حضرت مولانا نانوتویؒ نے ان طلباء کی نسبت جو مدارس عربیہ سے فارغ ہو کر سرکاری اسکولوں میں داخل ہونا چاہیں ۱۲۹۰ھ = ۱۸۷۳ء کے جلسہ انعام کی تقریر میں ایسے طلباء کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی ہے:

''اگر طلباء مدرسہ ہذا مدارسِ سرکار میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی''(۱)

بعض لوگوں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں علومِ جدیدہ کو کیوں شامل نہیں رکھا گیا؟ فرماتے ہیں:

''اگر یہ خیال سدراہ ہے کہ یہاں علوم دنیوی کی تعلیم کا چنداں اہتمام نہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہئے جو مرض نہ ہو اس کی دوا کھانی فضول ہے، دیوار کے رخنے کو بند کرنا چاہئے، پھٹن کا بھرنا لازم ہے، جو اینٹ ابھی گری نہیں اس کا فکر بجز نادانی کے کیا ہے، مدارسِ سرکاری اور کس لئے ہیں؟ ان میں علوم دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے؟ یہ مدارس اگر قدر ضرورت سے کم ہوتے تو مضائقہ نہ تھا، مگر سب جانتے ہیں کہ سرکار کی توجہ سے شہر تو شہر گاؤں میں بھی مدارس جاری ہو گئے ہیں، ان کے ہوئے اور مدارس علوم دنیوی کا اہتمام کرنا اور علوم دینی سے غفلت کار عقل و دور اندیشی نہیں''(۲)

---

(۱) روداد دارالعلوم: ۱۲۹۰ھ ص: ۱۶

(۲) روداد ۱۲۹۲ھ ص: ۱۳

درحقیقت ہمارے اسلاف نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو اپنانے میں اس وقت بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کیا اور نہ اس وقت جس وقت نصف دنیا پر اپنی عظمت واقتدار کا پرچم لہرارہے تھے، مسلمانوں نے ماضی میں نہ صرف ارسطو وافلاطون اور دوسرے یونانی حکماء کے فلسفے کو اپنا لیا تھا؛ بلکہ بقراط اور جالینوس کے طبی ذخیروں کے مالک بھی بن گئے تھے، اقلیدس اور بطلیموس کی تحقیقات ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا، ہندوستان کی ریاضی بھی عربی سانچے میں ڈھل گئی تھی، اسی طرح عربی زبان میں ایک نئے ادب، تاریخ، فلسفہ وحکمت، طب، ریاضی، ہیئت، نجوم اور کیمیاء اور طبعیات وغیرہ فنون کی بنیادیں پڑیں، جو آج تہذیب وتمدن کا مایہ ناز سرمایہ ہے، ان علوم کو مسلمانوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ آج اجنبی محسوس ہونے کے بجائے اسلامی علوم ہوتے ہیں، علوم وفنون کے حاصل کرنے میں مسلمان ہمیشہ فراخ حوصلہ رہے ہیں، تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مسلمانوں نے یونان اور ہندوستان کے علوم وفنون کو نہ صرف سیکھا ہے؛ بلکہ انہیں ترقی بھی دی ہے۔

علماء کی نسبت یہ ایک شدید غلط فہمی ہے، انگریزی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا؛ بلکہ وہ تہذیب وکلچر جس کو نگریزی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ترقی کا واحد ذریعہ تصور کیا گیا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا، مناسب ہوگا کہ یہاں اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں جب کہ سرسید احمد خان مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، فقہ حنفی کے قدیم مرکز فرنگی محل لکھنؤ کے یگانہ روزگار عالم مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتوی دیا تھا:

> ''لغت انگریز کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بلحاظ تشبہ کے ہوتو ممنوع ہے، اور اگر اس لئے کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہوسکیں تو کچھ مضائقہ نہیں، مشکاۃ شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لئے حکم فرمایا

تھا اور انہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں سیکھ لیا‘‘ (۱)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے فتاوی میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفتاء کے جواب میں تحریر ہے کہ:

’’انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے‘‘۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ کا فتوی بھی یہی تھا کہ ’’انگریزی پڑھنا جائز ہے، غرض کہ علماء کرام نے کسی زمانے میں بھی نفس تعلیم انگریزی سے کبھی اختلاف نہیں کیا س؛ بلکہ حصول معاش اور علم وآگاہی کے لئے صراحتا اس کے جواز کا فتوی دیا جیسا کہ خود عہد نبوت میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی مثال سے صاف واضح ہے، البتہ جس صورت میں مختلف اسباب سے متعلم کے اعتقاد وایمان پر اس کا اثر پڑتا ہو اور غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق اور خلاف اسلام معتقدات کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتا ہو، صرف اس کو ناجائز بتلایا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔

جدید تعلیم سے مسلمانوں کے اجتناب میں کچھ تو انگریزی سیاست کے قصد وارادے کو دخل رہا ہے ؛ تاکہ مسلمان حکمرانی کے قابل نہ رہ سکیں، دوسرے خود مسلمانوں نے بھی اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے اسکولوں میں داخل کرنے میں پس وپیش سے کام لیا ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لئے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے میں مانع ہوئے، چنانچہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامیوں نے سرد کر دیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کر دی گئی، ادھر اسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، رفتہ رفتہ قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے خلاف نفرت کم ہوتی گئی اور مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے۔

(۱) مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحیؒ، باب العلم والعلماء: ۲۰/۳

یہ ہے وہ الزام کی حقیقت جس نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے دور رکھا، درحقیقت انگریزی تعلیم سے نفرت مسلمانوں کی قومی غیرت اور نفسیاتی رد عمل کا نتیجہ تھی، اور علماء بھی ان میں ہی شامل تھے، مگر اس کے باوجود علماء نے وقت کے تقاضے کو پہچانا اور پوری بصیرت اور دور اندیشی کے ساتھ انگریزی تعلیم کے جواز کا فتوی دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔(۱)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے سفر حج میں انگریز کپتان سے ملاقات اور اس کے سامنے اسلام کے محاسن بیان کرنے میں انگریزی ترجمانی کی مدد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''اس واقعہ کا مولانا پر اس قدر اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم کر لیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان سیکھوں گا، کیوں کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ جتنا اثر کپتان سے براہِ راست گفتگو کرنے پر پڑ سکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی تھی۔

آگے فرماتے ہیں:

''یہ صورت پیش آجاتی تو دار العلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقینا کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جا رہا ہے، ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے نقطہ نظر کو تو آپ سن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سر برآوردہ ہستی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامتؒ کی ہے، النور میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہو رہے ہیں، ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حضرت والاؒ کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے کہ:

''ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں، میر زاہد اور امور عامہ

(۱) تاریخ دار العلوم: ۲/ ۳۰۹

کے مطالعہ میں بھی ویسا اجر سمجھتے ہیں''

خیال کرنے کی بات ہے کہ کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امور عامہ میر زاہد کی، لیکن حکیم الامتؒ کا خیال یہی ہے،، اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: '' کیوں کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے، اور اس کا بھی، یعنی وہ ''إنما الأعمال بالنیات'' والی بات ہے، جامع ملفوظ اس ملفوظ کو درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ '' یہ بات بڑی قوت سے فرمائی''

کیا دیو بند کے جن اکابر کا یہ نقطہ نظر ہو، اگر بجائے امور عامہ اور صدر شمس بازغہ کے تمرینی اغراض کے لئے جدید علوم وفنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے اختیار کیا جائے ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعث اجر نہ ہوگا، جیسے بخاری کا پڑھنا باعث ثواب واجر ہے، بلکہ اس زمانہ میں علوم جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چونکہ اسلام کی خدمت کا موقع اور امور عامہ کے پڑھنے سے زیادہ مل سکتا ہے، اس لئے یقیناً اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا''۔(۱)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب انگریزی اور عصری تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

''ہم سے پہلے مسلمانوں نے وقت کی ضرورت سمجھ کر قدیم فلسفہ اور منطق وریاضی وغیرہ اور فارسی زبان کو اپنایا، اس کا تجربہ یہ ہوا کہ اس زبان اور فنون نے مسلمانوں کے عقائد، اعمال اخلاق، معاشرت پر کوئی غلط اثر نہیں ڈالا؛ بلکہ ان میں جو غلط اور مضر اثرات تھے، ان کی بھی اصلاح ہوتی چلی گئی، فارسی زبان عربی کے بعد دوسری اسلامی زبان بن گئی، یونانی فلسفہ

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ۲/ ۴۰=۱۴۱، ندوۃ المصنفین دہلی

اور منطق ریاضی وغیرہ اسلامی علوم کا ضمیمہ بن گئے، مگر انگریزی زبان اور اس کے ذریعہ آئے ہوئے علوم وفنون کا معاملہ اس کے بالکل مختلف نظر آیا، وقت کی ضرورت دیکھ کر ملک کے کئی اداروں نے قدیم علوم اسلامیہ کے ساتھ انگریزی اور علوم عصریہ کا امتزاج کیا، مگر کہیں تو یہ کام چلا ہی نہیں اور کسی جگہ چلا تو اس طرح چلا کہ وہاں کے طلبہ میں علوم عصریہ اور انگریزی اور علوم عصریہ کا امتزاج کیا، مگر کہیں تو یہ کام چلا ہی نہیں اور کسی جگہ چلا تو اس طرح چلا کہ وہاں کے طلبہ میں علوم عصریہ اور انگریزی زبان سے تو کچھ واقفیت ہوگئی لیکن اسلامی علوم میں مہارت کا فقدان ہی محسوس ہوتا رہا، اس کے علاوہ ان طلباء کے عقائد، اعمال ومعاشرت پر بھی مغربیت غالب آ گئی، جس نے اسلامی تعلیم کا مقصد ہی فوت کر دیا، اس طرح کے تجربات دیکھ کر بہت سے محتاط حضرات نے انگریزی زبان اور اس کے فنون کو ترک کر دینے ہی کو ''سلامت بر کنار است'' قرار دے دیا، لیکن ضرورت اس کی تھی کہ حالات اور معاملات کا تجربہ کر کے دیکھا جاتا کہ قدیم علوم فلسفیہ اور فارسی زبان کیوں ہمارے اعمال واخلاق پر اثر انداز نہیں ہوئی، اور انگریزی زبان اور موجودہ فنون عصریہ کیوں ہمارے عقائد سے لے کر اعمال واخلاق تک سب کو یورپ کا تابع بنا دیتے ہیں، اس کا تجزیہ جو اسباب مضرت کے ثابت ہوتے ان سے اجتناب کیا جاتا اور جو مفید کام ہیں ان کو سرے سے نظر انداز نہ کیا جاتا۔

معمولی غور وفکر سے یہ جو بات سمجھ میں آتی ہے ایک یہ فارسی زبان اور یونانی علوم کو ہم نے اس حال میں لیا، جب کہ دنیا پر غالب حکومت ہماری تھی، ہمارے ذہن دوسروں سے مرعوب ومغلوب نہ تھے، ان تمام چیزوں کو وقت کی ضرورت سمجھ کر لیا اور اپنے عقائد وتعلیمات کا تابع بنا کر رکھا، اصل علوم دینیہ پر برتری اور تفوق کا وسوسہ بھی کسے نہ تھا۔

دوسرے یہ کہ تعلیم دینے والے ان فنون کے بھی وہی حضرات تھے جو علوم کتاب وسنت کے ماہر عقائد میں پختہ، تقوی وطہارت، عبادت وزہادت سے آراستہ تھے، ان کی صحبت اور تعلیم نے طلباء کو ان عجمی اثرات سے محفوظ رکھا جو ہر فن اور ہر زبان کے ساتھ طبعی طور پر آیا کرتے تھے، اس کے برعکس ہم نے انگریزی زبان اور اس میں آئے ہوئے علوم وفنون

کو ایسے زمانہ میں لیا جب کہ دنیا کی حکومت وقیادت انہیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جن کی طرف سے یہ زبان اور فنون آئے تھے، ہم نے اس کو اپنے آقاؤں کی زبان اور ان کا دیا ہوا تحفہ سمجھ کر احساس کمتری کے ساتھ قبول کیا، انگریزی حرف لکھنے پڑھنے اور بولنے میں اپنی عزت اور فخر محسوس کیا، ان فنون کے جاننے کو ہی ایسا سرمایہ سمجھا کہ اپنے علوم فنون سے یکسر غافل وجاہل ہوتے چلے گئے۔

دوسری طرف اس زبان اور فنون کی تعلیم کے اساتذہ بھی ہمیں یورپ ہی سے درآمد کرنے پڑے، اپنے استاذوں کے عقائد، اعمال، اخلاق معاشرت سبھی سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا جو پیش آکر رہا اور جب مسلمانوں میں اپنی بدنصیبی سے اس زبان اور فنون جدیدہ کی ترقی کا وقت آیا تو یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے نہ ان کو اپنے اصلی علوم کتاب وسنت سے کوئی حق واسطہ رہا نہ اسلامی عقائد وعبادات اور اخلاق ومعاشرت سے کوئی تعلق رہا۔

یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے انگریزی زبان اور فنون جدیدہ نے ہمیں اور چاہے کچھ بھی بنا دیا ہو: مگر مسلمان نہیں بننے دیا۔

میری نظر میں اگر دونوں مضر اسباب سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے انگریزی زبان اور عصری علوم وفنون کو پوری کوشش اور توجہ سے حاصل کیا جائے تو وہ پچھلے فلسفہ ومنطق سے زیادہ اسلامی عقائد اور اسلامی علوم کے خادم نظر آئیں گے۔

ضرورت اس کی ہے کہ اصل کو اصل سمجھا جائے اور تابع کو تابع اور تابع کو اس کے اپنے درجہ سے نہ بڑھنے دیا جائے، اس کے حاصل کرنے کو دنیا کی ضرورت سمجھا جائے، سرمایہ فخر وغرور نہ بنایا جائے، نیز علوم کے حاصل کرنے کے لئے اساتذہ ایسے مہیا کئے جائیں جو اپنے عقائد، کردار، معاشرت اور عبادت وخدا ترسی کی رو سے پکے مسلمان اور اسلامی تعلیمات کے معلم ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں، تو پھر نہ انگریزی زبان میں کوئی زہر ہے، نہ فلسفہ جدیدہ اور سائنس جدید میں۔(۱)

---

(۱) مجالس مفتی اعظم: ۵۸۰، دار المعارف کراچی

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان اس وقت عالمی رابطہ کی زبان ہے، یہ زبان نہ صرف غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے ضروری ہے، بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل بھی اردو کی گرفت سے باہر ہوتی جارہی ہے، یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا جارہا ہے اور علمی وفکری جہت سے دین حق پر جو یلغار ہو رہی ہے، وہ زیادہ تر اسی زبان میں ہے، اگر علماء اس زبان کے سمجھنے اور اس میں اپنی مافی الضمیر ادا کرنے کے لائق نہ ہوسکے تو وہ اسلام کی حفاظت واشاعت کا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے، ایک صاحب علم نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے علماء اس صدی میں مقام احترام پر تو فائز ہوئے؛ لیکن مقام قیادت پر فائز نہیں ہوسکے۔

مغربی افکار کا مؤثر دفاع انگریزی

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

(الف) جدید مغربی تعلیم کے اثر سے دنیا میں جتنی گمراہیاں پھیلی ہیں، ان سب کے سرچشمے انگریزی زبان میں ہیں اور جب تک ان گمراہیوں کے اصل متابع سے کما حقہ واقفیت نہ ہو ان کی تردید اور ان پر تنقید وتبصرہ ان لوگوں کے لئے پوری طرح مؤثر نہیں ہوتا جو ان کے براہِ راست مطالعے سے مرعوب ومتاثر ہوئے ہیں۔

یہ تقریباً وہی صورت حال ہے کہ جو عباسی خلافت کے زمانے میں یونانی فلسفے کے رواج عام سے پیدا ہوئی تھی، اس وقت فکری اور عقلی گمراہیوں کا اصل سرچشمہ یونانی منطق اور فلسفہ تھا اور جن لوگوں کے ذہن اس سے مرعوب ومتاثر تھے ان کے شکوک وشبہات کا موثر علاج اسی طرح ہوسکتا تھا کہ علماء اسلام اس منطق اور فلسفے پر عبور حاصل کر کے اسی زبان واسلوب میں اس کی تردید کریں، چنانچہ علماء اسلام نے اس منطق اور فلسفے کو داخل نصاب کیا اس میں اعلی درجے کی مہارت پیدا کی اور پھر وقت کی گمراہیوں کا ایسا مؤثر سدباب کیا کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی موت آپ مرگئیں۔

اس وقت دینی علوم کے نصاب میں منطق اور فلسفے کو اس لئے داخل نہیں کیا گیا تھا کہ

علماء اسے ذریعہ معاش یا اپنا مستقل مشغلہ بنائیں گے؛ بلکہ اس کا مقصد وقت کی اہم دینی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔

بعینہ اسی طرح آج مغرب سے اٹھنے والے نظریات اور ان کی گمراہیوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور عالم اسلام کا بھی وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو معاشرے کی ایک موثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے، انہی نظریات سے متاثر اور بڑی حد تک ان کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، ان نظریات کی تردیدی میں اب تک جو کام ہوا ہے وہ ان لوگوں کے ایمان ویقین کے تحفظ کے لئے تو کسی درجہ میں کارآمد ہے، جن پر دین کی گرفت پہلے ہی سے مضبوط ہے، لیکن جو لوگ ان نظریات سے ایسے متأثر ہوئے ہیں کہ ان پر دین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے ان کو واپس لانے کے لئے کافی نہیں، ایسے لوگوں کے لئے اسی طرز پر کام کرنے کی ضرورت ہے، جس طرز پر یونانی نظریات کی یلغار کے مقابلے میں متکلمین اسلام نے انجام دیا تھا، یہ کام علماء امت کے ذمے ایک قرض ہے جس ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوگی مغربی گمراہیوں کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا جائے گا۔

تجدد پسندوں کی تحریریں

(ب) چونکہ ان مغربی نظریات پر مؤثر اور بھرپور تنقید کے لئے ان کے اصل مآخذ تک رسائی ضروری ہے اس لئے اب تک یہ کام ان لوگوں نے انجام دیا ہے جو ان مآخذ تک رسائی تو رکھتے تھے؛ لیکن انہوں نے دینی تعلیم باقاعدہ متوارث طور پر اساتذہ سے نہیں پڑھے تھے، اس کے بجائے ان کی دینی معلومات متفرق مطالعے پر مبنی تھیں، جن سے ظاہر ہے کہ علم کا رسوخ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے ان لوگوں نے ان مغربی نظریات کے مقابلے میں دین کی جو تشریح وتعبیر کی وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی تھی، اور اس سے مغربی گمراہیوں کا صحیح علاج ہونے کے بجائے الٹی کچھ نئی گمراہیوں، نئے فتنے اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جن سے خود مسلمانوں کے درمیان افتراق وانتشار کا دروازہ کھل گیا، ان نئی غلط فہمیوں کا مؤثر سد باب صرف

سلبی انداز میں نہیں ہوسکتا؛ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ دین میں رسوخ رکھنے والے علماء بذاتِ خود ایجابی طور پر وہ کام کریں جس کی غلط انجام دہی نے ان نئی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

(ج) مغرب کے مستشرقین نے عربی اور اسلامی علوم پر ''تحقیق'' کے نام سے ایسے زہریلے لٹریچر کا ایک انبار تیار کیا ہے جس کا مقصد دین کے بنیادی مسلمات کو مشکوک بنانا ہے، یہ لٹریچر جدید ذہن کی نفسیات کے مطابق اور اس اسلوب میں تیار کیا گیا ہے جو آج کے ذہن کی اپیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور عالم اسلام کا کوئی خطہ اس کے زہریلے اثرات سے خالی نہیں، اس زہر کا تریاق فراہم کرنا بھی علماء ہی کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے انگریزی زبان اور ان عصری علوم کی تحصیل لازمی ہے جن کو اس کارروائی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

(د) اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور مشرق بعید کے ممالک میں آباد ہے، ان لوگوں اور بالخصوص ان کی نئی نسلوں کو اسلام پہنچانے کا کوئی راستہ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں، ان خطوں کے مسلمانوں کو اب نئی نسلوں کے دین کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہے اور وہ اس غرض کے لئے کافی جدوجہد کے بعد مساجد اور دینی مراکز تعمیر کر رہے ہیں، ان مساجد اور مراکز میں ایسے علماء کی ضرورت روز افزوں ہے جو علوم دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی جانتے ہوں؛ تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کرسکیں، راقم الحروف کو ایسے متعدد ممالک میں جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے اور یہاں رہتے ہوئے بھی کوئی مہینہ خالی گزرتا ہو جس میں وہاں سے انگریزی جاننے والے علماء کی طلب نہ آتی ہو۔

چونکہ ایسے صحیح الفکر اور راسخ علماء کی تعداد ہمارے درمیان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے جو انگریزی جانتے ہوں اس لئے ان تمام مقامات پر وہ لوگ پہنچ رہے ہیں جو

انگریزی تو بیشک جانتے ہیں؛ لیکن یا تو ان کی دینی معلومات سطحی اور سرسری نوعیت کی ہیں، یا ان کے نظریات "ما أنا علیہ وأصحابی" کے مطابق نہیں ہیں۔

یورپ میں تحفظ دین کے لئے انگریزی لٹریچر

(ہ) مذکورہ ممالک کے مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کے لئے انگریزی زبان میں بڑے وسیع دینی لٹریچر کی ضرورت ہے؛ لیکن حال یہ ہے کہ انگریزی میں قرآن کریم کی کوئی ایک تفسیر بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کے بارے میں آنکھ بند کر کے لوگوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا جا سکے، اب اس وقت الحمد للہ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے اس تفسیر کی ضرورت کو بزبان انگریزی پورا کر دیا ہے، اسی طرح روزمرہ کے دینی اور فقہی مسائل پر مشتمل کوئی ایسی مستند کتاب اب تک تالیف نہیں ہوئی جو ان لوگوں کو دین کی تعلیمات سے ٹھیک روشناس کرا سکے، اس وقت یا تو چند گنی چنی اردو کتابوں کے تراجم ہیں جن کی صحت کی بھی کوئی ضمانت نہیں یا پھر اہل باطل کا فراہم کیا ہوا لٹریچر ہے جسے لوگ چار و ناچار پڑھنے پر مجبور ہیں، ان مسلمانوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرانا اور ان کے دین و ایمان کی حفاظت علماء کے فرائض میں داخل ہے، جو انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

(و) موجودہ صنعتی دور نے تجارت و معیشت کے شعبے میں ایسے پیچیدہ معاملات کو رواج دیا ہے کہ اب ایک مسلمان تاجر کو قدم قدم پر معاملات کی نئی نئی صورتیں پیش آتی ہیں، ان صورتوں کا صریح شرعی حکم فقہ کی مروجہ کتب میں اس لئے نہیں مل سکتا کہ یہ صورتیں عصر جدید ہی کی پیداوار ہیں اور ان کا تصور پہلے نہیں ہو سکتا تھا، ان صورتوں کو سمجھ کر ان کا صحیح فقہی حکم بتانا علماء ہی کا کام ہے اور یہ کام اسی وقت ٹھیک انجام پا سکتا ہے جب علماء ان صورتوں کو ان کی تمام تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ سمجھیں اور اس کے بعد فقہی اصولوں کے مطابق ان کا حکم بتائیں، اب تک یہ ہوتا

ہے کہ صورت مسئلہ بیان کرنے کی ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے، اس لئے وہ جیسا سوال لکھ لاتا ہے اسی کے مطابق جواب چلا جاتا ہے؛ لیکن مستفتی چوں کہ عالم نہیں ہوتا اس لئے وہ بسا اوقات اپنی لاعلمی کی بناء پر صورت مسئولہ کے وہ اہم اجزاء جن پر جواب کا دارومدار ہوتا ہے، بیان نہیں کر پاتا، اس لئے جواب مختلف ہوجاتا ہے اور یہ بھی صرف ان معاملات میں ہوتا ہے جن کے بارے میں تاجر کے دل میں کوئی شبہ اور اس کی بنیاد پر استفتاء کا قوی داعیہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ اب اکثریت ان افراد کی ہے جن کو کوئی شبہ پیدا ہوتا یا استفتاء کا تقاضہ پیش نہیں آتا۔

لہٰذا جس طرح حضرت امام محمدؒ بازاروں میں گھوم گھوم کر تاجروں کے معاملات کو پہلے سے ازخود سمجھنے کا اہتمام فرماتے تھے؛ تاکہ ان تمام معاملات کا شرعی حکم مدون کرا سکیں اور استفتاء کے موقع پر مستفتی کی تشریح کے محتاج نہ ہوں، موجودہ دور کے اہل علم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ اہل عصر کے معاملات کو اچھی طرح سمجھیں اس کے بعد حسب ضرورت تصنیف وتالیف اور فتوی کے ذریعہ ان معاملات کا شرعی حکم امت پر واضح کریں؛ اس غرض کے لئے معاشیات کا اتنا علم جس سے اہل عصر کے معاملات اور ان کے تجارتی مسائل کا علی وجہ البصیرۃ علم ہوسکے ایک عالم دین کے لئے ضروری ہوگیا ہے۔

(ح) اس وقت عالم اسلام میں رفتہ رفتہ یہ شعور جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہم نے جدید عصری علوم کو مغربی قالب کے ساتھ جوں کا توں اپنا کر کس قدر سنگین اجتماعی غلطی کی ہے، چنانچہ اب یہ آوازیں تقریباً ہر اسلامی ملک میں اٹھ رہی ہیں کہ ان علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ کر اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانا چاہئے اور ان کی علومی نصابی اور تحقیقی کتابوں میں اسلامی تعلیمات علماء اسلام کے افکار اور ان خدمات کو اس طرح سمونا چاہئے کہ اس سے مغربی افکار کی بالادستی ختم ہوجائے، اس غرض کے لئے اب عالم اسلام میں جگہ جگہ مختلف علوم کے تحقیقی مراکز قائم ہورہے ہیں، ان

مراکز میں ایسے رجال کی ضرورت ہے جو دین کا وسیع و عمیق علم رکھنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع سے بھی کما حقہ واقف ہوں اور چوں کہ راسخ الفکر علماء میں ایسے لوگ کمیاب؛ بلکہ نایاب ہیں، اس لئے ان مراکز میں وہ ذہن پہنچ رہا ہے جو دین کی صحیح بصیرت نہیں رکھتا۔

ان مراکز کے اثرات ونتائج جلدی تو ظاہر نہیں ہوں گے؛ لیکن دس بیس سال میں ان کے نتائج پوری طرح منظر عام پر آجائیں گے اور علوم عصریہ کی تمام درسگاہوں میں انہی کی تحقیقات سکہ رائج الوقت بنیں گی، لہٰذا ان مراکز کی صحیح تحقیقی رہنمائی کا فریضہ بھی علماء دین پر عائد ہوتا ہے، جس کے لئے متعلقہ موضوعات کی فی الجملہ واقفیت ناگزیر ہے۔

یہ تمام کام جن کی ضرورت واہمیت سے شاید کوئی دردمند اور سلیم الفکر مسلمان انکار کرسکے، ایک دو یا چند افراد کے بس کے نہیں ہیں اور نہ یہ ساری ضروریات کسی مختصر مدت میں پوری ہوسکتی ہیں، اس لئے ایسے پختہ کار، راسخ الفکر اور ذی استعداد علماء کی پوری کھیپ درکار ہے، جو اپنی اپنی طبعی مناسبت کے لحاظ سے اپنے لئے کام کے مختلف دائرے تجویز کرے اور ان دائروں میں شب وروز محنت کرکے یہ قرضہ چکائے، مگر اس سارے کام کی بنیاد دینی مدارس ہی میں فراہم کرنی ہوگی۔

درس نظامی کی اصل روح متاثر نہ ہو

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ دینی مدارس میں ان مضامین کی تدریس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان تمام مضامین کے متخصصین پیدا کرنے مقصود ہیں اور نہ یہ تاثر درست ہے کہ ان مضامین کی تدریس کے لئے کوئی بہت زیادہ وقت صرف کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ بفضلہٖ تعالیٰ درس نظامی کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس نصاب کو قرار واقعی طور پر پڑھ لے اس کا مثبت اور علمی وفکری باتوں کے لئے پوری طرح تیار ہوجاتا ہے اور وہ ایسی باتوں کا ادراک بہت جلد کرلیتا ہے جسے سمجھنے میں دوسرے لوگوں کو کافی دیر لگتی ہے، اس لئے اگر دینی مدارس کے طالب علم کو انگریزی زبان کے ساتھ مذکورہ بالا چند مضامین کی بنیادی

واقفیت حاصل ہوجائے تو وہ ضرورت کے وقت ان شاء اللہ اس بنیاد پر عمارت خود کھڑی کر سکے گا؛ اس لئے ان مضامین کی تدریس کے لئے بہت زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں علماء کی خدمات اور ان کی کوششوں کو مؤثر بنانے اور ان کا دائرہ اثر بڑھانے کے لئے مذکورہ بالا اقدامات نہایت ضروری ہیں۔(۱)

انگریزی زبان

آج انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم وفنون کے بارے میں ہم سے کچھ تاخیر ہوگئی ہے، اس تاخیر کی وجہ سے کچھ انگریزی خواں مسلمانوں میں مخدوم بننا چاہتے ہیں، یا بنے ہوئے ہیں، تو یہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہے، ان شاء اللہ انگریزی زبان اور جدید کمپیوٹر، یہ سائنس اور یہ ٹیکنالوجی سب کی سب اسلام کی خادم بنیں گی؛ مگر اس کے لئے عزم وارادے کی ضرورت ہے۔

اگر امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ اپنے دور کے معاشی طور طریقے سمجھیں اور اس کو دینی تقاضا سمجھ کر روزانہ بازار میں چند گھنٹے گزاریں اور یہ دیکھیں کہ کاروبار کیسے ہوتا ہے تو کیا عہد حاضر کے متخصصین اور فقہاء اور امام محمدؒ کے متبعین اور تلامذہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ آج کل کے بازاروں کے اس کردار اور کاروباری امور سے واقف ہوں کہ ان بازاروں میں کیا ہورہا ہے؟ اس کے لئے معاشیات کی تعلیم اور جدید بینکاری کے اصولوں کی تعلیم ضروری ہے، یہ سب فنون بدقسمتی سے انگریزی میں ہیں، اس لئے انگریزی سیکھنا ضروری ہے، اگر امام غزالیؒ اپنے دور میں منطق کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

"من لم یعرف المنطق فلا ثقة له فی العلوم أصلا"

جس آدمی نے منطق نہیں سیکھی، اس کا علم میں کوئی مقام نہیں۔

اس لئے اس دور میں اہمیت منطق کی تھی، اسی طرح آج کے دور میں اگر کچھ

---

(۱) درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں: ۶۰، حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، ہمارا تعلیمی نظام: ۹۹-۱۰۳

دوسرے علوم وفنون، انگریزی زبان، معاشیات، ریاضی، کمپیوٹر کو اہمیت حاصل ہوگئی تو علمائے کرام کو آگے بڑھ کر امام غزالیؒ کی طرح اس کا ادراک کرنا چاہیئے۔

علماء اسلام اور دیگر زبانیں

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت: ۲) میں علماء واسلاف واکابر کے سلسلہ میں دیگر زبانوں سے دلچسپی کے جو واقعات قلمبند فرمائے ہیں، ان پر آپ ایک نظر ڈالیں، اس سے دو فائدے ہوں گے، ایک تو اس دور کے علماء وفضلاء کو عربی، اردو اور فارسی کے ساتھ دیگر زبانوں کے حصول کا شوق پیدا ہوگا، اور دوسرے بعض گوشوں اور حلقوں میں اس تعلق سے جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کا ازالہ ہوگا۔۔۔۔۔۔۔اقتباس قدرے طویل ضرور ہے، لیکن نہایت معلومات افزا اور دل اور دماغ دونوں کو متوجہ کرتا ہے، مولانا گیلانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''پڑھنے پڑھانے کے بعد کسی جدید زبان یا علم کے سیکھنے کی ضرورت اگر کسی بڑے عالم کو پیش آگئی ہے تو پیرانہ سالی بھی اس ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں پیدا کرسکتی، مولانا عنایت اللہ رسول چڑیا کوٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، تذکرہ علماء ہند میں ہے:

''بشوق آموختن زبان عبرانی بہ کلکتہ رفتہ در آنجا سالے چند پابند اقامت گشتہ از احبار (ہاخام) زبانِ عبرانی بجمیع الوجوہ آموخت'' عبرانی زبان سیکھنے کے شوق میں کلکتہ تشریف لے گئے، اور کئی سال رہ کر علماء یہود سے عبرانی زبان سیکھی اور اچھی استعداد پیدا کی۔

حبرو (عبرانی) زبان میں جو مولانا کو دست گاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب ''بشریٰ'' اور اس رسالہ سے ہوسکتا ہے جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہما السلام کے متعلق آپنے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سرسید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب ''خطبات احمدیہ'' کا جزو بنا کر اسے شائع کیا ہے۔

علامہ تفضّل حسین خان یہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے تحصیل علوم رسمیہ

کے بعد:

''انگریزی ورومی آں رالاطینی نیز گویند، یونانی رانیکو گفتے وخواندے ونوشتے''(۱) انگریزی اور رومی زبان سیکھی جسے لاطینی بھی کہتے ہیں ، یونانی خوب اچھی بولتے، پڑھتے اور لکھتے۔

چریاکوٹ ہی کے ایک اور بزرگ قاضی غلام مخدوم چریاکوٹی صاحب ہیں، صاحبِ تذکرہ علماء ہند نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''بعد تکمیل علوم متداولہ شوق تعلم زبان سنسکرت پدید آمد تا اینکہ در تحصیل زبان مذکور خطے وافی برگرفت و بمقام بنارس کہ معدن مہرہ زبان مرقوم است میانِ ماہرانِ این فن امتیازے کافی یافت'' (ص: ۱۵۷) علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد سنسکرت کا شوق پیدا ہوا اوراچھی مہارت پیدا کی، بنارس جواس زبان کے لئے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، یہاں ماہرانِ سنسکرت میں امتیازی مقام حاصل کیا۔

مولوی نصرت علی خان دہلوی تخلص قیصر کے متعلق بھی اسی کتاب میں ہے:

''علومِ رسمی باستعداد حاصل نمود ماہر زبان فارسی وعربی وترکی وانگریزی وہندی است'' (۲۳۷) مروجہ علوم میں استعداد بہم پہنچائی ، چنانچہ فارسی،عربی،ترکی ، انگریزی اورہندی پانچ زبانوں کے ماہر ہیں۔

ان ہی مولوی نصرت علی کے والد ماجد مولوی ناصر الدین جوعیسائیوں کے ساتھ اپنے زمانہ میں چوں کہ سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے،اس لئے لوگوں میں ''امام فن مناظرہ'' کے لقب سے مشہور ہوئے،کنیت ابوالمنصور تھی، ان کے متعلق بھی لکھا ہے:

''اکتساب علوم از والد ماجد وجد امجد خواندہ نمودہ'' اپنے والد ماجد اور دادا بزرگوار سے علم حاصل کیا۔

جب عیسائیوں سے مناظرہ کی مہم سامنے آئی تو:

(۱)　نجوم السماء: ۳۲۴

''توارات وانجیل بالتفسیر عبرانی ویونانی از علماء اہل کتاب خواندہ''
(۲۳۲) توریت وانجیل یونانی اور عبرانی تفسیر کے ساتھ علماء اہل کتاب سے پڑھیں''۔

مولوی نجف علی جھجر کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خان کے دربار کے مولوی تھے، لکھا ہے کہ '' پنج رسائل بالسنۃ خمسہ کہ دری وپازندی وعربی وفارسی وارد وعبارت آزآنست'' (تذکرہ علماء ہند: ۲۳۲: ۶۳۲) جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی، اردو کے سوا دری اور پازندی زبانوں کو بھی انہوں نے تحصیل علم کے بعد کسی پارسی عالم سے سیکھا، حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ:

''شرح مقامات حریری بہ زبان عربی بہ صنعت اہمال تصنیف کرد'' مقامات حریری کی شرح عربی میں اس طرح کی کہ کہیں نقطہ والا حرف نہیں لائے''۔

مختلف زبانوں کے سیکھنے کا مسلمانوں میں جو مذاق تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ، حافظ ابن حجر نے ''دُررِ کامنہ'' میں آٹھویں صدی کے ایک بغدادی عالم زین الدین العابر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ تاتاری نومسلم بادشاہ غازان خان، جب آپ کے مدرسہ میں آیا اور آپ سے ملا تو ''بالغ فی الدعاء'' یعنی اس مسلم بادشاہ کو شیخ نے بہت سی دعائیں دیں، یہ دعائیں کن کن زبانوں میں کی گئیں؟ حافظ لکھتے ہیں: ''بالغلی، ثم بالترکی، ثم بالفارسی، ثم بالرومی ثم بالعربی'' جس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ زبانوں پر ان کو قدرت تھی ہفت زبان کا لفظ مسلمانوں میں مروج بھی تھا۔(۱)

قریبی زمانے میں اس حیرت انگیز نمونہ خود مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے شاگرد ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادیؒ تھے جنہیں کم از کم بلا مبالغہ دس زبانوں میں مہارت تھی، کئی زبانوں میں کتابیں اور محاضرات دیتے رہے، ان کے لئے عربی اور یورپ کے مطبوعات ومخطوطات تک رسائی اسی لئے آسان ہوچکی تھی، سب جانتے ہیں کہ دنیا عالمی گاؤں کی صورت اختیار

(۱) مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت: ۲۲/۳۰

کرچکی ہے، روس، چین اور شمالی امریکہ جنوبی امریکہ کے علاوہ افریقی ممالک میں کام کرنے والے علماء کے لئے وہاں کی زبان جاننا ضروری ہوگا، عیسائی اور قادیانی ہمہ لسانی کام کرنے میں آگے ہیں، اگر زمانۂ طالب علمی سے ہی مختلف طلبہ کو مختلف زبانوں اور ملکوں کے لئے منتخب کرلیا جائے علمی اور عملی بنیادوں کو اسی پر استوار کیا جائے تو عالمی انقلاب میں اس کام کا عظیم کردار ہوسکتا ہے، ضروری ہے کہ اس کام کو نصاب عالمیت یا تخصصات میں حسبِ مشورہ اپنے نظام کا حصہ بنایا جائے۔

دینی تعلیم اور عصری تقاضے

ذیل کے مضمون میں ''دینی تعلیم'' اور ''عصری تقاضے'' کے مفہوم ومصداق، مقاصد واہداف کو مختلف تحریروں کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ''تقاضۂ وقت'' کے بہانے دینی تعلیم پر ظلم نہ ہو، اسی طرح بے جا غیر مطلوب شخصیت پرستی کی دُہائی دے کر آواز وقت اور نوشتۂ دیوار سے چشم پوشی نہ کرلی جائے، دینی تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے سے کیا امکانات پیدا ہوں گے، اندیشے اور خطرات کیا ہو سکتے ہیں؟ خلاصہ یہ ہے کہ اس عنوان کی ضرورت اور حسّاسیّت، مفید اور مضر پہلو کا بیان ہے، واللہ اعلم بالصواب

موجودہ عصری علوم کا تنقیدی مطالعہ

اہل علم اور علماء کرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغربی علوم وفنون کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کریں، ان کے پانچ علوم ایسے ہیں جو اس وقت سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کررہے ہیں، اور جتنا کفر والحاد اس دور میں پھیلا ہے وہ اکثر وبیشتر ان ہی پانچ علوم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

۱۔ علم نفسیات

۲۔ علم بشریات

۳۔ علم عمرانیات

۴۔ علم سیاسیات

۵۔ علم معاشیات

علماء کرام کو ان پانچ علوم وفنون کا مطالعہ کر کے ان میں موجود غلط اساستصورات کی تردید عقلی انداز میں دلائل وشواہد کے ساتھ کرنی چاہئے، جو چیزیں درست ہیں، ان سے ہم کو پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے مہارت حاصل کرنی چاہئے،ہمیں چاہئے کہ ان علوم وفنون کے رائج الوقت اسلوب اور طرز استدلال سے کام لے کر ہم اپنے عقائد وتصورات کو آج کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کریں، تا کہ وہ جدید دنیا کے لئے زیادہ قابل فہم ہوں، کیوں کہ ایک عقلی سانچہ کا فیصلہ کرتے ہیں، اس طرح ان میں عدل وانصاف رکھنے والے لوگ متأثر ہوں گے اور پھر فکری اخذ وعطا کا عمل شروع ہوجائے گا، جو منطقی علوم اور یونانی ذخیرے کے ساتھ مسلمانوں نے اختیار کیا، شروع میں بہت سے مسلمان ان سے متاثر ہوئے، جس طرح آج ہورہے ہیں، آج ان کی کتابیں موجود ہیں، آپ اخوان الصفا کی کتابیں دیکھئے، ان میں بڑی مرعوبیت ہے، ابن رشد بڑے فقیہ تھے، لیکن ان کی کتابوں میں بھی یونانی علوم سے مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے، اس طرح کندی جو فیلسوف العرب اور حکیم العرب کہلاتے ہیں، ان کے ہاں مرعوبیت کے خاصے جراثیم ملتے ہیں، جس طرح مرعوبیت کے جراثیم ہمارے ہاں مغربی علوم وفنون کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہ عارضی اور وقتی چیز تھی، بالآخر معتدل نقطہ نظر رکھنے والے علماء کی کاوشیں رنگ لائیں، اور دیگر دونوں طبقوں (مخالفین اور مویدین) کا زور گھٹتا چلا گیا۔

مثلا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ’’حجۃ اللہ البالغۃ‘‘ جو ساری کی ساری منطق وفلسفے سے لبریز دلائل کی بنیاد پر ہے، اس میں انہوں نے تمام اسلامی تصورات نئے انداز سے مرتب کئے، اسی طرح ’’الموافقات‘‘ (اصول فقہ کی کتاب) دیکھئے، اس کتاب میں امام شاطبی نے شریعت کے اصول منطق سے ثابت کئے ہیں، اس میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جو عقلی بنیاد پر ثابت نہ ہوتی ہو، کوئی آدمی جو اس زمانے کی روایات کے مطابق عقلیات کا علم بردار ہو، وہ اس کی کسی ایک چیز سے بھی انکار نہیں کرسکتا، اسی طرح علامہ کاسانی کی کتاب ’’بدائع الصنائع‘‘ خالص فقہ کی کتاب ہے، لیکن عقلی انداز میں مرتب کی گئی ہے اور پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ فقہ

حنفی ہو، تفسیر ہو، حدیث، کوئی چیز ایسی نہیں جو انسانی عقل اور فہم سے بالاتر ہو؛ بلکہ ہر چیز خالصتاً عقل کی بنیاد پر ہے، اس سے ایمان میں جو اطمینان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ ہم جیسے کم زور ایمان والوں کے لئے ناگزیر ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسا ایمان ہو تو یہی بات کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمادیا؛ لیکن ہر شخص تو ایمان ویقین کے اس درجے پر فائز نہیں ہے، عام آدمی کا حال تو یہ ہے کہ جب تک آپ اس کو اس کے اپنے اصول موضوعہ کے مطابق عقلی دلائل سے قائل نہیں کریں گے وہ قائل نہیں ہوگا۔(۱)

عصری علوم کی شمولیت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ: ''میں یہ چاہتا ہوں کہ مدرسے میں تعزیزاتِ ہند اور ریلوے اور ڈاک کا قانون پڑھایا جائے'' اسی طرح حضرت حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے جو نصاب تیار کیا تھا، اس میں بھی انہوں نے یہ دعوت دی تھی کہ جدید قوانین اور انگریزی زبان یہ دونوں مضامین نصاب میں شامل ہونا چاہئے۔(۲)

مولانا ابو الحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں ہمیں تمام مغربی علوم وفنون؛ بلکہ مغربی تہذیب وتمدن کے تمام عناصر کو خام مال (Raw material) سمجھنا چاہئے، اور اس معاملے میں ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو ہر خام مال کے ساتھ کیا جاتا ہے، نہ تو ہم اس سارے مواد کو جوں کا توں اپنے کام میں لاسکتے ہیں اور نہ محض ناکارہ قرار دے کر پھینک سکتے ہیں، ہمیں اپنی اقدار کی روشنی میں ان سب کو باریک بینی اور دقت نظر سے پرکھنا چاہئے، جو چیزیں حقائق ثابتہ کا درجہ رکھتی ہوں ان کو قبول کرلیں اور جو چیزیں حقائق ثابتہ نہ ہوں اور ہماری اقدار سے متعارض ہوں، ان کو ہم رد کردیں اور باقی ماندہ کی اصلاح کر کے ان سارے علوم کو اپنے مقاصد کیلئے تیار کریں۔

---

(۱) محاضرات تعلیم: ۲۶۸=۲۶۹

(۲) محاضرات تعلیم: ۱۳۸

پھر اس کے علاوہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کی بنیادی اصولوں اور قواعد وضوابط میں کون سی چیزیں عقلا قابل قبول ہیں اور ہمارے فکری، نظریاتی اور اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہیں اور وہ کون سے پہلو ہیں جو عقل کی میزان میں کم زور اور اسلامی نقطہ نظر سے نا قابل قبول ہیں، یہ عمل کم وبیش اسی انداز کا ہوگا، جس انداز کا کام امام غزالیؒ کی کتابوں مقاصد الفلاسفہ اور تہافتہ الفلاسفہ میں نظر آتا ہے، زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو کام امام غزالیؒ نے فلسفہ یونان کو سامنے رکھ کر کیا تھا، وہی کام آج کے علوم وفنون بالخصوص عمرانی اور انسانی علوم کے باب میں کیا جانا ناگزیر ہے، آج بہت سی مقاصدی، (مقاصد الاقتصاد، مقاصد السیاسیین، مقاصد القانونیین وغیرہ) اور شاید اس سے زیادہ تہافتیں (تہافت الاقتصاد، تہافت القانون، تہافت الفنون وغیرہ) لکھنے کی ضرورت ہے۔

علومِ اصلیہ وآلیہ

مسلمانوں نے اپنے دور میں علوم کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

علوم اصلیہ: جن کی اصل ضرورت ہے۔

علوم آلیہ: جن کی ضرورت پہلی قسم کے علوم کو حاصل کرنے کے لئے ہے۔

چنانچہ بلاغت وبیان اور بڑی حد تک علومِ رجال اور علوم روایت، منطق عقلیات وغیرہ وغیرہ، ان کو علوم آلیہ کی حیثیت دی گئی، علوم آلیہ در اصل ان علوم کے خادم تھے جو حقیقت میں حاصل کرنا مقصود تھے۔ مقصود یہ ہے کہ قرآن پاک میں گہری بصیرت حاصل کی جائے، علوم تفسیر، علوم قرآن پر مجتہدانہ نظر رکھنے والے علماء اور مفسرین پیدا کئے جائیں، لیکن چوں کہ اس کے لئے بلاغت سے واقفیت بھی درکار رہے، لغت اور زبان سے واقفیت بھی درکار ہے، اور بہت سے علوم وفنون سے واقفیت درکار رہے، اس لئے طالب علم اور عالمیت کی تیاری کے لئے ان سے واقفیت ناگزیر سمجھی گئی ہے، علم حدیث میں ماہرانہ بصیرت حاصل کرنے کے لئے بہت سے ابتدائی علوم کی ضرورت ہے، جغرافیہ کی بھی ضرورت ہے، تاریخ کی بھی ضرورت ہے اور رجال کی بھی ضرورت ہے، تذکروں اور سوانح کی بھی ضرورت ہے،

یہ فی نفسہ مقصود نہیں تھے، لیکن علمِ حدیث کے حصول کے لئے ان کو حاصل کرنا ناگزیر سمجھا گیا یا دینی علوم سے مراد یا دینی تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے جس کا مقصد ان علوم وفنون کے مخصصین اور متعمقین اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے، اس لئے کہ جب تک ایسے علمائے محققین، متعمقین اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے حضرات موجود نہ ہوں، اس وقت تک امت مسلمہ کی رہنمائی نہیں ہوسکتی۔

دینی تعلیم اور عصری تقاضے

لغت میں مدرسے کا مطلب ہے: تعلیم یا تدریس کی جگہ، یہ ادارہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی سے وجود پذیر ہوگیا تھا، جس نے علم، فکر و دانش اور سائنسی پیش رفت کے معاملے میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے کردار کی نمائندگی کی، مدرسے نے تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیم اور علم کی وحدت کے تصور کو اجاگر کیا، انسانی علم وفکر کی تاریخ میں مدرسے اور اس کے ساتھ وابستہ شخصیات نے وحدت علم کا یہ تصور پیش کیا، جہاں عقل و وحی ایک کل کی حیثیت باہم مربوط ہیں، یہاں روایتی دینی علم جدید ترین انسانی دریافتوں کے ساتھ مشترکہ انسانی یافت کی حیثیت سے ہم آہنگ ہے، اس تصور کے تحت یونانیوں سے متوارث نام ونہاد عقلی علوم کے ساتھ ایسا تعامل کیا گیا کہ آخر کار وہ اسلام کے بنیادی اور سرمدی اصولوں کے خادم بن کر رہ گئے، ابونصر فارابی جسے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں منطق اور مسلم فکر کی تنظیم میں رول ادا کرنے پر مسلمانوں نے معلم ثانی کا لقب دیا ہے، اس جیسے لوگوں نے عموماً سب سے پہلے عقل و وحی کی وحدت اور علم کو ایک کل کی حیثیت سے منضبط طور پر پیش کرنے میں غیر معمولی کاوشیں کی۔

یہ روایت جس کا آغاز فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات کے ہاتھوں نہیں؛ بلکہ اس سے بھی پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور اتباع تابعین کے ہاتھوں ہوا تھا؛ گیارہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے جاری رہی، ان گیارہ سو سالوں میں علم جس کی نمائندگی کی، مسلم علماء نے مدرسے میں کی تھی، نے انسانی فکر اور علم کی ایک عالم گیر متوازی وحدت کی نمائندگی، ماہرین

سائنس، معروف ماہر طبعیات ابن سینا جیسے لوگوں، محدثین، مفسرین، فقہاء، علماء، فلسفی وغیرہ حضرات نے ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم وتربیت پائی، مسلم ہندوستان کی نام ور عبقری شخصیت جن کا تذکرہ علامہ اقبال نے بھی کیا ہے، مدرسے ہی کی دین تھی، اقبالؒ نے شیخ احمد سرہندیؒ کے بارے میں کہا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے عبقری تھے، نواب سعد اللہ خان کئی عشروں پر مشتمل ایک طویل عرصے تک عظیم مسلم مغلیہ سلطنت (جو آج کے افغانستان، پاکستان، کشمیر، انڈیا، نیپال، بنگلہ دیش، برما اور سری لنکا کے بعض حصوں پر مشتمل تھی) کے وزیر اعظم رہے ہیں، استاد احمد معمار جو سات عجائبات عالم میں تاج محل کے معمار ہیں، یہ تینوں شخصیات آپس میں ہم جماعت تھے، اور ایک ہی مدرسہ کے تربیت یافتہ تھے۔

اس مثال سے واضح ہے کہ کس طرح انسانی دریافتوں اور فکری تکمیل کے سلسلے میں وحدت تعلیم کا ظہور ہوا، فن تعمیر، علمی و دینی فکر اور انتظام وانصرام کے شعبہ جات میں ہندوستان کی نہایت بلند پایہ شخصیات مدرسے ہی کی پیداوار تھیں۔

دینی نصاب کو عصرانے کا مطلب

دینی مدارس کا نظام، وہ درس نظامی ہو یا اس کی کوئی مزید بہتر شکل، اس کا بنیادی مقصد دینی علوم کے محققین، مفسرین، محدثین،، فقہاء، مبلغین اور مربی پیدا کرنا ہے، لیکن ہم سب لوگ فردا فردا یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ دینی مدارس کے متخصصین، علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین کو عصر حاضر کو ڈھالنے اور اس کے مطابق ملک کے مختلف اداروں کی تشکیل نو کے لئے بعض جزوی، معنوی تبدیلیوں یا جامع علوم اور مہارتوں کی ضرورت ہے، جس کے بغیر دور جدید میں دینی تعلیم کے تقاضوں پر کما حقہ عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔

سچی بات یہ ہے کہ دور جدید ایک پیچیدہ دور ہے، اس دور کے ارادے، تصورات اور اس دور کے معاملات اتنے پیچیدہ ہیں کہ اس کے لئے بڑی خصوصی مہارتیں درکار ہیں۔

آج ہم پر یہ فرض کفایہ ہے کہ ہم شریعت کے ایسے متخصصین، متعمقین اور ماہرین پیدا کریں جو دینی ماحول، دینی تربیت اور دینی ذوق ومزاج کے ساتھ ساتھ دور جدید کے

معیار کی فنی مہارت رکھتے ہیں؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول مجھے بہت یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ کسی ذمہ داری پر تعین کے لئے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر رہے تھے، مجلس میں موجود بعض لوگوں نے ایک خاص شخص کا نام لیا کہ جی وہ بہت نیک آدمی ہیں، بڑے بزرگ اور تہجد گذار ہیں اور اخیر میں فرمایا کہ وہ اتنے نیک ہیں کہ:

"كأنه لا يعرف الشر"

اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا آدمی نہیں چاہیے جو شر کو نہیں جانتا اس لئے کہ

"إذا يوشك أن يقع فيه"

کہ جو شر کو نہیں جانتا وہ شر میں جلدی مبتلا ہو جائے گا، وہ تو شر کا شکار ہو جائے گا، اس لئے ایسا آدمی درکار ہے جو خیر کو بھی جانتا ہو اور شر کو بھی جانتا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ نے زیادہ متبع سنت اور شریعت کے مزاج شناس ان کے دور میں کوئی نہیں گزرا، ان سے کسی نے مشورہ کیا کہ فلاں جگہ جہاد کا معاملہ درپیش ہے، مختلف علاقوں سے فوجیں اور رضا کار اور مجاہدین کے دستے جا رہے ہیں، ایک فوجی کمانڈر کی سربراہی میں ایک بڑا دستہ تیار ہو رہا ہے، وہ کمانڈر بڑا متقی اور پرہیز گار ہے، بڑا نمازی اور تہجد گذار ہے، لیکن سیاسی عسکری معاملات میں وہ خاص ماہر نہیں ہے، البتہ ایک دوسرا شخص جو زیادہ دین دار اور نیک تو نہیں ہے؛ لیکن اس کی عسکری مہارت بڑی ہے، تو فرمایئے کس کے ساتھ جانا چاہیے،؟ (ہم تو اللہ کی رضا کے لئے جا رہے ہیں) امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:

"جو شخص نیک و متقی ہے، لیکن عسکری مہارت میں کم درجہ رکھتا ہے، اس کی نیکی وتقوے کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا، اور اس کی عسکری عدم مہارت کا نقصان پوری قوم اور اسلامی فوج کو ہوگا، جو شخص زیادہ نیک نہیں ہے، اس کی نیکی کی کمی کا جو نقصان ہے، وہ صرف اس کی ذات کو ہوگا؛ لیکن اس کی عسکری "مہارت" کا فائدہ پوری مسلمان امت کو ہوگا۔

اس لئے ان فنی مہارتوں کی ہر دور کے لحاظ سے ضرورت اور اہمیت بدلتی رہتی ہے، ایک زمانہ تھا منجنیق کا، آپ ﷺ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا، تا کہ منجنیق بنانا سیکھ کر آئیں اور وہاں سے لے کر بھی آئیں، رسول اللہ ﷺ نے طائف کے معرکے میں وہ استعمال بھی فرمایا، منجنیق کو آج کے ''ٹینک'' کا پیش رو (pioneer) کہہ سکتے ہیں، وہ ایک بہت بڑی گاڑی ہوا کرتی تھی، جو قلعوں کی دیوار وغیرہ توڑنے کے لئے استعمال ہوتی تھی، اس پر چٹان یا بڑے پتھر رکھ دیئے جاتے اور لکڑی کی بنی ہوئی پتوار قسم کی ایک چیز کھینچی جاتی تھی، اس پر ایک شدید ضرب کے نتیجے میں ایک اسپرنگ کے طاقت اور (push) کے ساتھ پتھر نکلتا اور قلعے کی دیوار پر لگتا تو قلعے کی دیوار ٹوٹ جاتی تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے یمن کے عیسائیوں سے اس کی تعلیم سیکھی اور پھر آکر اس مہارت کو طائف کی فتح میں استعمال فرمایا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور ابن تیمیہ نے السیاسۃ الشرعیۃ میں لکھا ہے کہ ایسی تمام مہارتوں وتخصصات کا حاصل کرنا مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے، جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان غیر مسلموں کے محتاج بن کر رہیں، مسلمانوں کو غیر مسلموں کی محتاجی سے بچانا اور ان کو اپنی دینی ودنیوی معاملات میں خود کفیل بنانا، یہ مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے۔

اس دور میں فقہ کی تعلیم سے دنیا کے بھی بڑے فائدے ملتے تھے، آدمی فقہ پڑھ کر قاضی بن جاتا تھا، مفتی بن جاتا تھا، وزیر اور گورنر بن جاتا تھا، امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ: طلبہ فقہ تو پڑھتے تھے، لیکن طب، ہندسہ کوئی نہیں پڑھتے تھے (اس زمانے میں الٹ تھا، آج لوگ میڈیکل اور انجینئر نگ تو پڑھتے ہیں، لیکن فقہ نہیں پڑھتے) امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں شکایت کی ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ لوگوں کو ان علوم (میڈیکل اور انجینئر نگ) کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے، اس لئے کہ یہ فرض کفایہ ہے، اور ان کے نہ ہونے کی وجہ مسلمان، غیر مسلم طبیبوں، مہندسوں اور انجینئر وں کا محتاج رہے گا اور اس احتیاج کو ختم کرنا مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے۔

آج قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں ہے، وہ طبقہ ایک خاص انداز کا تربیت یافتہ ہے، ۱۸۳۴ـ۳۵ءیعنی لارڈ میکالے کے زمانے سے آج تک چار نسلیں اس طبقے کے زیر اثر ایک خاص ماحول میں پرورش پا چکی ہیں، اس کے اپنے تعلیمی ادارے ہیں، جن کا اپنا مخصوص ماحول ہے، وہ اس ماحول میں پرورش پا کر انگلستان اورامریکا کے تعلیمی اداروں میں بھیجے جاتے ہیں، وہاں کی اعلی تربیت پا کر اسی ذہنیت اورسوچ وفکر کے ساتھ واپس آتے ہیں۔

آج سے تقریبا بارہ تیرہ سوسال پہلے جب یونانیوں کے علوم وفنون کی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں شروع ہواتو قریب قریب یہی صورتحال پیش آئی جس سے ہم آج دوچار ہیں، یونانی منطق، مسلمان علماء وفضلاء کی بنائی نہیں تھی، ارسطو (م: ۳۲۲ق م) اورافلاطون (م: ۳۴۷ق م) کوئی متقی لوگ نہیں تھے، بلکہ بت پرست اور مشرک تھے، لیکن جب ان کا تیارکردہ علم منطق مسلمانوں میں رائج اورمقبول ہونا شروع ہواتو بعض اہل علم کی رائے تھی کہ اس کونہیں سیکھنا چاہئے، اس زمانے کے فتاوی موجود ہیں کہ منطق اور یونانی کا سیکھنا ناجائز اورحرام ہے، جیسے آج ہمارے زمانے میں انگریزی زبان اور جدید مضامین کے تعلق سے خیال ہے، لیکن ایک دوسری انتہائی اوراہم حکیمانہ رائے یہ بھی تھی اورتاریخ نے ثابت کیا کہ یہ رائے زیادہ صائب اوردرست تھی کہ یونانی علوم وفنون سیکھ کر ہی ہم اس کا جائزہ لے سکیں گے کہ ان میں کون سی چیز غلط ہے، اورکیا چیز ہمارے لئے اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول ہے؟ جوغلط ہے، دلائل سے اس کی تردید کر کے نظر انداز کردیں اور جولوگ اس کا شکار ہورہے ہیں، ان کوبھی اس غلط عنصر کے منفی اثرات سے محفوظ کرلیں، لیکن ان علوم وفنون میں جتنا اور جوحصہ ہمارے نقطہ نظر سے مفید ہے، اس سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہئے، وہ مسلمانوں کیلئے گم شدہ میراث کی حیثیت رکھتا ہے۔

خذ ما صفا دع ما کدر

جوصاف اوراچھا ہے، اسے لےلو اور جوگندہ اور مکدر ہے، اس کونظر

انداز اور مسترد کردو۔

چنانچہ اس دوسرے گروہ کے اہل علم نے جو رائے اختیار کی تھی، تاریخ نے ثابت کیا کہ یہی رائے صائب اور درست تھی، مسلمانوں کے اجتماعی مزاج نے اس رائے کو اختیار کیا، یہاں تک کہ یہ کیفیت ہوئی کہ پھر وہ منطق اور فلسفہ جس سے شروع میں مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ شاید مسلمانوں کے دین اور ایمان اس سے متاثر ہوں، اسی فلسفے اور منطق سے مسلمانوں نے اسلام کی خدمت کا کام لیا۔

امام غزالیؒ کی کتاب ''المستصفی'' دیکھ لیجئے، جو ''اصول فقہ'' کی کتاب ہے، لیکن ساری کی ساری منطقی اصولوں پر مبنی ہے، امام صاحبؒ نے اصول فقہ کے احکام ومباحث کو خالص منطقی اصولوں پر مرتب کیا ہے، اگر کوئی منطق کی اصطلاحات نہ جانتا ہو، وہ یہ کتاب نہیں سمجھ سکتا، امام رازی کی تفسیر کبیر تو ساری کی ساری منطق اور فلسفے کی ہی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہے، اصول فقہ کی ایک اور بہترین کتاب جو اپنے تعمق و گہرائی میں کوئی ثانی نہیں رکھتی، وہ امام شاطبی کی کتاب ''الموافقات'' ہے، ''الموافقات فی أصول الشریعۃ'' چار جلدوں میں ہے، جتنے علوم وفنون امام شاطبی کے زمانے میں موجود تھے، اور اس وقت تک انسانیت نے جو کچھ بھی حاصل کر لیا تھا، ان سب کو انہوں نے شریعت کے احکام کی ابدیت اور معقولیت کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا ہے، اس سے واقعی اونچی کتاب آج تک قانون کی تاریخ ثابت کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی، اگر آدمی منطق نہ جانتا ہو تو وہ اس کتاب سے استفادہ نہیں کر سکتا، حضرت شاہ ولی اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' برصغیر کی بہترین مستند تصنیف ہے، برصغیر میں اس سے بہتر کتاب اسلام کے فلسفے پر لکھی ہی نہیں گئی، وہ بھی ساری کی ساری یونانی علوم وفلسفے کی اصطلاحات سے بھرپور ہے۔

اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ جو چیز پہلے ''خطرہ'' سمجھی گئی، وہ بعد میں ''خادم'' بن گئی، اسلام خادم بننے کے لئے نہیں آیا، مخدوم بننے کے لئے آیا ہے، جو چیز ''مخدوم'' بن کر اسلام کے کیمپ میں داخل ہوتی ہے، بالآخر اسے

''خادم'' بننا ہی پڑتا ہے، تاتاریوں کی مثال لے لیں، تاتاری، اسلام میں فاتح بن کر داخل ہوئے؛ لیکن بالآخر اسلام کے خادم بن گئے، وہ تاتاری جنھوں نے بغداد کو تباہ کیا تھا، جنھوں نے دریاؤں کے پانی کتابوں (کی سیاہی) سے سیاہ کر دیئے تھے، انہوں نے ہی عالم اسلام کی سرحدں کا سات سو سال تک دفاع کیا۔

عصری علوم سے لیس ہونے کا مطلب

آج کے سیاق وسباق میں عصری علوم سے کیا مراد ہے، بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ انجنیئر نگ کالج میں کیا مولوی تیار ہوتے ہیں؟ تو پھر مدرسوں میں انجنیئر کیوں کر تیار ہوں؟ یہ بالکل غلط مبحث ہے؟ عصری علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے یہ معنیٰ نہیں کہ ایک محدث کو حدیث کی درسگاہ سے اٹھاکے انجنیر بنا دیا جائے، ایک فقیہ کو دارالافتاء سے اٹھاکے کہا جائے کہ تم میڈیکل ڈاکٹر ہوجاؤ، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو غلط سمجھتا ہے، محدث کو محدث ہی رہنے دیا جائے، لیکن محدث ایسا ہو جو علم حدیث پر ماہرانہ، مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہو، اپنے وقت کا انور شاہ کشمیری ہو، آج کا تعلیم یافتہ آدمی جن اسباب سے علم حدیث کے بعض پہلوؤں پر شبہات رکھتا ہے، ان کو وہ سمجھتا بھی ہو، اوران کا جواب دینے اور اعتراض کرنے والوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، امام ابو یوسف کا قول ہے:

من لم یعرف أهل زمان فهو جاهل:

جو اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے

اور ارشاد باری ہے:

''وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ'' (۱)

لسان قوم میں صرف اردو یا پنجابی یا انگریزی داخل نہیں، لسان میں وہ پورا تہذیبی پس منظر بھی شامل ہے، جو اس زبان میں شامل ہے۔ (۲)

---

(۱) ابراہیم: ۴

(۲) محاضرات تعلیم: ۱۲۰

علوم عصریہ کی ضروری شمولیت مگر۔۔۔۔

دینی مدارس نصاب میں بعض علوم جدیدہ کے اضافہ کی شدت سے ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں، لیکن دینی مدارس کے علمی ذوق کے علی الرغم علوم جدیدہ کے موجودہ انداز کو اپنا لینے کو قطعاً گوارہ نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس حد تک اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے، جس حد تک یہ علوم جدیدہ علماء کرام کو دعوت إلی اللہ، تبلیغ اسلام اور اسلام پر ہونے والے اعتراضات وشبہات کا رد کرنے میں معاون ثابت ہوسکیں، چنانچہ بعض مدارس نے انگریزی زبان، جدید معاشیات اور سیاست وقانون کو کسی حد تک نصاب تعلیم میں شامل کرلیا ہے، اور ایسے مدارس کی تعداد کوئی خاص قابل ذکر نہیں ہے، جس کا بڑا سبب وسائل اور جدید وقدیم علوم میں بیک وقت نظر رکھنے والے افراد کے فقدان اور دیگر بے شمار مشکلات کو قرار دیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بیشتر مدارس اپنے قدیم طرز پر ہی چل رہے ہیں اور جدید علوم کی صحیح تعلیم کا بندوبست ان کے لئے تقریباً ناممکن ہوکر رہ گیا ہے، اور مذکورہ ذیل اسباب کو ہم اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے سکتے ہیں۔

۱۔ علوم جدیدہ کی تعلیم وتدریس بہت زیادہ مادی وسائل کی محتاج ہے اور ان وسائل کا حصول ان مدارس کے بس سے باہر ہے۔

۲۔ دینی مدارس کا بنیادی مقصد صرف علوم دینیہ کی تعلیم وتدریس ہی نہیں ہے، بلکہ خالص دینی مزاج کی آبیاری، طلباء کے عمل کی خالص دینی بنیادوں پر تربیت، اتباع سنت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے کو عملی زندگی کے ہر میدان میں۔۔۔۔حتی کہ شکل وصورت میں بھی۔۔۔اسلام کے نقش قدم پر چلانا ہوتا ہے؛ لیکن دوسری جانب علوم جدیدہ کے بڑے بڑے پروفیسروں کے ہاں ان باتوں کا وہ اہتمام کیا جاتا جن کی طرف دینی مدارس میں خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ مدارس اس بات سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ کہیں خدانخواستہ علوم جدیدہ کے یہ اساتذہ مدارس کے مزاج اور پختہ دینی ذوق کو بگاڑنے

اور متغیر کرنے کا سبب تو نہ بن جائیں گے اور نہیں تو کم از کم اس میں معاون ضرور ثابت ہوں گے۔

۳۔ علوم جدیدہ فی نفسہا دین اور علوم دینیہ کے مخالف نہیں ہیں، لیکن چونکہ اس کے مرتبین بڑے بڑے غیر مسلم ہیں اور انہوں نے ان علوم کو اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ لازماً طلباء کے دلوں میں دین اور اس کے اجماعی راویوں کے خلاف شکوک وشبہات کے بیج بو دیئے جاتے ہیں اور اس مشکل کا واحد حل یہی ہے کہ یا تو ان علوم کی کتابوں کو از سر نو مرتب کیا جائے یا پھر ایسے ماہرین ان کو پڑھائیں جن کو اسلام اور اس کے علوم میں مہارت تامہ حاصل ہو، اور ان دونوں امور کا حل مدارس دینیہ کے لئے انتہائی مشکل کام ہے۔(۱)

ناقابل تحمل عصری علوم کی مقدار

جو دینی مدارس کے نظام سے براہ راست وابستہ نہیں ہیں، اور جن کو اس نظام تعلیم سے عملی تجربہ حاصل نہیں ہے، ان کی طرف سے بسا اوقات اس قسم کی تجویز سامنے آتی رہتی ہے کہ ان مدارس کے نصاب میں سائنس، ریاضی اور انجنیئرنگ وغیرہ کی معیاری تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے، تاکہ جو علماء ان دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ ان تجربی علوم میں بھی کماحقہ درک اور بصیرت رکھتے ہوں۔

یہ تجویز خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ پیش کی جاتی ہو؛ لیکن نہایت سطحی تجویز ہے جو درحقیقت دینی مدارس کے مقاصد سے ناواقفیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس کا مقصد ایسے صاحب استعداد علماء پیدا کرنا ہے جو قرآن وسنت اور ان کے متعلقہ علوم میں ماہرانہ بصیرت کے حامل ہوں اور یہ مقصد جس ذہنی یکسوئی اور ہمہ تن توجہ کا متقاضی ہے، اس کی موجودگی میں یہ بات قریب قریب ناممکن ہے کہ ایک شخص بیک وقت اونچی استعداد کا عالم دین بھی ہو اور ساتھ ساتھ ماہر ڈاکٹر، سائنسداں یا ماہر معاشیات بھی ہو۔

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۸۳، حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم، زم زم بک ڈپو دیوبند

یہ بات یوں ہر دور میں سچ تھی، لیکن آج کا زمانہ ہر علم میں اختصاص کا دور کہا جاتا رہے، اس میں تو روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے، آج اگر کوئی شخص علم طب کو اپنا خصوصی موضوع بناتا ہے اور میڈیکل سائنس میں مہارت حاصل کرتا ہے تو کوئی بھی صاحب عقل اس پر یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ وہ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ انجینئر کیوں نہیں بنے؟ یا اگر کوئی شخص انجینئرنگ کے شعبے میں فارغ التحصیل ہوتا ہے تو اس پر کوئی ہوش مند یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ اس نے میڈیکل سائنس کیوں نہیں پڑھی؟

اسی طرح اگر کسی سائنس کی تعلیم کے ادارے میں تمام تر توجہ سائنس کی تعلیم پر دی جاتی ہے تو کوئی شخص وہاں یہ اعتراض پیش نہیں کرتا کہ اس ادارے میں ادب، شاعری، یا کامرس کی تعلیم کیوں نہیں ہوتی؟ کسی کامرس کالج پر یہ اعتراض کبھی نہیں کیا جاتا کہ یہاں سے انجینئر کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ کسی لاء کالج کے بارے میں یہ تجویز نہیں سنی گئی کہ اس میں فلکیات کی تعلیم بھی ہونی چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ اگر دینی مدارس کی تمام تر توجہ اسلامی علوم کے ماہرین پیدا کرنے پر مرکوز ہے اور وہاں سے کوئی ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں یا ماہر معاشیات پیدا نہیں ہوتا تو اس بات پر اس قدر تشویش اور واویلا کیوں ہے؟ کیا تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور ان کے متعلقات ایسے علوم نہیں ہیں کہ ان کے درس وتدریس کے لئے کچھ ادارے مخصوص ہوں جو ہمیں انہی علوم پر محنت کرکے انہی کی خدمت انجام دیں اور انہی علوم کے متخصص علماء پیدا کریں؟ اگر کوئی شخص واقعۃً ایسا سمجھتا ہے تو اس کی ناواقفیت پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ لیکن اگر کوئی شخص ان علوم کی اہمیت اور عظمت کا کسی بھی درجہ میں احساس رکھتا ہے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ علماء دین سے انجینئر اور سائنس داں بننے کا مطالبہ کس قدر سطحی، غیر حقیقت پسندانہ اور ناقابل عمل ہے۔

بعض حضرات دینی مدارس کی خیر خواہی اور ہمدردی میں یہ تجویز بھی پیش فرماتے رہے ہیں کہ ان درسگاہوں میں دستکاری کے ہنر سکھانے اور دوسری ٹیکنکی تربیت کا بھی انتظام

ہونا چاہئے تا کہ جو علماء یہاں سے فارغ التحصیل ہوں، وہ معاشی اعتبار سے معاشرے پر بوجھ بننے اور دوسروں کے دست نگر ہونے کے بجائے اپنے معاش کا انتظام اپنے ہاتھ کے ہنر سے کر سکیں اور دین کی خدمت کسی معاوضے کے بغیر انجام دیں۔

یہ تجویز خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے پیش کی گئی ہو اور بظاہر کتنی ہی خوش نما معلوم ہوتی ہو، حقیقت پسندی سے بہت دور اور نا قابل عمل ہے، پہلی بات تو وہی ہے کہ اگر دینی مدارس کا مقصد قرآن وسنت کے علوم میں بصیرت رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے تو یہ علوم اپنی تحصیل اور اپنی خدمت کے لئے پورا وقت چاہتے ہیں اور آج کی زندگی جس قدر پیچیدہ ہوگئی ہے، اس میں تجربہ یہی ہے کہ ٹیکنکی کاموں میں تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے، بعض طلباء نے علم دین کے ساتھ ساتھ یہ ٹیکنکی ہنر سیکھے، لیکن اس عملی تجربے میں شاید کوئی توجہ نہ دے سکا، اور اس ہنر کے ذریعے کسب معاش میں مصروف ہوا تو علوم دین سے تعلق باقی نہ رکھ سکا، لہٰذا جو مدارس اعلی قابلیت کے علماء تیار کرنے کے لئے قائم ہوئے ہیں، ان کے لئے یہ نہ ممکن ہے اور نہ مناسب کہ وہ اپنے طلباء کو علوم دین کے ساتھ ٹیکنکی تربیت دینے کا بھی انتظام کریں۔

دوسرے یہ عجیب تصور ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کی دینی ضروریات پوری کر کے کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کرتا ہے تو وہ ''معاشرے'' پر بوجھ یا ''دوسروں کا دست نگر'' بن گیا ہے، علم وفن کے ہر شعبہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص علم وفن میں مہارت حاصل کر کے اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دیتا ہے، اس کا معاش بھی اسی شعبے سے وابستہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دینے کی بناء پر کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کرتا ہے تو اس میں معاشرے پر بوجھ بننے یا کسی کا دست نگر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ اس معاشرتی نظام کا ایک لازمی حصہ ہے جس پر پوری انسانیت کی بنیاد قائم ہے، اگر کوئی طبیب، انجنیئر، ماہر معاشیات، یا سائنس داں اپنے شعبے میں معاشرے کی خدمت کرتا ہے اور اس کے صلے میں معاشرہ اسے معاشی فوائد بہم پہنچاتا ہے تو نہ اس پر کسی کا احسان ہے اور نہ اس کی بناء پر یہ سمجھنا درست ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ بن رہا ہے، یا

دوسروں کا دست نگر ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا علوم دین کی خدمت معاشرے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا ایک مسلمان معاشرے کو ایسے اہل علم کی حاجت نہیں جو ان کی دینی ضروریات پوری کرسکیں؟ ان کو نت نئے مسائل میں دین کی رہنمائی فراہم کرسکیں؟ دین پر حملہ آور فتنوں کا مؤثر تعاقب کرسکیں؟ اور دین سے متعلق وہ تمام امور انجام دے سکیں جو دوسرے کاموں میں مشغول افراد انجام نہیں دے سکتے ہیں۔

اگر یہ ایک مسلمان معاشرے کی اولین ضرورت ہے اور کون ہے جو اس حقیقت کا انکار کر سکے؟ تو اگر معاشرہ ان خدمات کے صلے میں ایسے اہل علم کو اپنے معاش سے بے فکر کرنے کے لئے اپنا فریضہ ادا کرتا ہے تو کونسا احسان ہے جو ان اہل علم پر کیا جارہا ہے؟ اور اس کی بناء پر یہ خیال آخر کیوں پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ اور دوسروں کے دست نگر ہیں، اس لئے انہیں اپنی معاشی کفالت کے لئے کوئی اور ہنر سیکھنا چاہئے؟ (۱)

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا ایک خطاب

وقت کی کمی کے پیش نظر بہت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حرا فاؤنڈیشن اسکول جس کی حفظ قرآن کی تقریب میں آج ہم اور آپ شریک ہیں، اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ بات رئیس الجامعہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے مختلف مواقع پر مختلف نشستوں میں دہرائی، مجھے بھی اپنے والد مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے سنی گئی اس بات کو کئی جگہ سنانے کی توفیق ہوئی۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں تین بڑے نظامِ تعلیم معروف تھے: ایک دارالعلوم دیوبند کا نظامِ تعلیم، دوسرا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا نظامِ تعلیم اور تیسرے دارالعلوم ندوۃ العلما کا نظامِ تعلیم۔ حضرت والد ماجد نے تقریباً 1950 میں ایک موقع پر جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات بیان فرمائی تھی: پاکستان بننے کے بعد درحقیقت نہ ہمیں علیگڑھ کی ضرورت ہے، نہ ندوہ کی ضرورت

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۸۸-۸۹-۹۰

ہے، نہ دارالعلوم دیوبند کی ضرورت ہے، بلکہ ہمیں ایکچو تھے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف کی تاریخ سے مربوط چلا آرہا ہے۔

بظاہر سننے والوں کو یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک مستند مفتی اعظم اور دارالعلوم دیوبند کا ایک سپوت یہ کہے کہ ہمیں پاکستان میں دیوبند کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہمیں ایک نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے۔

حضرت والد ماجد نے جو بات فرمائی وہ درحقیقت ایک بہت گہری بات ہے اور اسی کے نہ سمجھنے کے نتیجے میں ہمارے ہاں بڑی عظیم غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ہندوستان میں جو تین نظامِ تعلیم جاری تھے، وہ درحقیقت فطری نہیں تھے، بلکہ انگریز کے لائے ہوئے نظام کا ایک نتیجہ اور انگریز کی لائی ہوئی سازشوں کا ایک ردعمل تھا، ورنہ اس سے پہلے رائج مسلمانوں کے صدیوں پرانے نظامِ تعلیم پر غور کیا جائے تو اس میں مدرسے اور اسکول کی کوئی تفریق نہیں ملے گی۔ وہاں شروع سے لے کر اور انگریز کے زمانے تک مسلسل یہ صورت حال رہی کہ مدارس یا جامعات میں بیک وقت دونوں تعلیمیں دینی اور عصری تعلیم دی جاتی تھیں۔

صورت حال یہ تھی کہ شریعت نے جو بات مقرر کی کہ عالم بننا ہر ایک آدمی کے لیے فرضِ عین نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ یعنی ضرورت کے مطابق کسی بستی یا کسی ملک میں علماء پیدا ہوجائیں تو باقی سب لوگوں کی طرف سے وہ فریضہ ادا ہوجاتا ہے، لیکن دین کی بنیادی معلومات حاصل کرنا فرضِ عین ہے، یہ ہر انسان کے ذمے فرض ہے۔ ان مدارس کا نظام یہ تھا کہ ان میں فرضِ عین کی تعلیم بلا امتیاز ہر شخص کو دی جاتی تھی، ہر شخص اس کو حاصل کرتا تھا، جو مسلمان ہوتا تھا۔ البتہ جس کو علمِ دین میں اختصاص حاصل کرنا ہو، اس کے لیے الگ مواقع تھے۔ جو کسی عصری علم میں اختصاص حاصل کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے مواقع الگ تھے۔

گزشتہ سال میں اور برادرم معظم حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مراکش میں تھے۔ میں نے پچھلے سال دیکھا تھا اور حضرت نے اِس سال اس کی زیارت کی۔ مراکش کو انگریزی میں مورو کو کہتے ہیں، اس کا ایک شہر ہے جس کا نام فاس ہے۔ میں فاس کے شہر میں

پچھلے سال گیا تھا اور اِس سال حضرت بھی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں جامعہ القرویین کے نام سے ایک جامعہ آج تک کام کررہا ہے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کی مشہور اسلامی جامعات کا جائزہ لیں تو چار بنیادی اسلامی جامعات ہماری تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی مراکش کی جامعہ القرویین ہے۔ دوسری تیونس کی جامعہ زیتونہ ہے۔ تیسری مصر کی جامعہ الازہر ہے اور چوتھی دارالعلوم دیوبند ہے۔ تاریخی ترتیب اسی طرح ہے۔

اس میں سب سے پہلی اسلامی یونیورسٹی جو مراکش کے شہر فاس میں قائم ہوئی، تیسری صدی ہجری کی جامعہ ہے۔ ابھی تک ایسی کوئی ترتیب میرے سامنے نہیں آئی کہ یہ صرف عالم اسلام ہی کی نہیں، بلکہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے۔ اس تیسری صدی کی یونیورسٹی کے بارے میں اس کی تاریخ کے کتابچے میں یہ بات لکھی ہوئی کہ اس وقت جامعہ القرویین میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور اس کے ساتھ ساتھ طب، ریاضی، فلکیات جنہیں ہم آج عصری علوم کہتے ہیں، وہ سارے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ابن خلدون، ابن رشد، قاضی عیاض اور ایک طویل فہرست ہمارے اکابر کی ہے جنہوں نے جامعہ لقرویین میں درس دیا۔ ان کے پاس یہ تاریخ آج بھی محفوظ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں ابن خلدون درس دیا کرتے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ابن رشد درس دیا کرتے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں قاضی عیاض نے درس دیا ہے۔ یہاں ابن عربی مالکی نے درس دیا ہے۔ تاریخ کی یہ ساری باتیں ان کے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔ یہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے، اس لحاظ سے کہ چھوٹے چھوٹے مدارس تو ہر جگہ ہوں گے، لیکن جامعہ القرویین ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں تمام دینی اور عصری علوم پڑھائے جاتے تھے۔

اس یونیورسٹی میں آج بھی تیسری اور چوتھی صدی کی سائنٹفک ایجادات کے نمونے رکھے ہیں۔ اس زمانے میں اسی جامعہ القرویین سے فارغ لوگوں نے جو ایجادات گھڑی وغیرہ کی کیں، ان ایجادات کے نمونے بھی وہاں پر موجود ہیں۔ آپ تیسری صدی ہجری تصور کیجیے۔

یہ تیسری صدی ہجری کی یونیورسٹی ہے۔اس میں اسلامی علوم کے بادشاہ بھی پیدا ہوئے۔ اور وہیں سے ابن رشد فلسفی بھی پیدا ہوا اور وہیں سے بڑے بڑے سائنسدان بھی پیدا ہوئے۔ ہوتا یہ تھا کہ دین اسلام کا فرضِ عین علم سب کو اکٹھا دیا جاتا تھا۔اس کے بعد اگر کوئی علمِ دین میں تخصصات حاصل کرنا چاہتا تھا تو وہ اسی جامعہ القرویین میں علم دین کی درس گاہوں میں پڑھتا۔اگر کوئی ریاضی پڑھانے والا ہے تو وہ ریاضی بھی وہاں پڑھا رہا ہوتا۔ اگر کوئی طب پڑھانے والا ہے تو وہ طب بھی وہاں پڑھا رہا ہوتا۔ یہ سارا کا سارا نظام اس طرح چلا کرتا تھا۔جامعہ القرویین کی طرح جامعہ زیتونہ تیونس اور جامعہ الازہر مصر کا نظامِ تعلیم بھی رہا۔ یہ تینوں یونیورسٹیاں ہمارے قدیم ماضی کی ہیں۔ان میں دینی اور عصری تعلیم کا سلسلہ اس طرح رہا۔

اس میں آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اگر قاضی عیاض جو حدیث اور سنت کے امام ہیں، ان کا حلیہ دیکھا جائے اور ابن خلدون جو فلسفہ تاریخ کے امام ہیں، ان کا حلیہ دیکھا جائے، دونوں کو دیکھنے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا کہ یہ دین کا عالم ہے اور وہ دنیا کا عالم ہے۔ دونوں کا حلیہ، لباس، ثقافت، طرزِ زندگی، طرزِ کلام سب یکساں تھا۔اگر آپ مشہور اسلامی سائنسدان فارابی، ابن رشد، ابوریحان البیرونی ان سب کا حلیہ دیکھیں اور جو محدثین، مفسرین اور فقہا پیدا ہوئے ان کا حلیہ دیکھیں، دونوں کا حلیہ ایک جیسا نظر آئے گا۔ اگر وہ نماز پڑھتے تھے تو یہ بھی نماز پڑھتے تھے۔اگر ان کو نماز کے مسائل معلوم تھے تو اِن کو بھی معلوم تھے۔اگر ان کو روزے کے مسائل معلوم تھے تو اِن کو بھی معلوم تھے۔ بنیادی اسلامی تعلیمات جو ہر انسان کے ذمے فرضِ عین ہیں، اس دور میں ہر انسان جانتا تھا اور اس یونیورسٹی میں اس کو پڑھایا جاتا تھا۔۔تفریق یہاں سے پیدا ہوئی کہ انگریز نے آ کر باقاعدہ سازش کے تحت ایک ایسا نظامِ تعلیم جاری کیا کہ اس سے دین کو دیس نکالا دے دیا گیا۔اس وقت ہمارے اکابرین مجبور ہوئے کہ وہ مسلمانوں کے دین کے تحفظ کے لیے کم از کم جو فرضِ کفایہ ہے، اس کا تحفظ کریں۔انہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا جس نے

الحمدللہ! وہ خدمات انجام دیں جس کی تاریخ میں نظیر ملنا مشکل ہے، لیکن یہ ایک مجبوری تھی۔ اصل حقیقت وہ تھی جو جامعہ القرویین میں تھی، جو جامعہ زیتونہ میں تھی، جو جامعہ الازہر کے ابتدائی دور میں تھی۔ اصل حقیقت وہ تھی۔ اگر پاکستان صحیح معنی میں اسلامی ریاست بنتا اور صحیح معنی میں اس کے اندر اسلامی احکام کا نفاذ ہوتا تو پھر اس صورت میں ہمیں بقول حضرت والد ماجد کے نہ علیگڑھ کی ضرورت تھی، نہ ندوہ کی ضرورت تھی، نہ دارالعلوم دیوبند کی ضرورت تھی، ہمیں جامعہ القرویین کی ضرورت ہے، جامعہ زیتونہ کی ضرورت ہے اور ایسی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس میں سارے کے سارے علوم اکٹھے پڑھائے جائیں۔ سب دین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، چاہے وہ انجینئر ہو، چاہے وہ ڈاکٹر ہو، چاہے کسی بھی شعبہ زندگی سے وابستہ ہو، وہ دین کے رنگ میں رنگا ہوا ہو، لیکن ہم پر ایسا نظامِ تعلیم لا دیا گیا جس نے ہمیں سوائے ذہنی غلامی کے سکھانے کے اور کچھ نہیں سکھایا۔ اس نے ہمیں غلام بنایا۔ اکبرالہ آبادی نے صحیح کہا تھا:

اب علیگڑھ کی بھی تم تمثیل لو
اب معزز پیٹ تم اس کو کہو

صرف پیٹ بھرنے کا ایک راستہ نکالنے کے لیے انگریز یہ نظامِ تعلیم لایا اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی پوری تاریخ اور پورا ورثہ تباہ کر دیا گیا۔

نتیجہ یہ کہ آج اس نئے نظامِ تعلیم کے ذریعے زبردست دو فرق واضح طور پر سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے فرضِ عین کا بھی علم نہیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے اکثر طالب علم جانتے ہی نہیں ہیں کہ دین میں فرض کیا ہے؟ دوسرے ان کے اوپر افکار مسلط کر دیے گئے ہیں کہ اگر عقل اور ترقی چاہتے ہو تو تمہیں مغرب کی طرف دیکھنا ہوگا۔ تیسری ان کی ثقافت بدل دی گئی۔ ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ اگر اس دنیا میں ترقی چاہتے ہو تو صرف مغربی افکار میں ملے گی، مغربی ماحول میں ملے گی، مغربی انداز میں ملے گی۔ افسوس یہ ہے کہ اس نئے نظامِ تعلیم سے جو

گریجویٹس، ڈاکٹرز یا پروفیسرز بن کر پیدا ہوتے ہیں، وہ ہم جیسے طالب علموں پر تو روز تنقید کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا، یہ اجتہاد نہیں کرتے۔قرآن وسنت اورفقہ میں اجتہاد ایک عظیم چیز تھی، لیکن ایک ایسی چیز جس میں اجتہاد کا دروازہ چاروں طرف چوپٹ کھلا ہوا تھا، وہ تھی سائنس اور ٹیکنالوجی، ریاضی، علومِ عصریہ اس میں تو کسی نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا۔ علیگڑھ کے اور اس نئے نظامِ تعلیم کے ذریعے آپ نے کیوں ایسے مجتہد پیدا نہیں کیے جو مغرب کے سائنسدانوں کا مقابلہ کرتے۔اس میں آپ نے کیوں ایسے مجتہد پیدا نہیں کیے جو اجتہاد کر کے طب، فلکیات، ریاضی، سائنس وغیرہ میں نئے راستے نکالتے۔ اجتہاد کا دروازہ جہاں چوپٹ کھلا تھا وہاں کوئی اجتہاد کیا ہی نہیں، اور جہاں قرآن وسنت کی پابندی ہے اور قرآن وسنت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد کرنا ہوتا ہے، وہاں شکایت ہے کہ علمائے کرام اجتہاد کیوں نہیں کرتے؟

ابھی کچھ دن پہلے کسی صاحب نے ایک کلپ بھیجا جس میں ایک عالم دین سے یہ سوال کیا جا رہا تھا کہ مولانا! یہ بتائیے کہ علمائے کرام کی خدمات ویسے اپنی جگہ ہے، لیکن یہ کیا بات ہے کہ علمائے کرام میں کسی طرف سے بھی کوئی سائنسدان پیدا نہیں ہوا، کوئی ڈاکٹر پیدا نہیں ہوا، کسی بھی طرح کی ایجاد نہیں ہوئی، اس کا علمائے کرام کے پاس کیا جواب ہے؟ بندۂ خدا! یہ سوال تو آپ اپنے آپ سے کرتے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں کوئی ایسا مجتہد پیدا ہوا جس نے کوئی نئی ایجاد کی ہو؟ لیکن وہاں تو اجتہاد کے دروازے اس طرح بند ہیں کہ جو انگریز نے کہہ دیا، مغرب نے کہہ دیا بس وہ نظریہ ہے، اس نے جو دوا بتا دی وہ دوا ہے، اس نے اگر کسی چیز کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ صحت کے لیے مضر ہے تو اس کی اقتدا کرتے ہیں۔ انڈے کی زردی کے بارے میں سالہا سال سے کہا جا رہا تھا کہ یہ کولیسٹرول پیدا کرتی ہے اور امراضِ قلب میں مضر ہوتی ہے، لیکن آج اچانک ہر ڈاکٹر یہ کہہ رہا ہے کہ انڈے کی زردی کھاؤ، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ مغرب سے یہ پیغام آ گیا ہے، اسے آپ نے قبول کر لیا ہے۔

ہمارے ملک میں بے شمار جڑی بوٹیاں لگی ہوئی ہیں، اس پر آپ نے کبھی تحقیق کی ہوتی، اس سے آپ نے کوئی نتیجہ نکالا ہوتا کہ فلاں جڑی بوٹی ان امراض کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کلونجی کے فوائد بیان فرمائے تھے، اس پر کوئی تحقیق کی ہوتی۔ وہاں تو اجتہاد کا دروازہ ٹوٹل بند ہے اور اس میں کوئی تحقیق کا راستہ نہیں، اور جو قرآن وسنت کی بات ہے اس میں اجتہاد کا مطالبہ ہے۔ یہ ذہنی غلامی کا نظام ہے جس نے ہمیں اس نتیجے تک پہنچایا۔ دوسرا یہ کہ تصورات بدل گئے۔ پہلے علم کا تصور ایک معزز چیز تھی جس کا مقصد معاشرے اور مخلوق کی خدمت تھی، یہ اصل مقصود تھا۔ اس کے تحت اگر معاشی فوائد بھی حاصل ہوجائیں تو ثانوی حیثیت رکھتے تھے، لیکن آج معاملہ الٹا ہوگیا، علم کا مقصد صرف پیسہ کمانا ہے۔ علم کا مقصد یہ ہے کہ اتنا علم حاصل کرو کہ لوگوں کی جیب سے زیادہ سے زیادہ پیسہ نکال سکو۔ تمہارا علم اس وقت کارآمد ہے کہ جب تم لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کما سکو۔ آپ دیکھیں کہ موجودہ دور میں کتنے لوگ پڑھ رہے ہیں اور گریجویشن کررہے ہیں، ماسٹر ڈگریاں لے رہے ہیں، قسما قسم کی ڈگریاں حاصل کررہے ہیں، ان کے ذہن سے پوچھا جائے کہ کیوں پڑھ رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اس لیے پڑھ رہے ہیں کہ کیریئر اچھا ہو، اچھی ملازمتیں ملیں، پیسے زیادہ ملیں۔ تعلیم کی ساری ذہنیت بدل کر یہ تبدیلی کردی کہ علم کا مقصد پیسہ کمانا ہے۔ علم حاصل کرکے معاشرے یا مخلوق کی کوئی خدمت انجام دینی ہے، اس کا کوئی تصور اس موجودہ نظامِ تعلیم میں نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص پیسے کمانے کی دوڑ میں مبتلا ہے اور اس کو نہ وطن کی فکر ہے، نہ ملک وملت کی فکر ہے اور نہ مخلوق کی خدمت کرنے کا کوئی جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ دن رات اسی دوڑ دھوپ میں مگن ہے کہ پیسے زیادہ بننے چاہییں۔ اس کے لیے چوری، ڈاکہ، رشوت ستانی وغیرہ کے ناجائز ذرائع بھی استعمال کرتا ہے۔

یہ بتائیے! موجودہ نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ یہاں تیار ہورہے ہیں، انہوں نے مخلوق کی کتنی خدمت کی؟ کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچایا؟ ہمیں تو پیغمبر انسانیت ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی تھی: اللھم لا تجعلِ الدنیا اکبر ھمِنا ولا مبلغ عِلمِنا ولا غایتہ

رغبتِنا یا اللہ! دنیا کو ہمارے لیے نہ تو ایسا بنائیے کہ ہمارا ہر وقت دھیان دنیا ہی کی طرف رہے اور نہ ہمارے علم کا سارا مبلغ دنیا ہی ہو کر رہ جائے، اور نہ ہماری ساری رغبتوں اور شوق کا مرکز دنیا ہو کر رہ جائے۔ لیکن اس نظامِ تعلیم نے کایا پلٹ دی۔

حضرت والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو بات فرمائی تھی اس کا منشا یہ تھا کہ انگریز کی غلامی کے بعد جو تعلیم کی کایا پلٹی گئی ہے، اس کایا کو دوبارہ پلٹ کر اس راستے پر چلیں جو راستہ جامعہ القرویین نے دکھایا، جو جامعہ زیتونہ نے دکھایا، جو ابتدائی دور میں جامعہ الازہر نے دکھایا۔ میں ابتدائے دور کی بات اس لیے کر رہا ہوں کہ آج جامعہ ازہر کی بھی کایا پلٹ چکی ہے، اسی لیے ابتدائی دور کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے یہاں حکومتی سطح پر وہ نظام تعلیم نافذ نہیں ہو سکا، لہٰذا مجبوراً کم از کم دار العلوم دیوبند کے نظام کا تحفظ تو ہو۔ الحمد للہ! اسی غرض سے مدارس قائم ہوئے۔ جب تک ہمیں حکمرانوں اور نظامِ حکومت پر اور ان کے بنائے ہوئے قوانین پر بھروسہ نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب میں کوئی بھروسہ ہونے کی امید ہے، اس لیے اس وقت تک ہم اِن مدارس کا پورا تحفظ کریں گے۔ مدارس کو اسی طرح برقرار رکھیں گے جس طرح ہمارے اکابر نے دیوبند کی طرح برقرار رکھا۔ اس کے اوپر ان شاء اللہ کوئی آنچ بھی نہیں آنے دیں گے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ قوم اس طرف بڑھے جو ہمارا ابتدائی مطمح نظر تھا۔ اسی سلسلے میں حرا فاؤنڈیشن کی یہ چھوٹی سی پریذینٹیشن تھی۔

اس میں رئیس الجامعہ کا چھوٹا سا خطاب تھا اور میں بھی اسے ہر جگہ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ الحمد للہ! پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد بقدرِ ضرورت اچھی خاصی ہوگئی، لیکن سارے مدارس فرضِ کفایہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے والوں کا تناسب پورے ملک کے حساب سے دیکھا جائے تو مشکل سے ایک فیصد ہوگا، لیکن ننانوے فیصد قوم جن اداروں میں جا رہی ہے اور جس طرح وہ انگریزوں کی ذہنی غلام بن رہی ہے، اس تعداد کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں یہ بات کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں اور کہتا رہتا ہوں کہ آپ کا اصل مقصد یہ ہے کہ

خدا کے لیے ہماری اس نسل کو اس انگریز کی ذہنی غلامی سے نکالیے۔ آپ کو یہ تاثر دینا ہے کہ الحمدللہ! ہم ایک آزاد قوم ہیں، ہم ایک آزاد سوچ رکھتے ہیں، ہم اپنے نبی کریم ﷺ کی سوچ رکھتے ہیں اور یہ جو ذہنی غلامی کا تصور پالا گیا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ مغرب سے آئے گا اور ہم مغربی افکار پر پروان چڑھیں گے، خدا کے لیے اس نئی نسل کے ذہنوں سے یہ چیز مٹائیے اور ان کے اندر اسلامی ذہنیت پیدا کیجیے۔ ہم نے اسی مقصد کے لیے یہ ادارہ قائم کیا۔ مغرب کی بھی ہر بات بری نہیں ہے، کچھ چیزیں اچھی بھی ہیں، لیکن ان اچھی چیزوں کو لے لو اور بری چیزوں کو پھینک دو۔ ''خذ ما صفا و دع ما کدر'' اس اصول کے اوپر اگر کام کیا جائے تو ان شاء اللہ ہم منزل تک پہنچ جائیں گے۔

اقبال مرحوم نے بعض اوقات ایسے حسین تبصرے کیے ہیں کہ وہ قوم کے لیے مشعل راہ ہیں۔ مغرب کی ترقی جو کہیں سے کہیں پہنچی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے چند شعر کہے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رکھنے کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

چنگ و رباب یعنی موسیقی کے آلات۔ مغرب کی قوت اس لیے نہیں ہوئی کہ وہاں موسیقی کا بڑا رواج ہے، نہ اس وجہ سے ہوئی کہ بے حجاب اور بے پردہ عورتیں رقص کرتی ہیں۔

نے ز سحر ساحران لالہ روست
نے ز عریاں ساق و نے ز قطع موست

نہ اس وجہ سے ہوئی کہ وہاں حسین عورتیں بہت پھرتی ہیں اور نہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی ٹانگیں ننگی کر رکھی ہیں اور اپنے بال کاٹ رکھے ہیں۔

قوتِ مغرب از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

قوت اگر ہوئی ہے تو علم و فن میں محنت کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسی آگ سے

اس کا چراغ روشن ہے۔ اور پھر آخر میں بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

یعنی حکمت وعلم کپڑوں کی قطع و برید یا تراش وخراش سے حاصل نہیں ہوتا۔ کسی نے پتلون پہن لی تو ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہو گئے۔ اگر شلوار قمیص پہن لی تو پسماندہ ہیں، ترقی پسند نہیں ہیں۔ اگر عمامہ پہن لیا تو اس سے علم و ہنر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، لیکن تم نے چند جواہر کو یہ سمجھا ہوا ہے کہ مغرب کو اس سے قوت حاصل ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں اپنی نسلوں کو اس کے پیچھے چلا کر تباہ کر رہے ہو، لہذا اس سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ یہ ہے حرا فاؤنڈیشن اسکول۔ الحمدللہ! دوسری جگہوں پر یہ توجہ عام ہوئی ہے اور بھی اسکول قائم ہو رہے ہیں۔ جن کا اصل مقصود یہ ہے کہ ہم واپس اس نظام تک لوٹیں

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

کوئی کہے گا کہ یہ رجعت پسندی ہے، لیکن اقبال جیسا ترقی پسند شاعر کہتا ہے کہ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو یعنی ہم اس طرف دوڑیں جو جامعہ القرویین کی بات تھی، جو جامعہ زیتونہ کی بات تھی، ہم اس طرف دوڑیں۔ ہم نے اس غرض کے تحت یہ ادارہ اللہ کے نام پر قائم کیا۔ حضرت والد ماجد صاحب کے ارشاد کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔

نصاب میں وسعت کی ضرورت

صرف ونحو وغیرہ کی کچھ غیر ضروری اور غیر مؤثر کتابیں نکال کر ان کی جگہ نئی کتابیں شامل کی جا سکتی ہیں، نئے فلاسفہ اور اس کے علاوہ قدیم معقولات پر زیادہ زور دینے کے بجائے کچھ کتابیں نئے فلاسفہ اور جدید مغربی فکر کے حوالے سے شامل کرنا ضروری ہے، عربی اور اردو میں ایسی اچھی کتابیں مستقبل کے مدارس کے اساتذہ کو پڑھانا ضروری ہے؛ تاکہ انہیں یہ احساس ہو سکے کہ وہ کس دنیا میں جی رہے ہیں، اور امت مسلمہ کو آج کیا چیلنجز درپیش

ہیں۔ پھر ہمیں امت کی عالمی سطح کی قیادت کی ذمے داری سنبھالنے اداروں اور قانون کی تشکیل نو اور امت کے مستقبل کے لئے نئے نظام وضع کرنے کے لئے ایک اعلی درجے کا اسلامی نصاب درکار ہوگا۔(۱)

اسی تعلق سے حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

یہ بات (یعنی مدارس میں جدید علوم کو شامل کیا جانا چاہئے) ایک حد تک صحیح بھی ہے اور ہم نے اس پر عمل درآمد کرلیا ہے، جدید قسم کے جو علوم وفنون جن سے عقائد پر اثر پڑتا ہے ،خواہ وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے پڑے مگر پڑ رہا ہے، جیسے مبادیات سائنس ہیں، فلسفہ جدیدہ ہے، ہیئت جدی جدیدہ ہے، اس کو لوگ ذریعہ بناتے ہیں، دینیات کی تردید کا، حالانکہ وہ ذریعہ ہیں تقویت دین کا، سائنس جتنی بڑھے گی میں سمجھتا ہوں اسلام کو اتنی تقویت ملے گی، اس لئے اسلام نے عقائد ونظریات کے لحاظ سے جو دعوے کئے ہیں ان کے دلائل سائنس مہیا کر رہی ہے، تو دعوی ہم کرتے ہیں مگر دلائل وہ لوگ مہیا کرتے ہیں جو اس کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کے ہاتھ سے دلائل مہیا کرتے ہیں، اس لئے سائنس منافی تو کیا ہوئی معین ومددگار رہوئی ہے ۔۔۔۔خرابی درحقیقت ماحول کی کیونکہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں جو غلط نظریات اور غلط فکر لئے ہیں اس لئے ان فنون کا اثر برا پڑتا ہے؛ لیکن اگر صحیح پڑھانے والے ہوں تو وہی ذریعہ بن جائیں گے تقویت کا۔۔۔آخر یہ قدیم فلسفہ منطق، ہیئت، ریاضی پڑھاتے ہیں اس کا برا اثر کیوں نہیں پڑا اور موجودہ فنون کا کیوں پڑ رہا ہے،؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں کہ دین ان میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے، اس لئے عقائد پر ذرا برا اثر نہیں پڑتا اور موجودہ زمانے میں عموما پڑھانے والے وہ ہیں کہ نہ ان کی اخلاقی حالت درست نہ ماحول درست اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کا اثر برا ہے، حالانکہ وہ دراصل عالم کا اثر ہے، جو برا پڑ رہا ہے، اسلام میں تنگی نہیں، اسلام نے ہر علم وفن کی تحقیق کی اجازت دی سوائے مخصوص چند علوم کے جن سے روکا ہے کیوں کہ وہ علوم نافع نہیں ہیں۔

---

(۱) حوالہ سابق:۶۸

مدارس کا یونیورسٹیوں سے الحاق

بعض حضرات دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم کے اس بناء پر خواہش مند رہتے ہیں کہ مدارس کی سند کو دوسری یونیورسیٹوں میں تسلیم کرلی جائے، اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو ان یونیورسٹیوں میں داخلہ مل سکے، یا ان سندوں کے حامل طلبہ کو سرکاری اداروں وغیرہ میں ملازمتیں مل سکیں اور چونکہ دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ معادلہ مدارس کے نصاب ونظام میں تبدیلی کے بغیر ممکن نظر نہیں آتا؛ اس لئے وہ اس نظام میں ترمیم کی خواہش رکھتے ہیں۔

ہماری نظر میں یہ طرز فکر بھی درست نہیں، ہمارے نزدیک دینی مدارس کے نصاب ونظام پر خالص اس نقطہ نظر سے غور ہونا چاہئے کہ ایک با استعداد اور صاحب بصیرت عالم دین کی حقیقی ضروریات کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح پوری ہوسکتی ہیں؟ اس نقطہ نظر سے نصاب ونظام میں جن ترمیمات کی ضرورت ہو ان کو بیشک اختیار کیا جائے؛ لیکن محض اس بناء پر ان مدارس کے مزاج ومذاق سے ہٹ کر کوئی تبدیلی کرنا ان کی سند کو دوسری یونیورسیٹیوں یا سرکاری اداروں میں مقبول ہوجائے ان دینی درسگاہوں کی بنیادی روح کے منافی ہے۔

دینی مدارس کی بنیاد جس اخلاص، للّٰہیت ایثار اور خدمت دین پر رکھی گئی تھی اس میں اس بات سے کبھی کوئی بحث نہیں کی گئی کہ ان کی سندیں بازار میں کیا قیمت رکھیں گی؟ اکابر علماء دیوبند میں سے کتنے حضرات تھے جنہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کبھی سند لی ہی نہیں، اس کے بجائے اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کے فارغ التحصیل علماء میں دینی علوم کی اعلیٰ مہارت، اتباع سنت کا جذبہ خشیت وتقوی، انابت إلی اللہ اور جذبہ خدمت دین کس طرح پیدا ہو؟

اور واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس اگر اپنے مطلوبہ معیار کے مطابق کام کریں اور ان سے اسی صلاحیت کے اہل علم پیدا ہوں جس صلاحیت کے علماء کی ضرورت ہے اور جس کی آبیاری ان مدارس کا بنیادی مقصود ہے تو اس بات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ دوسری یونیورسٹیوں میں ”اعلی تعلیم“ حاصل کرنے کے محتاج ہوں، یا

سرکاری اداروں میں اپنی اسناد منظور کرانے کی درخواستیں لئے پھریں، اس کے بجائے ان مدارس کو خود اپنا تعلیمی اور تربیتی معیار بلند کرنے کی فکر کرنی چاہئے اور یقین ہے کہ اگر مطلوبہ معیار حاصل ہو گیا تو تمام دوسرے ادارے چارو ناچار ان کی سند کو تسلیم کرنے پر از خود مجبور ہوں گے۔

ہمارے دینی مدارس جس علم کے امین اور جس مزاج و مذاق کے وارث ہیں، اس میں یہ بات ان کے لئے عار ہے کہ وہ دوسروں سے اپنی علمی استعداد کی شہادت حاصل کرنے کے لئے درخواستیں، اپیلیں یا مطالبے کرتے پھریں، اس علم کا مزاج تو یہ ہے کہ اپنے حصہ کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے بعد انسان اپنی دھن میں لگ جائے، کسی کو ہزار مرتبہ ضرورت پڑے تو وہ اپنی غرض اور اپنی ضرورت سے اس کی طرف رجوع کرے ورنہ اس کو اپنی علمیت منوانے کی چنداں حاجت نہیں، ان کو کبھی کہیں اپنی سند دکھانے کی ضرورت نہیں، اوران کی خدمات کے طلب گار صرف دینی مدارس ہی نہیں؛ بلکہ اعلی یونیورسٹیوں سے لے کر سرکاری اداروں تک اتنے رہے ہیں کہ ان کو کبھی نا قدری کا شکوہ نہیں ہوا۔

لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب انہوں نے اپنے آپ کو پورے اخلاص کے ساتھ زیور علم سے آراستہ کیا، اور صرف نام کے فارغ التحصیل ہونے کے بجائے واقعۃً علوم دین کے لئے اپنی زندگی وقف کردی، انہوں نے دنیا طلبی کے لئے علم حاصل نہیں کیا، بلکہ خدمت دین کو اپنا مشن بنایا، لیکن عملاً یہ ہوا کہ دنیا بھی ان کے قدموں میں ذلیل وخوار ہو کر پہنچی اور معاشی اعتبار سے وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

لہٰذا محض اپنی سند کو تسلیم کرانے کی خاطر دینی مدارس کے نصاب ونظام میں کوئی ایسی تبدیلی کرنا اور جو ان کے مزاج و مذاق سے ہٹی ہوئی ہو، ان مدارس کی روح کے یکسر منافی ہے۔(۱)

---

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۹۰-۹۱

روزنامچہ برائے عالمیت (المذکرۃ الیومیۃ الدراسیۃ)

مَرْحَبًا بطالبِ العلمِ!
إنَ طالب العلمِ تَحَفُّهُ الملائكةُ بأجنحتِها،
ثم يركبُ بعضُهم بعضًا حتى يبلغُوا السماء الدّنيَا
من محبتهِم لما يطلبُ
(أخرجه أحمد والطبرانی باسناد جيد)

اسم الطالب..
اسم الأب ....
اسم المدرسة..
الصّف..
عنوان المنزل ....

تشریح رموز

نمازوں کے خانہ میں	
ت	جو نماز تکبیر تحریمہ کے ساتھ ادا کی جائے، اس نماز کے خانہ میں (ت) لکھا جائے۔
ج	جو نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے، اس نماز کے خانہ میں (ج) لکھا جائے۔
الف	جو نماز انفراداً ادا کی جائے، اس نماز کے خانہ میں (الف) لکھا جائے۔
ق	جو نماز چھوٹ جائے اس نماز کے خانہ میں (ق) لکھا جائے۔
	جو معمول پورا ہو اس پر اس طرح کا نشان (✓) لگایا جائے۔
	جو معمول پورا نہ ہو، اس پر اس طرح کا نشان (✗) لگایا جائے۔
گھنٹوں کے خانہ میں	
م	پہلے مطالعہ ہو چکا ہو تو (م) کا نشان لکھ دیا جائے۔
ذ	سبق کے تکرار و مذاکرہ میں حاضری رہی ہو تو (ذ) کا نشان لکھ دیا جائے۔
ح	گھنٹہ میں حاضر رہے ہوں تو (ح) کا نشان لکھ دیا جائے۔

تاریخ	دن	فجر	ظہر	عصر	مغرب	عشاء	مقدارِ تلاوت	ساعات		
								۱	۲	۳

إذا كنت تحبني حقا علمّني كيف
أزرع القمح ولا تعطني ألف رغيف من الخبز

اگر آپ مجھ سے واقعی محبت کرتے ہیں تو مجھے یہ سکھلائیے کہ
گیہوں کی کھیتی کیسے کی جاتی ہے، مجھے ایک ہزار روٹی مت دیجئے۔

ساعات			خوشنویسی		اتباعِ سنن	مضمون نگاری	تقریر		خارجی مطالعہ	محاسنِ اخلاق و رذائلِ اخلاق
۴	۵	۶	اُردو	عربی			اُردو	عربی		

قال ابن قیم من أراد صفاء قلبه ''فلیؤثر اللّٰه علی شهوته، القلوب المتعلقة بالشهوات محجوبة عن اللّٰه بقدر تعلقها بها''

(الفوائد:۲۶۲)

ابن قیم جوزیؒ نے فرمایا: جو اپنے دل کو نورانی بنانا چاہتا ہے، وہ اللہ کو اپنی شہوتوں پر ترجیح دے، خواہشات میں ڈوبا دل جس قدر نفسانی لذات میں ہوگا، اتنا ہی اللہ سے دور ہوگا۔

۱) ہر ہفتہ اپنے درجات میں ہفتہ کے کسی دن تقریری پروگرام ہو جس میں حصہ لینے والوں کے نام ایک ہفتہ پہلے طئے ہوں، اس میں طلبہ چھوٹی چھوٹی تقاریر، اشعار، نظمیں، کہانیاں، مکالمے، قراءت، قرآن، احادیث، دعائیں وغیرہ پیش کریں۔
اس بات کی کوشش کریں کہ یہ پروگرام بھی درسیات کا معین ہو، پروگرام کی رپورٹ کاپی میں لکھ دی جائے کہ کس طالب علم نے کیا پروگرام پیش کیا، یہ پروگرام جمعرات کے دن آخری گھنٹہ میں ہوگا، بعض مدارس میں جمعرات کے دن جلسہ ہونے پر طلبہ نکل جاتے ہیں، اس صورت میں بجائے جمعرات کے منگل یا بدھ کو آخری گھنٹے میں پروگرام کرنا بہتر ہے، اسی طرح سے جمعرات کے دن مغرب تا عشاء طلبہ کا تقریری پروگرام کرنا بہتر ہے۔

۲) مہینہ میں ایک باران کا اجتماعی پروگرام ہو، اس طرح کہ مہینہ بھر کے پروگرام میں جو ممتاز طلبہ ہوں، ان کو اس پروگرام میں پیش کیا جائے، اس موقع پر ان کو مختصر سا انعام بھی دیا جا سکتا ہے۔

تقریر کی اہمیت

خطابت سنت انبیاء ہے، ہر نبی خطیب اور مقرر تھے، سرکار دو عالم ﷺ انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑے خطیب تھے، علماء چونکہ خصوصا انبیاء کے وارث "**العلماء ورثة الأنبياء**" یہ اس لئے ہے کہ انہیں حضور اقدس ﷺ کی صفت خطابت کا وافر حصہ ملا، اس لئے علماء اور طلباء کے لئے فن خطابت اور تقریر سے آراستہ و پیراستہ ہونا نہایت ضروری

ہے، چونکہ وارث انبیاء ہونے کے ناطے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے طریقہ کی ادائیگی، اور تبلیغ کی غرض سے تقریر سیکھنا چاہئے، کیوں کہ خطابت، موعظت، تقریر اور پند ونصیحت علماء امت کا فریضہ ہے، اسی لئے اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں فرمایا: ''وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ'' نصیحت اور موعظت کیجئے، اس لئے کہ مومن کو نصیحت ہی سے فائدہ ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ تذکیر علماء اور طلبا کا فریضہ ہے، اس لئے تقریر وخطابت پر مشق ہونی چاہئے۔

اللہ عزوجل نے انسان کو جو قوت بیانی اور طلاقت لسانی کی دولت سے نوازا ہے اس کو بے شمار جگہوں پر بطور امتنان واحسان کے ذکر کیا ہے، قوت تعبیر اور طلاقت لسان اور بیان مراد کی قوت واستعداد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ'' (کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے)۔

جب اللہ عزوجل نے حضرت موسی علیہ السلام کو نبی بنا کر فرعون ملعون کے پاس دعوت حق کے لئے بھیجا تو حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے قوت بیانی اور طلاقت لسانی اور بیان مراد کی صلاحیت وقوت کا مطالبہ کیا، کیوں کہ حضرت موسی علیہ السلام کی زبان میں بچپن میں منہ میں انگارا رکھنے کی وجہ سے لکنت تھی، فرعون ملعون نے حضرت موسی علیہ السلام کی زبان کی لکنت کا مذاق کرتے ہوئے اپنی قوم کو ان کی اطاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی جس کو اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: ''أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ'' (۱) کیا میں اس سے بہتر نہیں ہوں جو ذلیل ہے اور صاف صاف بات بھی نہیں کرسکتا۔

حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے مطالبہ کیا کہ ان کے بھائی جو فصیح اللسان ہیں ان سے میری مدد کیجئے، تاکہ میں فریضہ تبلیغ کو خوب اچھی طرح انجام دے سکوں:

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ ○ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ (۲)

(۱) الزخرف: ۵۲ (۲) الشعراء: ۱۲-۱۳

(اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں (میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے
اور میری زبان (اچھی طرح (نہیں چلتی اس لیے ہارون علیہ السلام کے
پاس بھی وحی بھیج دیجئے)

اور اللہ عزوجل نے ان کی زبانی اس بات کو یوں فرمایا:

"وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ" (۱)

میرے بھائی ہارون علیہ السلام بیان میں مجھ سے بہتر ہیں، لہٰذا ان کو میرے ساتھ ارسال کردیجئے تاکہ وہ "زور بیانی" کے ذریعے میری تصدیق کرے اور میرے لئے ڈھال ثابت ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ نے نبوت اور دعوت کے لئے بندے کو منتخب تو کرلیا، لیکن زبان میں لکنت کی وجہ سے "دعوت" کا صحیح حق ادا نہ کرسکوں۔

پھر اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں صحت اور قوت بیانی اور زور سلاست عطا کی، جس کو یوں فرمایا: "قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ" (۲) "فرمایا اے موسیٰ تیری مانگ تجھے عطا ہوئی"۔

زبان ہی یہ دعوۃ الی اللہ کا پہلا وسیلہ ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ" (۳) (اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ انھیں سمجھا سکے) یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجے جاتے تھے؛ تاکہ وہ ان کے سامنے حق کا پیغام عام کریں، دلائل وبراہین کے ذریعہ، فصاحت ووضاحت کے ساتھ مراد حق وندی، مطلوب ایزدی کو بیان کریں۔

"زور بیان" اور خطابت کی اہمیت کے سلسلہ میں "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" کی

---

(۱) القصص:۳۴ (۲) طٰہٰ:۳۶

(۳) ابراہیم:۴

تفسیر کرتے ہوئے حضرت امام ضحاکؒ نے یہاں تک فرمایا کہ ”أی کرمنا ما ینطق“، یعنی اللہ رب العزت نے تمام مخلوقات پر فضیلت دی، نطق اور بیان دے کر، اس لئے ایک جگہ تو صاف ارشاد خداوندی ہے: ” خلق الإنسان علمه البیان“ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے ”بیان“ سکھایا، یعنی زور بیانی عطا کی۔

اور ایک جگہ فرمایا: ” فمن جاهدهم بیده فهو مومن ، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن“ (۱) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ یعنی جو اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو زبان کے ذریعے جہاد کرے وہ مومن ہے۔

اور ایک جگہ فرمایا: ”سئل أی الجهاد أفضل، فقال: كلمة حق عند سلطان جائر“ (۲) اللہ کے رسول اللہ سے دریافت کیا گیا کہ بہتر جہاد کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا۔

خود نبی کریم ﷺ کے تعلق سے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ” ثم إن علینا بیانه“ اے محمد ﷺ قرآن کے الفاظ کو نازل کرنے کے بعد اس کا ”بیان“ بھی ہمارے ذمہ ہے، یعنی ہم آپ کے دل پر ایسے زور بیان ڈالیں گے کہ الفاظ کے ساتھ معانی بھی بیان کردیئے جائیں گے، اور اس لئے آپ ﷺ کا کلام اس قدر فصیح اور جامع ہے کہ سننے والا متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ جاتا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اپنے تعلق سے فرمایا: ”أعطیت جوامع الکلم“، یعنی زور بیانی خود نبی کریم ﷺ کے من جملہ صفات ومحاسن میں سے ہے۔

خطابت ایسی زبردست اور اثر انگیزی کی حامل شیء ہے کہ زور بیان انسان کا اگر باطل پر بھی ہوتو لوگ اس سے متأثر ہوتے ہیں، اس لئے ایک چرب زبان سے حفاظت کے خاطر کہا گیا (ومن الناس من یعجبك قوله فی الحیاة الدنیا) کہ لوگوں میں سے

---

(۱) مسلم، باب بیان کون النهی عن المنكر من المنهیات، حدیث نمبر: ۸۰

(۲) مسند أحمد، مسند أبی سعید الخدری، حدیث نمبر: ۱۱۱۴۳

بعض وہ ہیں جن کی ''زور بیانی'' اور ''چرب لسانی'' آپ کو متاثر کردے۔

اور ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "إن من البيان لسحرا"، یعنی بہت سے لوگوں کے کلام میں اثر انگیزی ہوتی ہے۔

اسلام کے عہد میں سب سے عظیم اور سب سے پہلے خطیب خود صاحب دعوت وشریعت، خاتم الأنبیاء، أفصح العرب حضرت محمد مصطفی محمد مجتبی ﷺ رہے ہیں۔

مصر قاہرہ کے ایک فاضل نے ''خطب الرسول'' ﷺ کے نام سے ''نبی کریم ﷺ کے ۴۷۵ خطبات کو ایک ہی کتاب میں جمع کر کے بڑا عمدہ، کارنامہ انجام دیا ہے، جس میں آپ ﷺ کے فکر انگیز، ولولہ خیز، دلوں میں گداز اور رقت پیدا کرنے والے خطبات شامل ہیں، یہی وجہ تھی کہ اسلام کے ابتدائی دور میں کفار مکہ آپ ﷺ کو 'ساحر'' کہہ دیتے تھے، کوئی ''شاعر'' کہتا، کسی نے ''کاہن'' کہا، یہ اس وجہ سے آپ کا انداز تخاطب اور آپ کی زبان کی سلاست اور فصاحت وبلاغت سے معمور گفتگو اور دلائل وبراہین کا آورد سامع کو آپ کا گرویدہ بنادیتا، اس کے علاوہ آپ ﷺ کو قرآن جیسا عظیم وفصیح کلام عطا کیا گیا تھا، تیسرے یہ کہ آپ ﷺ اخلاق حمیدہ، خصال ستودہ کے مالک تھے، چوتھے: آپ کے قول وعمل میں یکسانیت اور ہم آہنگی تھی، پانچویں: آپ ﷺ کڑھنے والا دل رکھتے تھے۔

آپ ﷺ کے بعد حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بڑے بڑے خطباء گذرے ہیں جن میں حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ، حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عثمان بن عفان، حضرت علی بن ابی طالب، سحبان بن وائل، حضرت امیر معاویہ، ثابت بن قیس، عبداللہ بن رواحہ، عبداللہ بن مسعود، انس بن مالک، اسلع بن شریک بن عوف اشجعی، ثعلبہ بن عبدالرحمن انصاری، عقبہ بن عامر، قیس بن سعد انصاری، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

اس لئے ضروری ہے کہ طلباء کو تقریر کی انجمنوں کا نظام قائم کر کے ان کو خطابت کی مشق دی جائے؛ تا کہ وہ وارثین انبیاء ہونے کی حیثیت سے دعوت دین کے فریضے کو صحیح طریقہ سے انجام دیں سکیں، اصلاح وموعظت کے کاز کو سنبھال سکیں۔

دینی مدارس میں تحریر وتقریر

اکثر مدارس میں طلبہ کی تقریر وتحریر کا کوئی خاص انتظام نہیں، اس میں اہل علم کو عاجز ہونا ان کی منصبی خدمات کا ضعیف ہونا ہے، اسلئے اس کا خاص انتظام واہتمام ضروری ہے۔

اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دیگر عام تعلیم کی طرح خوش تحریری وخوش تقریری کی مشق کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جائے اس طریقہ پر کہ وہ طلبہ کا اختیاری امر نہ رہے؛ بلکہ سب کو اس امر پر مجبور کیا جائے۔(۱)

حضرت اقدس تھانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ: ایک ذریعہ تقریر کا اور ہے یعنی تقریر کی مشق، وہ بھی کیجئے، بحمد اللہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں، اور مدرسہ میں اسباب بھی موجود ہیں، اس کو غنیمت سمجھئے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا اور وقت بھی بعد میں نہ ملے گا، میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کردو؛ بلکہ ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھ کر حاصل کرو، اصل مقصود دین ہے مگر اس کے مختلف طریقے ہیں۔(۲)

طلباء کو تقریر سکھانے کا ایک طریقہ

حضرت اقدس تھانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ: ”میں نے اپنے یہاں یہ انتظام کیا ہے کہ اگر کوئی کافیہ پڑھنے والا ہے تو کافیہ ہی کا کوئی مضمون دے دیا کہ اس کی تقریر کرو، اگر مشکوۃ پڑھ چکا ہے تو کوئی حدیث اسی وقت دے دی کہ اس کی تقریر کرو، اس سے زبان بھی کھل جاتی ہے، یعنی بولنے کا عادی ہوجاتا ہے اور پڑھانے کا ڈھنگ بھی آجاتا ہے اور تعلیم کا نقصان بھی نہیں ہوتا۔(۳)

---

(۱) رہنمائے خطابت: مفتی ابولبابہ شاہ منصور: ۳۰، السعید، پاکستان، کراچی، ماخوذ از تجدید تعلیم: ۴۴، مولانا اشرف علی تھانویؒ

(۲) حوالہ سابق، بحوالہ آداب التبلیغ: ۱۲۱

(۳) بحوالہ کلمۃ الحق: ۱۲۴

ایک بار مجھ سے درخواست کی گئی کہ طلبہ جمعرات کو کچھ تقریر کیا کریں، میں نے اس صورت سے منظور کیا کہ اپنی درسی کتابوں کو ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاؤں اور ان کے مضامین کی تقریر کر دوں، مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور مفاسد سے بھی محفوظ رہیں گے"۔

علماء کے لئے تقریر سیکھنے کی آسان تدبیر

بعض علماء یہ عذر کر دیتے ہیں کہ ہم کو وعظ کہنا نہیں آتا، میں کہتا ہوں کہ: آپ کو عربی پڑھنا کب آتا تھا؟ یہ بھی تو محنت کرنے سے ہی آیا ہے، اسی طرح وعظ کہنے کا ارادہ کیجئے اور کچھ دنوں محنت کیجئے، یہ کام بھی آ جائے گا۔

جس کی سہل تدبیر یہ ہے کہ شروع شروع میں طلبہ کے سامنے مشکاۃ شریف وغیرہ لے کر بیٹھ جاؤ اور کتاب دیکھ کر بیان کرو، پھر کچھ دنوں میں بغیر کتاب کے بیان شروع کر دو، اس طرح ایک دن خوب بیان کرنے لگو گے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جاہلوں کو تو وعظ کی جرأت ہو اور علماء کو اس کی ہمت نہ ہو! جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جہلاء علماء کے سامنے بھی غلط باتیں بیان کرنے سے نہیں ڈرتے۔(۱)

تقریری انجمن کا مکمل نظام

بہت اچھا ہے کہ جماعتِ سوم سے ہر پندرہ دن میں ایک تقریر اردو میں اور ایک تقریر عربی میں لازم قرار دی جائے، درسیات اصل ہیں؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خارجی مضامین سے بالکل صرف نظر یا اس کے مقام و درجہ کو کم کر دیا جائے، ورنہ پنجم سے تو یہ نظام بن جائے، تاریخ نے حضور اکرم ﷺ، خلفاء اربعہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ادباءِ لغت کے خطبات کو محفوظ کر رکھا ہے، اگر اسے ہی یاد کروا دیا جائے تو ابتداء بہتر ہے، پھر موجودہ ائمہ حرم، خطباء کے مطبوعات خطبات سے فائدہ اٹھایا جائے، طالب علم اگر از خود تیاری کر کے تعبیرات و اسلوب پر محنت کرے، از خود اپنی طرف سے تقریر پیش کرتا ہے تو بہتر ہے، محض رٹنے کی عادت پر زندگی بھر اکتفا نہ کرے، ششم، ہفتم کے طالب علم کم از کم اپنی طرف سے تقریر تیار کر کے پھر رٹ کر ہی

(۱) رہنمائے خطابات: مفتی ابولبابہ شاہ منصور: ۳۲، السعید، پاکستان، کراچی

سہی پیش کرسکتا ہے، سامعین طلبہ، الفاظ، مضامین کو نوٹ کررہے ہوں، تقریر پیش کرنے سے پہلے طلبہ عربی انجمن تمام الفاظ کی لغوی تحقیق وطریقہ استعمال کی تیاری کر کے آرہے ہوں، اختتام انجمن پر تلفظ، وابواب کی تصحیح، نگراں استاذ عربی زبان میں ہی انجمن کی ساری کاروائی چلائے، طلبہ انجمن کو باری باری نظامتِ انجمن عربی زبان میں تیاری کر کے آنے کی ترغیب دی جائے۔

مدت تقریر، عنوانِ تقریر، کیفیت وتائثرات نگرانِ اہتمام سے رجسٹر انجمن میں لکھنا چاہئے؛ تاکہ تکرار عنوان یا دراز بیانی نہ ہو، برابر قوامیس ومعاجم کی مراجعت کرتے کرواتے ہوئے ہمیں تھکنا نہیں چاہئے۔ پھر محاسبہ اور مواخذہ کیا جاسکتا ہے، معذرت خواہی بھی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ہی طالب علم پیش کرے، ناغہ ہونے پر بار بار یاددہانی ہونی چاہئے، انجمن کا نظام بالعموم جمعرات کے دن بعد نماز ظہر یا بعد نماز عشاء ہوتا ہے، اس لئے ہفتہ کے دن ہی اناؤنسری ونظامت سنبھالنے والے طالب علم اور قراءت ونعت خوانی کی ذمہ داری قبول کرنے والے طالب علم کو طئے کیا جائے۔

درمیان ہفتہ جائزہ ورہبری کا سلسلہ ختم نہ ہو، افضل ترین طریقہ تو یہ ہے کہ روایتی ورسمی عناوین کے بجائے عصری موضوعات، تقاضۂ وقت سے ہم آہنگ، موقعہ سے مناسبت رکھنے والے عنوان کو طئے کیا جائے، عناوین میں تنوع اور تعدد ہو تو تیار کرنے میں طلبہ کو سہولت ہوجاتی ہے، عناوین طئے نہیں کرنے کی وجہ سے طلبہ بہت زیادہ سہولت پسندی، کام چوری، رواجی عنوان پر جلد تقریر کرتے بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں، ہاں البتہ آسان اور مشکل، دستیاب اور محنت طلب دونوں قسم کے عناوین کا اعلان ہفتہ کے دن کرلیا جائے، خارجی اوقات میں پندرہ دن کے عرصہ میں اس طرح تقریر تیار کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

مقامی زبان میں تقریر وتحریر

اللہ جل جلالہ وعم نوالہ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کو قوم کی زبان عطا فرمائی "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلاَّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ" (۱) مقامی لب ولہجہ میں دعوت دینا ہمیشہ

(۱) سورۃ ابراہیم: ۴

مدعو کو قریب کرنے کا مؤثر اسلوب رہا ہے، خود رسول اللہ ﷺ نہ صرف عربی زبان؛ بلکہ آنے والے قبیلہ کی لغت میں بات کیا کرتے تھے، مسلمہ اصول یہ ہیکہ کوئی بھی زبان، بحیثیت زبان کسی قوم یا مذہب کی نہیں ہوتی، اگر اس زبان کے ساتھ لگے اعتقادات ونظریات اور وہ زبان بولنے والی قوم کے طور وطریقے، اپنائے جائیں تو یہ بات اسلامی نقطہ نظر سے پسندیدہ ہے، مدرسہ میں آنے والے کو عربی، اردو، فارسی اور انگریزی کے ساتھ مقامی علاقائی زبان پر بھی محنت کروانے کی شدید ضرورت ہے، بعض مرتبہ وہ مقامی زبان انکی مادری زبان ہوتی ہے، یا انہوں نے اسے اسکول میں کچھ پڑھا ہوا ہوتا ہے، دجالی میڈ یا وہم وطن لوگوں سے رابطہ اس کے بغیر دشوار ہوتا ہے، بعض تلگو (آندھرا پردیش، تلنگانہ میں) بنگلہ (بنگلہ دیش اور بنگال میں) گجراتی، وٹامل، افریقی مما لک میں فرانسیسی (عربی کے بعد) جانے بغیر لوگوں ارتداد سے بچانا اور گمراہ فکروں سے محفوظ کر رکھنا مشکل ہے، باذوق، اور واقف طلبہ کو مقامی زبانوں میں تقریر وتحریر پر بآسانی تیار کیا جاسکتا ہے، صرف توجہ دہانی اور مستقل عنوان بنانے کی ضرورت ہے۔

طلباء کی تحریری مشق

قلم وقرطاس کی اہمیت بھی روز اول سے مسلم رہی ہے، اللہ عزوجل نے قلم کی اہمیت کو بتلانے کے لئے نہ صرف قلم کی قسم کھائی (کسی چیز کی قسم اس کے مہتم بالشان ہونے پر دلالت کرتی ہے) بلکہ اپنے کلام پاک میں ایک مکمل سورۃ "قلم" کے نام سے نازل کرکے اس کی عظمت اور رفعت کو دوبالا کردیا ہے: "ن، وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ" (۱)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إن أول ما خلق الله القلم" (۲) اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے ابوعمروؒ سے نقل کیا ہے کہ اللہ رب العزت نے ساری کائنات میں

(۱) سورہ ن:۱

(۲) ابوداؤد

چار چیزیں اپنے دست قدرت سے خود بنائی اوران کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا گیا ’’کن‘‘ ہوجا، وہ موجود ہوگئیں، یہ چار چیزیں یہ ہیں: قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام۔(۱)

زبان وقلم کے ذریعہ دلوں پر حکومت کی جاسکتی ہے، اس کے ذریعہ تیغ وتفنگ کے بغیر قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدل دی جاتی ہے، تاریخ کے دھارے کو موڑ دینے میں ان کا کردار عسکری انقلابات سے زیادہ ہے، ان میں وہ طاقت ہے جو بڑی بڑی سلطنتوں اور فلک بوس ایوانوں میں زلزلہ پیدا کردیتی ہے۔

فرق یہ ہے کہ تقریر سے پڑھا، لکھا، ان پڑھ ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی بولنے والے کی حرکات وسکنات، چہرے کی کیفیت، لب ولہجہ اور طرز تخاطب بھی مخاطب پر اثر انداز ہوتا ہے، اور تحریر کی رسائی حاضر سے غائب تک، صدیوں بلکہ رہتی دنیا تک باقی رہ سکتی ہے۔

پندرہ دن میں ہر طالب علم ایک مضمون ضرور لکھے جیسے ہر پندرہ دن میں عربی واردو تقریر کرنا ہے، پندرہ دن میں جو ہفتہ تقریر کا نہ ہو وہی ہفتہ مضمون لکھنے کا بتایا جائے، دیواری پرچہ آویزاں کیا جائے، استاذ کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد اخبارات اور رسائل میں بھی شائع کردیا جائے، ہرگز نقل بازی نہ ہو، چاہے اکابرین اور واردین کے بیانات کی تلخیص اوران کو سپرد قرطاس کیا جائے، اور چاہے روزنامچہ ہی کیوں نہ ہو، ذوق تحقیق، حوالہ نگاری، جمع مواد، نوک وپلک کو درست کیا تو یہ عالم دین بافیض رہتا ہے، دیرپا، دوررس، طریقۂ تبلیغ تصنیف وتالیف ہے۔

تقریر وتحریر کے اہم اور ضروری عناصر

۱۔ زبان دانی

تقریر اور تحریر دونوں کے لئے سب سے اہم چیز زبان دانی ہے، ایک خطیب وقلم کار کے لئے یہ اس طرح سے ضروری ہے جس طرح زندگی کے لئے ہوا اور پانی، دعوت وتبلیغ

(۱) معارف القرآن: ۸/ ۸۵ ۷

اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے شیرین بیانی، دلکشی اور روانی وراثت انبیاء ہے، اور انبیاء کے وارثوں کو کتاب الٰہی میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مد مقابل سے حسن طریق سے مقابلہ کریں: "وجادلهم بالتی هی أحسن، فإذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم" "اور بہتر طریقہ سے ان سے مباحثہ کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے تمہاری دشمنی ہوگی، بہتر اسلوب کی وجہ سے وہ تمہارا دلی دوست ہو جائے گا۔

نیز اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:

"وقولوا للناس حسنا" (اور لوگوں سے اچھی بات کہو)

۲۔مطالعہ ومشاہدہ

ایک مقرر وقلم کار کے لئے زبان دانی کے بعد دوسری اہم چیز مطالعہ اور مشاہدہ ہے، اس کے بغیر وہ اپنے فن کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

۳۔مشق وتمرین

تیسری اہم چیز مشق وتمرین ہے کہ اس کے بغیر زبان وبیان پر قدرت، مطالعہ ومشاہدہ کی وسعت بے معنی ہے کہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے جب کسی مجمع میں بولنے کی نوبت آتی ہے تو گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔

مشق کے دوران صحیح تلفظ، لب ولہجہ میں اتار چڑھاؤ، نیز ایسے حرکات وسکنات پر خصوصی توجہ ضروری ہے یہ چیزیں سامعین پر اثر انداز ہوں۔

۴۔اخلاص اور حسن اخلاق

ان سب کے علاوہ ایک خطیب اور قلم کار کے لئے ان سب سے اہم اور ضروری چیز اس کا کردار اور اخلاق ہے۔

۵۔تجاویز اور مشورے

۱) ہر طالب علم کو خطیب اور قلم کار بنانے کے بجائے ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جائے جنہیں تحریر وتقریر سے مناسبت ہو۔

۲) ان کے معیار کے مطابق ادبی، تاریخی اور سیرت کی کتابوں کا نظم کیا جائے۔
۳) مشہور قلم کاروں کی کتابوں کا خلاصہ تیار کرایا جائے۔
۴) مشہور خطیبوں کی کتابوں، نیز ان کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعے خطیبانہ انداز کی مشق کی جائے۔
۵) رسائل و جرائد اور اخبارات کا مطالعہ کرادیا جائے۔
۶) ان کے درمیان مقابلہ کرایا جائے اور تشجیعی انعامات رکھے جائیں۔(۱)

صحافیانہ مزاج سے گریز

مدرسہ میں تعلیم و تعلم کی صحت مندانہ فضا کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ مدرسہ میں ٹھوس علمی ماحول کا چلن ہو۔ اردو یا عربی میں سرسری اور محض اخذ و اکتساب کے ذریعے روایتی مضمون نویسی یا خام صحافت کاری کے شوق کے پروان چڑھانے کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ اس کے بجائے ٹھوس علمی ذوق کو ترقی دی جائے۔ وجہ یہ ہے کہ مد مقابل افکار و نظریات کے حامل عناصر کے اہل قلم میں سے اگر ایک بڑی تعداد عمومی صحافتی رنگ لیے ہوئے ہے تو ان کی دوسری اقلیت اپنے موضوع پر گرفت رکھنے والی بھی ہے، جسے یونیورسٹیوں اور دوسرے تحقیقی اداروں کی سرپرستی اور رہنمائی میسر ہے۔ اب اگر اتنی بڑی اور منظم تعداد کے مقابلے میں دینی فکر کے حامل افراد کسی گہری ریاضت یا وسعت مطالعہ کی کمی کے ساتھ پنجہ آزمائی کریں گے تو لامحالہ کمزور ہوں گے- بظاہر مدارس میں تحریر و تحقیق کے میدان میں (دو تین مثالوں کو چھوڑ کر) سناٹا طاری ہے اور اگر کہیں اس کا اہتمام ہے تو وہ بھی محض کچے پکے صحافتی اسلوب پر مبنی ہے۔ اس لیے مدارس کے تدریسی اسٹاف کو سرگرم صحافت سے پہلو بچانا ہی چاہیے کیونکہ سطحی، سرسری اور عقبی دروازے کی صحافت کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔ تاہم جدید صحافت اور ابلاغ عامہ کے فکری اور عملی مظاہر پر خصوصی لیکچروں کا اہتمام ضروری ہے۔

---

(۱) معاصر دینی تعلیم، مشکلات و احوال: ۱۴۲

چند مثبت اور منفی پہلو

مثبت پہلو

- روزمرہ پیش آنے والے مسائل پر عوام کی راہنمائی کے لیے فتوی نویسی کا کام تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور سینکڑوں مدارس میں مستقل طور پر دارالافتاء قائم ہیں جن سے لاکھوں مسلمان رجوع کرتے ہیں اور متعلقہ مسائل میں راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔
- اردو اور دیگر زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم اور تفاسیر، احادیث نبویہ اور فقہ کی مختلف کتابوں کی شروحات لکھی جارہی ہیں اور مختلف کاتب فکر کی طرف سے سینکڑوں ضخیم کتابیں اس سلسلے میں سامنے آچکی ہیں۔
- عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات، معاشرت اور دیگر ضروریات پر دینی مدارس کے اساتذہ اور متعلقین کی تصانیف کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد کو ہزاروں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔
- دینی مدارس کی طرف سے دینی، اصلاحی اور تحقیقی جرائد کی اشاعت کی روایت شروع سے قائم ہے اور جو ایشیا کے مجموعی ماحول کو سامنے رکھ کر دینی مدارس کے جرائد کی تعداد کا اندازہ کیا جائے تو وہ یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہوگی۔ ان جرائد میں اپنے اپنے مسلک اور مکاتب فکر کے مابین ترجمانی کے ساتھ ساتھ عام طور پر پیش آمدہ مسائل میں مسلمانوں کی راہنمائی، تاریخی واقعات، بزرگان اسلام کا تعارف، جدید مسائل پر بحث اور فقہی مذاہب اور فکری مکاتب فکر کے مابین مناظرانہ اور مجادلانہ بحث تمحیص کا سلسلہ بھی موجود ہے۔
- کچھ عرصہ سے جدید فکری و علمی مسائل پر اجتماعی بحث تمحیص اور تحقیق ومطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ دیوبندی مکتب فکر میں اس وقت بھارت میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی قائم کردہ فقہ اکیڈمی، دارالعلوم کراچی کے تحقیقاتی علمی کام اور المرکز

الاسلامی بنور کی علمی مجالس و مساعی کو اس سلسلے میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔

- قومی اخبارات میں مختلف مسائل کے حوالے سے دینی مدارس کے اساتذہ اور متعلقین کے مضامین کی اشاعت کا رجحان ترقی پذیر ہے اور اردو اخبارات میں شائع ہونے والے دینی مدارس کے متعلقین کے مضامین کا تناسب اگرچہ ضرورت سے بہت کم مگر پہلے سے بہتر ہے۔
- مختلف دینی مدارس میں تخصصات کے شعبے قائم ہیں جن میں درس نظامی کے فضلاء کو متعین عنوانات پر مطالعہ کرایا جاتا ہے، تحقیق و تالیف کی تربیت دی جاتی ہے ،ان سے مقالات لکھوائے جاتے ہیں اور ان کی تحقیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
- دینی مدارس کے سینکڑوں فضلاء نے اب تک ملک اور بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات تحریر کیے ہیں جو اگرچہ ان یونیورسٹیوں کی نگرانی میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کی اصل اساس دینی مدارس کی تعلیم و تربیت پر ہے۔
- دینی مدارس سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے مکاتیب اور خطوط بھی ہزاروں لوگوں کی تعلیم و تربیت اور فکری و روحانی اصلاح کا ذریعہ بنے ہیں اور بیسیوں شخصیات کے مکاتیب و خطوط اب تک کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔
- بعض بڑے مدارس نے انٹرنیٹ کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اپنی ویب سائٹس قائم کر رکھی ہیں جن کی تعداد بیسیوں میں ہے اور وہ اپنے اپنے دائرے میں محدود سطح پر ہی سہی مگر مصروف کار ہیں۔ ان ویب سائٹس کے ذریعے سے جامعات کا تعارف کرایا جاتا ہے، اپنے اپنے مسلک کی ترجمانی کی جاتی ہے، اس کے ساتھ پیش آمدہ مسائل پر عوام کی راہ نمائی کے لیے خطبات و تقاریر،

مضامین ومقالات اور سوالات کے جوابات کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔

یہ تو وہ چند پہلو ہیں جنھیں تحقیق وتالیف کے میدان میں دینی مدارس کی مثبت کارکردگی کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور جو کسی حد تک یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ دینی مدارس تحقیق وتالیف کے تقاضوں اور اہمیت سے بالکل غافل نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے ذوق، ماحول، فکری دائرے تربیتی پس منظر کے مطابق اس شعبہ میں بھی بہر حال مصروف عمل ہیں۔

منفی پہلو

اب ہم تصویر کے دوسرے رخ کی طرف آتے ہیں جسے تحقیق وتالیف کے میدان میں دینی مدارس کی کارکردگی کے منفی پہلو سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

- دینی مدارس میں تحقیق ومطالعہ کے حوالے سے مسلکی وابستگی اور شخصی عقیدت کو ترجیحات میں فیصلہ کن اولیت حاصل ہے، زیادہ تر وقت اور زور انھی دو ترجیحات میں صرف ہو جاتا ہے اور ترجیحات کے ان اوقات میں بعد کے مراحل کے لیے اکثر اوقات وقت اور صلاحیت، دونوں میں کوئی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔
- فقہی اور مسلکی مباحث کے حوالے سے باہمی مناظرہ مباحثہ میں افہام وتفہیم اور تطبیق ومفاہمت کے بجائے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کا ذوق غالب ہوتا ہے اور اس کے لیے طعن وتشنیع اور تحقیر وتمسخر کی زبان استعمال کرنے میں بھی بسا اوقات گریز نہیں کیا جاتا۔
- تحقیق ومطالعہ کا جدید اسلوب، طریق کار، ذرائع اور بین الاقوامی سطح کے علمی وتحقیقی اداروں کے کام اور طرز سے استفادہ دینی مدارس کے نزدیک ابھی تک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ صرف بین الاقوامی زبانوں سے ناواقفیت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بھی اس کا باعث ہے کہ ہمیں دنیا کے دیگر تمام حلقوں پر علمی اور فکری برتری حاصل ہے اور ہمیں کسی دوسرے حلقہ کے علمی کام سے واقف ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

- دینی مدارس میں عالم اسلام کے علمی حلقوں کی تحقیقات، دوسرے مسالک کے علمی کام اور غیر روایتی علمی مراکز کی تحقیقی مساعی سے استفادہ کو اپنی نفسیاتی برتری کے منافی تصور کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بعد اور فاصلہ قائم رکھنے کو بھی تحفظاتی حکمت عملی کا ایک ناگزیر حصہ بنالیا گیا ہے۔
- بڑے مدارس اور طلباء کے رجحان کو دیکھتے ہوئے اب جگہ جگہ دارالافتاء قائم ہو رہے ہیں اور ان کا دائرہ ضرورت سے زیادہ پھیلتا جا رہا ہے جس سے فتویٰ کی اہمیت اور معیار، دونوں متاثر ہو رہے ہیں۔
- اجتماعی اور قومی مسائل میں بھی تحقیق ومطالعہ اور علمی رائے کے اظہار کے لیے مسلکی دائرہ میں پابند رہنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایسی روایت ابھی جڑ نہیں پکڑ سکی کہ کسی اہم قومی مسئلہ پر مختلف مکاتب فکر کے ذمہ دار علماء کرام مل بیٹھیں، مشترکہ طور پر مطالعہ وتحقیق کا اہتمام کریں اور باہمی مشاورت کے ساتھ اجتماعی رائے کا اظہار کریں۔ اس سلسلہ میں ۳۱ علماء کرام ۲۲ دستوری نکات اور عقیدہ ختم نبوت وناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناگزیر تقاضوں پر اتفاق کے سوا غیر سرکاری پرائیویٹ سطح پر گذشتہ نصف صدی کے دوران میں ہماری دینی تاریخ کا حصہ نہیں بن سکا۔
- دینی مدارس میں تحقیق وتالیف کے ذوق اور صلاحیت کی آبیاری کے لیے کوئی اجتماعی اور ادارتی نظم موجود نہیں ہے۔ یہ کم زیادہ تر رجحان اور ذوق کا رہین منت ہوتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی، سرپرستی اور نگرانی بھی شخصی طور پر ہی ہوتی ہے۔
- دینی مدارس میں لائبریریوں کا نظام ناگفتہ بہ ہے۔ گنتی کے چند مدارس کے علاوہ اکثر مدارس میں یا تو لائبریریاں موجود نہیں ہیں، اور اگر موجود ہیں تو ان میں ضرورت کی اہم کتابیں، بالخصوص مختلف موضوعات پر حوالہ کی کتابیں میسر نہیں ہیں۔ کتابوں کے انتخابات میں شخصی اور مسلکی ذوق کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر کسی مدرسہ کی لائبریری میں کچھ کتابیں پائی جاتی ہیں تو ضرورت، وقت اور سہولت کے مطابق

اساتذہ وطلبہ کی رسائی نہیں ہوتی۔

❁ انسانی سوسائٹی کا معاشرتی ارتقاء، تاریخ، نفسیات، پبلک ڈیلنگ، سیاست، معاشیات، تہذیب وثقافت اور دیگر عمرانی علوم نہ صرف دینی مدارس کی تدریس، تحقیق اور مطالعہ سے خارج ہیں بلکہ ان کی اہمیت وضرورت کا احساس بھی ابھی تک اجاگر نہیں ہو سکا جبکہ خود دینی مدارس کے مقصد قیام اور ان کے مذکورہ بالا اہداف کے حوالے سے یہ علوم انتہائی ضروری ہیں۔

❁ زبانوں کا مسئلہ دینی مدارس میں سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں کی بات تو رہی ایک طرف، عربی زبان بھی صرف کتاب فہمی تک محدود رہتی ہے اور دینی مدارس میں سالہا سال تک پڑھائی جانے والی زبان میں فی البدیہہ گفتگو، خطاب اور مضمون نویسی کی صلاحیت سے فضلاء کی غالب اکثریت محروم ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ مظلومیت کا سامنا اردو کو کرنا پڑتا ہے وہ بطور زبان نہیں پڑھائی جاتی اور زبان کی اصلاح، جدید اسلوب سے شناسائی، محاوروں، ضرب الامثال اور اشعار کے برمحل استعمال کی تربیت اور سلاست وشستگی کا ذوق بیدار کرنے کا کوئی نظم اور اہتمام موجود نہیں ہے۔ بالخصوص مروجہ صحافتی زبان اور اسلوب تو سرے سے دینی مدارس کے ماحول میں اجنبی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھی خاصی علمی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ اور طلبہ سادہ اردو میں مافی الضمیر کے اظہار کے لیے دو تین صفحات کا مختصر مضمون لکھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔(۱)

مضمون نگاری کی مشق کے حوالہ سے مفتی شعیب اللہ خان صاحب فرماتے ہیں:

اسی کیساتھ ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ طلباء کو جس طرح تقریر کی مشق کرائی جای ہے، اسی طرح ''تحریر'' کی مشق بھی کرانی چاہئے، تاکہ آج صحافت کی دنیا پر جو الحاتد

---

(۱) دینی مدارس کا نصاب ونظام، نقد ونظر کے آئینے میں: ۲۹۲۔۲۹۷، ابوعمار زاہد الراشدی، الشریعہ اکادمی، گوجرنوالہ، پاکستان

ودہریت اور جدیدیت کا قبضہ ہو چکا ہے، اور اس کی وجہ سے عوام انلاس ہر وقت علماء مخالف ودین مخالف تحریرات وبیانات پڑھ کر ذہنا وفکرا ان سے مرعوب ومتاثر ہوجاتے اور علماء ومدارس سے بلکہ دین وشریعت ہی سے بے زار ہوجاتے ہیں، اس صورت حال کا تدارک کیا جاسکے۔

آج عام طور پر علماء کے اس میدان سے ہٹ جانے کی وجہ سے الحاد ودہریت زدہ لوگو کا اس پر پوری طرح راج نظر آتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ پروفیسر بشیر حسین جو عام طور ''روزنامہ سالار'' وغیرہ اخبارات میں علماء مخالف ودین مخالف بیانات دینے کے لئے عادی تھے، انہوں نے آج سے تقریبا تیرہ چودہ سال قبل اپنے چند مضامین میں ''مسلم پرسنلاء'' اور شریعت کے احکامات پر سخت اعتراضات کئے، اس وقت احقر نے ''سلار اخبار'' ہی کے ذریعے ان کا کئی قسطوں میں جواب لکھا اور ''روزنامہ سالار'' نے بھی پوری اہمیت کے ساتھ اس کو شائع کیا، جب میرا یہ مضمون شائع ہوا تو اس کے بعد وہی پروفیسر بشیر حسین نے ''سالار'' میں یہ لکھا کہ ''میں سالہا سال سے اخبارات میں لکھ رہا ہوں، مگر یہ پہلا موقع ہے کہ کسی عالم نے میرا جواب لکھا ہو''۔

اس سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج صحافت کی دنیا پر اسی قسم کے لوگوں کا تسلط ہے، اور ان کا جواب بھی دینے والا کوئی نہیں، اگر بروقت ان کا تعاقب کیا جائے تو یہ ضرور میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، چنانچہ الحمد للہ میرے اس جواب کے بعد ان پروفیسر صاحب کا منہ ایسا بند ہوا کہ آج تک کھل نہیں سکا۔

عربی مضمون نگاری کیسے سیکھیں؟

پہلا مرحلہ

اولاً: نحوی قواعد کے مطابق اردو جملوں کو عربی میں منتقل کریں، معلم الانشاء حصہ اول سے مدد لیں اور ہر اردو تمرین کے تحت جتنے جملے وہاں دیئے گئے ہیں، اتنے ہی جملے اپنی جانب سے اضافہ کر کے عربی میں ترجمہ کریں۔

ثانیاً: درسی وغیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی اچھا سا جملہ نظر آجائے تو اسی طرز پر بے شمار جملے لکھیں، یا اس کو دوسرے پیرایہ بیان میں ادا کریں مثلاً آپ نے ایک جملہ لکھا:

عجبا للذین لا یسئمون لذائذ الحیاۃ

اسی طرح اس طرح کے جملے آپ اپنی طرف سے لکھ سکتے ہیں:

عجبا للذین لا یمتنعون عن ارتکاب المحارم

اور

عجبا للذين لا يبذلون أقصى جهودهم لبناء مستقبلهم الزاهر

ثالثاً: کتابچے اور رسائل وجرائد میں کوئی مضمون پڑھیں تو اس کی تلخیص کریں، تلخیص کا فن مضمون نگاری کی سمت پہلا قدم ہے، کسی مضمون کی تلخیص دو حیثیتوں سے ہوسکتی ہے:

(الف) مصنف ہی کے الفاظ وتعبیرات میں تلخیص

(ب) مصنف کے مفہوم ومعنی کی اپنی زبان میں تلخیص

رابعاً: روز مرہ پیش آنے والے مشاہدات اور خود کے ساتھ پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو عربی میں لکھیں یا روزنامہ لکھنے کی عادت ڈالیں۔

کسی عربی لغت کا کتاب کی طرح سے لگن اور سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کریں، میری ناقص رائے میں ’’القاموس الجدید‘‘ یا ’’معجم الحی‘‘ کا مطالعہ طلباء کے لئے بے حد مفید ہے، یہ ایک مختصر عربی لغت جس میں لفظ کی مختصر تشریح کے ساتھ ایک ایک مثال بھی دے دی گئی ہے۔

دوسرا مرحلہ

اولاً: معیاری جملوں کا ترجمہ کریں، اور پہلے مرحلے میں ذکر کئے گئے نکات کی روشنی میں اپنے معیار کو ترقی دیں۔

ثانیاً: ابتداء میں ایسے موضوعات پر مضمون نگاری کی مشق کریں جو خشک علمی اور خالص عقلی

موضوعات سے تعلق نہ رکھتے ہوں، پھر تدریجاً علمی موضوعات کی طرف آئیں، یہاں معلم الانشاء حصہ دوم اور سوم آپ کے لئے بہترین گائڈ بک ثابت ہوگی۔

ثالثاً: جن کتابوں کا مطالعہ کریں، ان کے مفہوم (لب لباب) کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنی کاپی میں قلم بند کریں۔

رابعاً: مختلف مشہور دینی شخصیات پر تعارفی مضمون لکھنے کی ابتداء کریں، اگرچہ بادی النظر میں یہ آسان کام ہے، مگر حقیقت میں سیرت وسوانح کا حق ادا کرنا سب سے دشوار امر ہے۔

خامساً: اس مرحلے میں خطوط نویسی پر زور دیجئے اور روزنامچہ (مذکرہ) یا آپ بیتی پابندی سے لکھتے رہئے۔

تیسرا مرحلہ

اس مرحلہ میں آپ کو ''مضمون نویسی''، ''مقالہ نگاری'' اور ''معیاری (مؤثر اور سلیس) ادبی زبان' میں کتابوں کے ترجمے یا ترجمانی کا کام کرنا ہے، مگر اس سے پہلے چند معرکۃ الآراء تصنیفات اور ان کے جملے کو سامنے رکھ کر دونوں کا ایک ساتھ دلجمعی کے ساتھ مطالعہ کریں۔

راقم اپنی ناقص رائے میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین''، ''معالم فی الطریق'' اور ''مبادی الاسلام'' اور ان کے ترجمے کا مشورہ دے گا کہ ان کے اردو اور انگریزی ترجمے بآسانی دستیاب ہیں، اگر آپ کو تینوں زبانوں سے شغف ہو تو تینوں ترجموں کو ایک ساتھ رکھ کر پڑھئے۔

آپ جب کہ علمی موضوعات پر قلم اٹھانے اور انشائیے تخلیق کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو سب سے پہلے اپنے مضمون کا انتخاب کرنے کے بعد اس پر قدیم وجدید مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے ان میں سے قابلِ ذکر کتابوں کا مطالعہ کریں، اور جب موضوع پر ایک حد تک حاوی ہوجائیں تو نوکِ قلم کو حرکت دیں اور اعتدال کے ساتھ فکر وخیال کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیں۔

عربی مضمون نگاری کے لئے چند راہنما اصول

۱) اپنے موضوع کے انتخاب اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کے بعد اس کے ممکنہ عناصر ترتیب دے لیں، پھر گہرے مطالعے، عمیق فکر اور اہل علم سے تبادلہ خیال

کے بعد ہر ہر جز پر اپنی کاوش کا اظہار کریں۔

۲) عبارت سلیس، سادہ اور دلکش ہونی چاہئے، عبارتوں کو پر تکلف بنانے اور پیچیدہ ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳) خواہ مخواہ ''متروک الالفاظ'' اور ''نامانوس الفاظ'' کا انبار جمع نہ کریں کہ ان کے بوجھ تلے معانی دب کر رہ جائیں۔

۴) از اول تا آخر پوری تحریر میں منطقی ترتیب قائم رہنی چاہئے، گویا ہر فقرہ دوسرے فقرے سے اور ہر ماسبق اپنے لاحق سے لڑی کے دانوں کی طرح مربوط ہو۔

۵) غیر ضروری مترادفات کے استعمال سے اپنی تحریر کو پاک رکھیں، موضوع اور ہیئت دونوں کو متوازن رکھیں، نیز ''غیر ضروری طوالت'' اور ''ناقص اختصار'' کا شکار نہ ہوں۔

۶) انشاء پردازی کی خوبی یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کو اپیل کر سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ عام فہم انداز میں اظہارِ مافی الضمیر کیا جائے؛ لیکن بازاری زبان اور گھٹیا اسلوب سے پرہیز بھی ہو۔

۷) ''تحریر وقلم'' افہام وتفہیم اور پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، لہٰذا جو کچھ لکھا جائے دوسرے کے لئے لکھا جائے نہ کہ اپنے لئے۔

۸) از ابتداء تا انتہا مضمون کے مرکزی نقطہ (مرکزی خیال) سے ہٹنے نہ پائیں، اور ہر آن اپنے موضوع کی اہمیت وحرمت کا خیال رکھیں۔

۹) علاماتِ وقف اور فواصل (قواعدِ املاء) کا دقّت بینی کے ساتھ اہتمام کریں۔

۱۰) اپنے موضوع کو کسی نتیجے پر پہنچا کر ختم کریں اور تمہید وخاتمہ میں منطقی ربط اور نتیجہ خیزی پیدا کریں۔

۱۱) اہل زبان کے محاورے، مؤثر وشگفتہ جملے، بلیغ وفصیح ترکیبیں، اساتذۂ فن کے موضوع اشعار، اہل فکر ونظر کے اقوال، قرآن وحدیث کے واضح ہدایات سے اپنی بات کو تقویت پہنچائیں۔

عربی مضمون نگاری کے ضروری شرائط

☆ انسانی عادات کی طرح سے خارجی مطالعے کی عادت ڈالیں اور معیاری ومقصدی کتب ورسائل کا مطالعہ کریں۔

☆ اہل علم وارباب ِ ذوق کی صحبت سے فیض حاصل کر کے اپنے علمی اورادبی ذوق کو فروزاں اوراپنی تنقیدی صلاحیت کو پروان چڑھائیں۔

☆ متعلقہ موضوع پر زیادہ سے زیادہ ٹھوس معلومات جمع کرنے کی کوشش کریں۔

☆ ہر مطالعہ، مشاہدہ یا مکالمہ کے حسن وقبح پر غوروفکر کرنے کی عادت ڈالیں۔

☆ متعلقہ موضوع کے حوالے سے کوئی نئی چیز کو ترتیب دینے کی کوشش کریں اور تکرار کی کلفت سے دور رہیں۔ہاں اگر تکرار کی غرض ''تذکیر (یاددہانی) ہوتو پھر جدت آفریں اسلوب اورمؤثر لب ولہجہ اپنائیں۔

آخر میں یہ نہ بھولیئے کہ آپ ایک زندہ قوم اور جغرافیائی حدود سے بالا تر بین الاقوامی سچے دین کے پیروکار ہیں، اس طرح سے آپ اس کے پیغام کے امین وعلمبردار ہیں؛ لہٰذا آپ کی زبان وقلم اورساری توانائی وصلاحیت کو اسی پیغام کے پھیلانے میں خرچ ہونا چاہئے اوراسی پیغام کا خادم ہونا چاہئے۔(۱)

عربی اردو خوش خطی کی اہمیت

زبان وقلم کا استعمال شریعت اسلامیہ کا ایک حکم ہے، ایک آدمی اپنی فکر کی ترسیل جس طرح بول کر کرتا ہے، اسی طرح اپنی فکر کی ترسیل کے لئے قلم کو بھی ذریعہ اور وسیلہ بناتا ہے، اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ قلمی تحریر کی بناوٹ قابل قبول ہو، خط اورتحریر نہایت صاف ستھری ہو، کم ازکم اتنی صفائی تو تحریر میں ہونا چاہئے کہ لکھا پڑھا جاسکے۔

حضرت مولانا نورعالم خلیل امینی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''حسن خط انسان کا بہت خوب صورت زیور ہے، میں تو کہا کرتا ہوں کہ

(۱) شائقین عربی کے لئے تحفہ، عربی مضمون نگاری کیسے سیکھیں: ۱۲=۲۱

کسی پڑھے لکھے آدمی کے لئے زیب نہیں دیتا کہ وہ بدخطی کے مرض میں مبتلا ہو، اگر خدانخواستہ مبتلا ہوتو اسے ''زوداثر دواؤں'' کے ذریعے اس کا ازالہ کرنا چاہئے، طالب علمی کے زمانے میں، میں حسنِ خط کا اس درجے رسیا تھا کہ جس طالب علم؛ بلکہ عالم کا خط برا دیکھتا تھا تو مجھے اس کے علم کے متعلق بدظنی ہوجایا کرتی تھی اور مجھے یہ خیال ہوتا کہ اس کو کچھ بھی اتا پتا نہیں ہے، یہ جاہل مطلق ہے، جب اس نے اپنا خط درست نہیں کیا، سطریں ٹیڑھی میڑھی ہوتی ہیں، حد یہ ہے کہ املاء تک درست نہیں ہے تو اس نے خاک پڑھا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔میرا یہ یقین ہے کہ بدخطی اندرونی نفسیاتی اورذہنی خامیوں، انتشاراور بے ترتیبی کی عکاسی ہوتی ہے''۔(۱)

حسن خط یہ وہ وصف ہے جس سے متصف انسان کی لوگوں کی نگاہوں میں قدر واہمیت ہوتی ہے، اس سے یہ اپنے مقاصدمیں کامیابی حاصل کرتا ہے، اپنے مطالب کو حاصل کرتا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: والد کے اپنی اولاد کے حقوق میں سے یہ ہے کہ وہ اس کو لکھنا سکھائے "أن یعلمه الکتابة" اس کا اچھا نام رکھے، اوراس کے بالغ ہونے پر شادی کردے۔(۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "الخط الحسن یزید الحق وضوحا" (حسن خط یہ حق کو اور زیادہ واضح کرتا ہے)۔(۳)

افلاطون نے کہا ہے: ''الخط عقال العقل'' (خط یہ عقل کی گرہ ہے)۔

یہ بھی قول ہے کہ خط اور کتابت اور تحریر ہی کے ذریعے نوع انسانی کی خاصیت

---

(۱) حرف شیریں: ۸۷۔۸۸

(۲) الدیلمی

(۳) مرجع الطلاب فی الخط العربی: ۳۶، خالد محمد المصری الخطاط

بالفعل ظاہر ہوئی ہے، اس کی وجہ سے وہ سارے انسانوں سے ممتاز ہوا ہے، اسی سے احوال منضبط ہوئے، احوال درست ہوئے، مختلف زمانوں میں علوم محفوظ ہوئے، عادات واطوار نقل ہوئے، ایک زمانے کی خبریں دوسرے زمانے میں منتقل ہوئیں۔

یہ بھی قول ہے کہ: تمام علوم رہنمائی اور دلالت سے حاصل ہوتے ہیں: یا تو اشارہ سے، یہ یا الفاظ کے ذریعے یا خط اور تحریر کے ذریعے، اشارہ مشاہدہ اور دیکھنے پر موقوف ہوتا ہے، الفاظ مخاطب کی موجودگی اور اس کے سننے کے طالب ہوتے ہیں، خط اور تحریر کسی چیز پر موقوف نہیں ہوتے، ان کا نفع بھی عام اور تام ہوتا ہے۔

ابراہیم بن محمد شیبانی کہتے ہیں: خط اور تحریر یہ ہاتھ کی زبان ہے، ضمیر کی پکار ہے، عقل کی سفیر، فکر کی وصی اور معرفت کی تلوار ہے، بھائیوں کے لئے جدائیگی کے وقت انس کا ذریعہ، مسافت کی دوری پر گفتگو ہے، راز کا خزانہ ہے۔

خط اور تحریر کی قباحت اور برائی کے تعلق سے قول ہے: خط اور تحریر کی قباحت اور بدنمائی دو میں سے ایک قسم کا عیب ہے، خط اور تحریر کی بدنمائی ادیب کا عیب ہے، اور یہ قول ہے کہ یہ ادیب کا کوبڑا پن ہے:۔

عبداللہ بن طاہرؒ نے کسی کاتب کے بھونڈے خط کو دیکھا تو کہا: اس شخص کو دیوان کے منصب سے دور کردو، چونکہ اس کی تحریر درست نہیں ہے، اس کی تحریر سے کسی پر زیادتی اور ظلم ہوسکتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: تحریر یہ ہاتھ کی زبان ہے۔

جعفر بن یحیٰؒ کہتے ہیں: یہ حکمت کی لڑی ہے، جس سے اس کے شذرات کی تفصیل بیان ہوتی ہے، اس کی موتیاں پروئے جاتے ہیں۔

تحریر خوبصورت نہیں تو کم از کم قبول صورت اور قابل فہم تو ہونی چاہئے، بدخطی ایذاء قاری ہے، اہمیت دے کر پورے مدرسے سے اور بالخصوص ابتدائی جماعتوں میں بدخطی سے توبۂ نصوح کی پر جوش مہم چلانا چاہئے۔

بیت بازی

حفظ اشعار کی اردواور عربی ادب کے سیکھنے میں بہت زیادہ اہمیت وافادیت ہے، حفظ اشعار سے تکلم اور زبان دانی میں عبور اور کمال ہوتا ہے، مدارس میں بیت بازی کے مقابلے کرائے جاتے ہیں، پہلی جو شعر کہا جاتا ہے، اس کے آخری والے حرف سے دوسرا فریق شعر کہتا ہے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے ۔

بیت بازی کے شرائط اسطرح ہوتے ہیں:

۱۔ یہ بیت بازی اردو یا عربی کی فصیح وبلیغ زبان میں ہوگی۔

۲۔ اور بیت بازی میں پیش کردہ اشعار مشہور شعراء کے ہوں گے۔

۳۔ بیت بازی میں شرکت کرنے والوں کی زبان کی صحت، تکلم کی قدرت اور معنی کی ادائیگی پر طاقت ضروری ہوگی۔

۴۔ بیت بازی میں لچر اشعار نہ کہے جائیں، عمومی آداب، اخلاق اور دین حنیف کے بنیادی اصول کو ملحوظ رکھ کر بیت بازی کا مقابلہ منعقد ہوگا۔

اس بیت بازی اور مقابلہ شعر کے لئے اردو عربی وغیرہ میں بہت ساری کتاب دستیاب ہیں جو ''بیت بازی'' اور ''المساجلۃ الشعریہ'' کے عنوان سے لکھی گئی ہیں ۔ اس کی ہمت افزائی کی جانا چاہئے، تاکہ بچوں کو اشعار جو کہ صنف ادب کا عظیم پہلو ہوتا ہے اس کا بڑا ذخیرہ دینیات واخلاقیات وغیرہ پر مشتمل ان کو محفوظ ہوجائے اور وہ زبان دانی اور تکلم پر اور موقع بموقع اشعار کے استعمال کے ذریعے اپنی تحریر وتقریر کو جلا اور قوت بخش سکیں۔

رموز واوقاف

معانی کو دوسروں تک پہنچانے میں ممد ومعاون ایک دوسری چیز رموز واوقاف ہیں، رموز واوقاف کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر اس کا حد درجہ صحیح صحیح خیال واستعمال نہ کیا جائے تو مثبت سے منفی، سوال سے جواب اور ایجاب سے سلب کا معنی ولبادہ اوڑھ لیتا ہے اور قاری عبارت وجملوں کا مطلب بالکل اس کے برعکس سمجھتا ہے جو کاتب یا رائٹر لکھنا چاہ رہا ہے، رموز اوقاف

کی اہمیت عربی، اور دنیا کی دوسری قابلِ لحاظ بولی اور لکھی جانے والی زبانوں میں ہے۔

رموزاوقاف

شمار	رموزاوقاف	اردونام	انگریزی نام	عربی نام
۱	،	چھوٹا ٹھراؤ، سکتہ	COMME	الشولۃ
۲	;	ٹھہراؤ، وقفہ	SEMECOLON	الشولۃ المنقطوطۃ
۳	.	وقف تام، وقفہ	FULL STOP	النقطۃ
۴	:	رابطہ	COLON	النقطتان
۵	؟	سوالیہ نشان	SIGN OF IMTEROGATION	علامۃ الاستفہام
۶	!	ندائیہ، فجائیہ	NOTE OF EXCLAMATION	علامۃ الاستفہام
۷	-	خط	DASH	الشرطۃ
۸	‘‘ ’’	واوین	INECRTED COMMAS	التضبیب
۹	()	بین القوسین	BRACKETS	القوسان الہلالان

یہاں زیادہ استعمال میں آنے والی علامات اور رموز واوقاف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ا۔سکتہ(،)

یہ علامت بہت زیادہ استعمال کی جاتی ہے، اس کے استعمال کا ضابطہ یہ ہے کہ مختصر ترین وقفے کی علامت کے طور پر اسی کا استعمال کیا جاتا ہے، متکلم کی جس جگہ سانس ٹوٹ جائے؛ لیکن ٹھہرے نہیں وہاں پر سکتے کی یہ علامت (،) استعمال ہوگی، عبارتوں میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے استعمال کی جگہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱) الفاظ معطوفہ کے درمیان: مثال کے طور پر: مروت، نرمی، خوش اخلاقی، نرم دلی اور خیر خواہی کے ذریعہ کسی کا بھی دل جیتا جاسکتا ہے، ایک ضروری بات ذہن نشین رہے کہ الفاظ مفردہ جب عربی میں استعمال ہوں تو وہاں پر ہر لفظ کے بعد "واؤ" اور (،) کاما دونوں آئے گا؛ لیکن اردو میں ہر جگہ ہر لفظ کے بعد (،) آئے گا، اخیر میں صرف اور آئے گا، کاما (،) نہیں آئے گا۔

۲) مختلف جملے ایسے استعمال ہو رہے ہیں جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں تو ان سب جملوں میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان (،) کاما استعمال ہوگا۔
مثال: قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اسلام خدا کا آخری دین ہے، حدیث رسول شریعت کی تشریح ہے اور عربی زبان پر دسترس ہے، کتاب وسنت کو صحیح طور پر سمجھنے کی شاہِ کلید ہے۔

۳) شرط وجزاء کے درمیان (،) کاما آتا ہے، جیسے: اگر ہم جانتے داغ جدائی، نہ کرتے اتنی الفت تم سے بھائی۔

۴) طویل جملے کے مختلف اجزاء کے درمیان، مثلا: تم مدرسے سے بازار گئے، بازار سے ریلوے اسٹیشن گئے، وہاں سے پوسٹ آفس گئے، اب پوسٹ آفس سے گھر آئے۔

۵) کسی نثر و نظم میں الفاظ کی الٹ پھیر، یا کلام کی طوالت سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو دور کرنے کے لئے بھی اہل زبان (،) استعمال کرتے ہیں جیسے: نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے۔ طراوت چمن وخوبی ہوا، کہے۔
دوسری مثال: تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابر بہار۔

۲۔ وقفہ (؛)

وقفہ کا استعمال ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں پڑھنے والے کو سکوت کے ساتھ، سانس لینے کی بھی اجازت ہو۔

(الف) کئی الفاظ کے درمیان جب سکتے کی علامت (،) لگی ہو تو جملے کے آخری جزو سے

قبل، وقفے کی علامت (؛) استعمال کرنے کی حاجت ہوتی ہے، مثلاً: لکھنو، فیض آباد، مراد آباد؛ یہ بھی یو پی کے بڑے شہر ہیں۔

(ب) اگر جملے کے مختلف اجزاء پر زیادہ زور مطلوب ہو تو وہاں بھی وقفے (؛) کا استعمال کیا جائے گا، مثلاً:

آنا، تو خفا آنا؛ جانا، تو رلا جانا　　آنا ہے، تو کہا آنا، جانا ہے، تو کہا جانا

(ج) جب جملوں کے ایسے دو حصوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا ہو جن میں اندرونی طور پر سکتہ (،) موجود ہو، تو وقفے کی علامت (؛) استعمال کی جائے گی۔

جیسے: مولانا وحید الزمان کیرانوی کی القراءۃ الواضحہ اول، القراءۃ الواضحہ دوم، القراءۃ الواضحہ سوم، مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ کی مفتاح العربیہ اول، مفتاح العربیہ دوم، عربی زبان وادب کی بہترین کتابیں ہیں۔

۳۔ختمہ: (.) = (۔)

اس علامت کا استعمال جملہ مکمل ہونے پر کیا جاتا ہے، اس علامت کو عربی اور انگریزی میں نقطہ (۔) رکھ کر لکھتے ہیں اور اردو میں چھوٹا ڈیش (۔) لگا کر، مثال: You write a letter. اکتب رسالۃ ۔۔۔۔۔۔۔۔اور اردو میں: میں ایک خط لکھ رہا ہوں۔

۴۔رابطہ (:)

اس علامت کو قول یا کہاوت کے بعد اس طرح (:) یا کسی جملے کی تفصیل سے پہلے یا مفصل کے اجمال سے پہلے، اس علامت (:) کا استعمال ہوتا ہے

مثلاً: نبی کریم ﷺ کا قول ہے: ”من ساوی یوماہ فھو فی الخسران“ جس آدمی کے دو دن (نیک عمل میں) برابر ہو گئے وہ بھی گھاٹے میں ہے (اس کو اگلے دن گذشتہ سے زیادہ نیکی کرنا چاہئے)۔

کیا خوب سودا ہے: اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے

(نظیر اکبر آبادی)

یہی آئین قدرت ہے ، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل پر گامزن ، محبوبِ فطرت ہے

(علامہ اقبال)

۵۔سوالیہ نشان (؟)

سوالیہ جملوں کے آخر میں استعمال کرتے ہیں، مثلا: کیا آپ مسجد جارہے ہیں؟، کیا تم ایک نیکی کو رائیگاں سمجھتے ہو؟

۶۔ندائیہ، فجائیہ (!)

(الف) یہ علامت منادی کے بعد لگائی جائے گی، مثلا:

حضرات! سامعین! پیارے بچو!

جس کو پکارا جائے وہ ''منادی'' کہلاتا ہے،

(ب) ناراضگی ، حقارت، اظہار تعجب ، خوف یا نفرت کے موقعوں پر ایک سے زیادہ علامت (!) استعمال کی جاتی ہے، مثلا:

میں اور بزم مے سے تشنہ کام آؤں!

سبحان اللہ! بہت خوب! معاذ اللہ! زیادہ تعجب اور نفرت کے موقعے پر ایک سے زیادہ علامتیں بھی لگا سکتے ہیں:

مثلا: سنا ہے کہ بلی دودھ کی حفاظت کررہی تھی!!!

۷۔خط (-)

(الف) جملہ معترضہ کے شروع اور آخر میں اس علامت کو استعمال کرتے ہیں، مثلا: اللہ تعالیٰ نے ہی- جو رحیم وکریم ہے-ہمیں پیدا کیا ہے۔

(ب) کسی لفظ کی تشریح میں، کئی الفاظ لکھیں جائیں تو بھی (-) یہ علامت استعمال کی جاتی ہے، جیسے: پورا شہر- درخت، مکان، سڑکیں-سخت کہر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

۸۔ واوین (‘‘ ’’)

(الف) کوئی اقتباس، یا کسی تحریر، یا قول نقل کرنا ہو تو واوین (‘‘ ’’) کا استعمال ہوتا ہے، مثلاً: فضائل اعمال: ۲۵۶/۱ پر شیخ زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں: ’’ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اس کے پاؤں میں پھوڑا نکل آیا، طبیبوں نے کہا: اگر ان کا پاؤں نہ کاٹا گیا تو ہلاکت کا اندیشہ ہے، ان کی والدہ نے کہا: ابھی ٹھہر جاؤ، جب یہ نماز کی نیت باندھ لیں تو کاٹ لینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، ان کو خبر بھی نہ ہوئی‘‘۔

(ب) کوئی خاص نام، جگہ، شہر، یا کوئی خاص اصطلاح ہو تو اس کو بھی واوین میں لکھتے ہیں، جیسے: ہندوستان کے شہر ’’بجنور‘‘ میں فسادات کا بازار گرم کیا گیا، ’’اسلام‘‘ کو ’’دہشت گرد‘‘ کہا گیا۔

۹۔ قوسین ( )-[ ]-{ }

(الف) جملہ معترضہ طویل ہو اور ان کے درمیان سکتوں کا استعمال کیا گیا ہو تو قوسین ( ) استعمال کرتے ہیں، جیسے: دار العلوم دیوبند کے حادثے سے (جس کو ذرائع ابلاغ نے خوب اچھالا، کچھ سمجھدار مسلمانوں نے بھی حصہ لیا) سب سے زیادہ تکلیف مسلمانوں ہی کو ہو سکتی ہے اور ہوئی۔

(ب) کسی وضاحتی جملے کو قوسین میں لکھتے ہیں، جب کہ اس کی طرف توجہ دلانا ہو جیسے: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اکثر کتابیں (جو مطبوعہ اور متداول ہیں) میرے کتب خانے میں ملتی ہیں۔

مطالعہ، لغت میں پڑھنے کو کہتے ہیں؛ لیکن مدارس کی اصطلاح میں سبق پڑھانے یا پڑھنے سے پہلے کو مطالعہ کہتے ہیں۔ جس طرح ایک دریا اور سمندر میں غوطہ زن اس کی گہرائیوں میں پہنچ کر نادر اور نایاب گوہر حاصل کرتا ہے، اسی طرح بحرِ علم وحکمت کا غواص، جب اس میں غوطہ زن ہوتا ہے تو یہ شخص بے شمار نکات اور معلومات کو اپنے دامن میں بھر لیتا ہے، اسی کو ''مطالعہ'' یا ''کتب بینی'' کہتے ہیں۔

مطالعہ کی اہمیت

ایک شہسوار قلم کے لیے مطالعہ اتنا ضروری ہے جتنا انسانی زندگی کی بقا کے لیے دانا اور پانی کی ضرورت ہے، مطالعہ کے بغیر قلم کے میدان میں ایک قدم بھی بڑھانا بہت مشکل ہے، علم انسان کا امتیاز ہی نہیں، بلکہ اس کی بنیادی ضرورت بھی ہے، جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ یہی مطالعہ ہے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے معاشرے کی تعمیر ترقی کا فریضہ بھی اہم ہے، اس لیے مطالعہ ہماری سماجی ضرورت بھی ہے۔ اگر انسان اپنے اسکول ومدرسہ کی تعلیم مکمل کرکے اسی پر اکتفا کرکے بیٹھ جائے تو اس کے فکر ونظر کا دائرہ بالکل تنگ ہوکر رہ جائے گا۔ مطالعہ استعداد کی کنجی اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا بہترین آلہ ہے۔ یہ مطالعہ کا کرشمہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اپنی معلومات میں وسعت پیدا کرتا رہتا ہے اور زاویہ فکر ونظر کو وسیع سے وسیع تر کرتا رہتا ہے۔ مطالعہ ایک ایسا دوربین ہے جس کے ذریعے انسان دنیا کے گوشہ گوشہ کو دیکھتا رہتا ہے، مطالعہ ایک طیارے کی مانند ہے جس پر سوار ہوکر ایک مطالعہ کرنے والا دنیا کے چپے چپے کی سیر کرتا رہتا ہے اور وہاں کی تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی احوال سے واقفیت

حاصل کرتا ہے۔شورش نے کہا: کسی مقرر کا بلا مطالعہ تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسا بہار کے بغیر بسنت منانا، یا لو میں پتنگ اڑانا۔ یہ تو ایک مقرر کے سلسلے میں بات تھی، لیکن ٹھیک یہی صورت ایک قلم کار کی بھی ہے۔

مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں: آج لوگ لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہو گئے، جس کے نتیجے میں تحریر کی اثر آفرینی ختم ہوگئی ہے، اس لیے تحریر کو مؤثر بنانے کے لیے ضرورت ہے کہ ایک ایک صفحہ کو لکھنے کے لیے سو صفحات کا مطالعہ ہو۔ پروفیسر عبد المغنی کہتے ہیں: مطالعہ کی غرض علم کا حصول اور راہ عمل کی تلاش ہے۔شیشی کے اندر اگر مشک ہو تو کھولنے کے بعد خوشبو ضرور پھیلتی ہے، اسی طرح جب ایک قلم کار کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہوتا ہے تو اس کی تحریر میں قوت اور اثر ہوتا ہے، ورنہ تحریر کمزور، پھسپھسی اور بے جان ہوتی ہے۔عربی کا ایک مشہور محاورہ ہے: زمانے کا بہترین دوست کتاب ہے۔ اسی کو شورش مرحوم نے اس طرح کہا ہے: کتاب سا مخلص دوست کوئی نہیں۔ اسی طرح ایک مفکر کہتا ہے: کتابوں کا مطالعہ انسان کی شخصیت کو ارتقا کی بلند منزلوں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ، حصول علم و معلومات کا وسیلہ اور علمی تجرباتی سرمایہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے اور ذہن و فکر کو روشنی فراہم کرنے کا معروف ذریعہ ہے۔کتابوں سے جہاں معلومات میں اضافہ اور راہ عمل کی جستجو ہوتی ہے وہیں اس کا مطالعہ ذوق میں بالیدگی، طبیعت میں نشاط، نگاہوں میں تیزی اور ذہن و دماغ کو تازگی بھی بخشتا ہے۔

مطالعہ کن کتابوں کا ہو؟

مطالعہ ایسی کتابوں کا ہو جو نگاہوں کو بلند، سخن کو دل نواز اور جاں کو پرسوز بنا دے، اگر مطالعہ فکر کی سلامت روی، علم میں گیرائی اور عزائم میں پختگی کے ساتھ ساتھ فرحت بخش اور بہار آفریں بھی ہو تو اسے صحیح معنوں میں مطالعہ کہا جائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ آج کا دور انتہائی ترقی پذیر اور مسابقہ کا دور ہے، ذرائع ابلاغ و ترسیل کی بہتات ہے اور سہولیات کی بھی کمی نہیں ہے، ایسے ہی طرح طرح کے اخبارات و رسائل اور کتابوں کی بھی فراوانیاں ہیں۔

اب ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کتابوں کی اس ریل پیل اور جنگل میں کن کا مطالعہ کیا جائے اور کن کو چھوڑا جائے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ یہ ممکن نہیں، اس لیے کہ نہ ہر کتاب قابل مطالعہ ہے اور نہ ہی تمام کتابوں کے مطالعہ کرنے کی انسانی زندگی میں گنجائش۔ اس لیے انتہائی چھان پھٹک کر کتابوں کا انتخاب ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی انتہائی ضروری ہے کہ کتاب ایمان سوز اور اخلاق سوز نہ ہو، اس لیے کہ مطالعہ ہی کے غلط رخ نے عبدالماجد کو ارتداد کے گڑھے میں ڈھکیل دیا تھا، لیکن بعد میں اسی شخص کے مطالعہ کی سمت جب درست ہوئی تو عبدالماجد مولانا عبدالماجد ہو گئے اور مفسر قرآن اس شخصیت کے نام کا جزو لاینفک بن گیا، صحت مند مواد اور مستند مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ ہی کا کرشمہ کہنا چاہیے کہ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ (نومسلم) دس بارہ سال ہی کی عمر میں اسلام کی طرف مائل ہو گئے تھے؛ اس لیے معتبر و مستند مصنفین ہی کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں مولانا یعقوبؒ کے حوالہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ شاہ ولی اللہؒ کا ایک مقولہ نقل کرتے ہیں: جب کسی کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرو تو پہلے اس کے نام کو دیکھو، اگر نام ہی اصل مضمون کے مناسب نہ ہو تو اس کو چھوڑ دو، پھر تمہید کو دیکھو، اگر وہ کتاب کے مضمون کے مناسب نہیں ہے تو چھوڑ دو، اس کے مطالعہ میں وقت ضائع نہ کرو، جب نام اور تمہید میں مناسبت دیکھ لو تب آگے بڑھو۔ اس سلسلے میں ایسے اساتذہ کی رہنمائی بھی بڑی کارآمد ہوتی ہے جن پر مطالعہ کرنے والے کو مکمل اعتماد ہو، رہنما ایسا ہونا چاہیے جو بذات خود ہر اعتبار سے ایک پیاسے کی تشنہ لبی کو دور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو۔

مفکر اسلام ممتاز عالم دین مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں: مطالعہ کو وسیع کیجیے اور اس کے لیے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی اصلاح سے اور ان اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے، ان سے مشورہ لیجیے۔ اسی طرح اس پگڈنڈی پر انتہائی سبک روی سے چلنے کی ضرورت ہے۔

مولانا ندویؒ مزید فرماتے ہیں: یہ ایک پل صراط ہے، اس پر سبک روی اور بہت احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت جیسی عظیم المرتبت آسمانی کتاب کے مطالعہ سے منع فرما دیا تھا۔ مطالعہ کے بنیادی مواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یسین صدیقی ندوی کہتے ہیں: مطالعہ میں ہدایت نبوی کے مطابق سب سے اچھی چیزیں لے لیں اور بری چیزیں چھوڑ دیں، اس میں انصاف سے کام لیں کہ یہی خیر کا دروازہ ہے۔ ایسے ہی انسانی زندگی کے محدود ہونے کی وجہ سے تمام موضوعات کا احاطہ مشکل ہے، البتہ ہر موضوع سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے۔

چنانچہ نعیم صدیقی صاحب رقم طراز ہیں: بنیادی طور پر قرآن وحدیث اور ان سے متعلق علوم پر جس حد تک ممکن ہو نگاہ ہونی چاہیے پھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت پر نظر ہونی چاہیے ضروری ہے مطالعہ کا سفر کرنے والا ہر شخص کم از کم اپنے ملک اور اپنی قوم، بلکہ اپنی تہذیب کے ادبیات سے واقف ہو۔ جس طرح کتابوں کے انتخاب کا مرحلہ بڑا نازک ہے اسی طرح مطالعہ میں ترتیب کی رعایت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس لیے مطالعہ کے معیار کو بتدریج بڑھایا جائے، ایسا نہ ہو کہ نورانی قاعدہ پڑھا نہیں اور قرآن شریف ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ طریقہ کار مطالعہ ایک خوب صورت گلشن کی مانند ہے، اس میں خوشبو بھی ہے، دل آویزی بھی ہے اور خاردار شاخیں بھی ہیں۔ ایک طرف جہاں مطالعہ کی اہمیت مسلم اور افادیت قابل ذکر ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے مواد میں انتہائی چاق وچوبندی ناگزیر ہے۔ اسی طرح اس کے طریقہ کار سے بھی واقفیت بہت ہی ضروری ہے اس لیے کہ کسی بھی کام کو اگر اس کے اصول وضابطہ سے کیا جائے تو وہ کار آمد ثابت ہوتا ہے، ورنہ نفع تو درکنار نقصان ضرور ہاتھ آتا ہے۔ فرض کیجیے! آپ کے پاس وقت بھی ہے، کتابیں بھی اچھی ہیں، لیکن ذہن پریشان، آنکھوں میں درد اور روشنی بھی مدہم تو آپ مطالعہ نہیں کر سکتے، اگر اسی صورت حال میں مطالعہ کی کوشش کریں گے تو صحت پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لیے صحت کا خیال بھی بہت ضروری ہے، بطور خاص آنکھوں کا خیال۔ یہ بھی

قابل ذکر بات ہے کہ اس خیال سے مطالعہ کو ہرگز ترک نہیں کرنا چاہیے کہ یاد نہیں رہتا، بلکہ مطالعہ ضرور کرے، کہیں نہ کہیں اس کا فائدہ ضرور ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کہ مہندی میں سرخی پتھر پر بار بار گھسنے کے بعد ہی آتی ہے۔

مولانا عبدالسلام خاں لکھتے ہیں: مطالعہ جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی جلد محفوظ ہوگا اور تیز ہوگا، اس لیے کتب بینی کو سست روی یا یاد نہ رہنے کی وجہ سے ترک نہ کرنا چاہیے مطالعہ کے ساتھ ساتھ حاصل مطالعہ کو ذہن نشین کرنے کی تدبیر بھی ضروری ہے۔علم و معلومات کی مثال ایک شکار کی سی ہے۔لہٰذا اسے فوراً قابو میں کرنا چاہیے۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں: علم ایک شکار کی مانند ہے، کتابت کے ذریعے اسے قید کرلو۔ اس لیے مطالعہ کے دوران قلم کاپی لے کر خاص خاص باتوں کو نوٹ کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، ورنہ بعد میں ایک چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ نہیں ملتی ہے۔اب یا تو سرے سے بات ہی ذہن سے نکل جاتی ہے یا یاد تو رہتی ہے لیکن حوالہ دماغ سے غائب ہوجاتا ہے، ڈاکٹر عصمت جاوید کا کہنا ہے کہ: یادرکھنے کے قابل بات پر دوران مطالعہ اہم مقامات پر نشان لگانے اور کتاب کی پشت پر سادہ اوراق میں اہم نکات کو کاپی یا کسی کاغذ کے پرزے پر ہی نوٹ کرلیں۔

اسی طرح ڈاکٹر احمد سجاد کہتے ہیں: بعض صفحات کے نمبروں کو لکھنے کی عادت ہنوز قائم ہے۔مطالعہ کے معا بعد بعض کتابوں پر ذاتی تأثرات تبصرے بھی اختصار کے ساتھ لکھنے کی عادت ہے۔

حاصل مطالعہ کیسے ذہن نشین ہو؟

یہ بھی ایک اہم عنصر ہے۔اس سلسلے میں نعیم صدیقی رقم طراز ہیں: میری ذہنی ساخت یوں بنی کہ میں حاصل مطالعہ کو دماغ میں ڈال دیتا اور میرے اندر اس پر غور و بحث کا ایک سلسلہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھانا کھاتے جاری رہتا، یہاں تک کہ اس کا مثبت یا منفی اثر میرے عالم خیال پر رہ جاتا۔معلوم ہوا کہ مطالعہ کے بعد حاصل مطالعہ کی بھی بڑی اہمیت ہے، ورنہ تو بات لاحاصل ہی رہے گی۔مطالعہ کے دوران جہاں اچھی کتابوں، خوش گوار فضا،

مناسب مقام، موزوں روشنی اور وقت کی تنظیم ضروری ہے وہیں صحت کا بھی خاص خیال رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔(۱)

مطالعہ سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنے کے طریقے

۱۔ مطالعہ سے پہلے اس نیت کا استحضار کرے کہ وہ ثقافتی وعلمی طور پر مکمل ہوجائے اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرسکے اور اسلام کا پیغام پہونچا سکے اور اپنی قوم وملک کو فائدہ پہونچا سکے۔

۲۔ مطالعہ کے درمیان ذہن کو حاضر رکھے؛ تاکہ جو کچھ پڑھے اسے مکمل طور پر یاد رکھ سکے اور صحیح معنوں میں سمجھ سکے۔

۳۔ اہم عبارات اور بنیادی باتوں کے نیچے پنسل سے لکیر کھینچ دینا چاہئے، تاکہ جب اس بحث کو دوبارہ دیکھے تو یہ معانی اس کے ذہن میں راسخ ہوجائیں۔

۴۔ اساسی وبنیادی عنوانات کو پنسل سے صفحہ کے ایک کنارے پر لکھ دینا چاہئے؛ تاکہ ان مضامین کو اچھی طرح سے یاد رکھا جاسکے۔

۵۔ موضوع کے اہم عنوانات یا پسندیدہ ابحاث کو ڈائری میں الگ کتاب کے نام اور صفحہ نمبر کے ساتھ نوٹ کرلینا چاہئے، تاکہ دوبارہ ضرورت پڑے تو آسانی سے اصل مرجع کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

۶۔ ایک الگ کاپی یا رجسٹر رکھنا چاہئے؛ تاکہ احادیث مبارکہ، ادبی لطائف اور حکیمانہ اشعار نیز تاریخی واقعات، علمی حقائق، دینی مسائل وفتاوی میں سے جو چیز پڑھنے والے کو بھلی معلوم ہو اور وہ اس میں لکھ لے۔(۲)

غیر درسی کتابوں کا مطالعہ

۱۔ کتابیں بہت ہیں اور عمر محدود، نہ ہر کتاب اہم ہوتی، نہ ہر کتاب کا پورا مطالعہ

---

(۱) مطالعہ کیوں اور کیسے؟ مولوی فاروق اعظم عاجز قاسمی، ماہنامہ الفاروق کراچی، ۱۴۳۰

(۲) دینی اداروں اور جماعتوں کی ذمہ داریاں: ۱۹۷-۱۹۸

ضروری ہوتا، اس لئے انتخاب کر کے اہم کتابوں کا ہی مطالعہ کیجئے۔

۲۔ کتابوں کا انتخاب میں اپنے تعلیمی معیار کا لحاظ کیجئے، بہتر یہ ہے کہ اپنے اساتذہ اور بڑوں کے مشورہ سے انتخاب کیجئے۔

۳۔ بعض کتابوں کے صرف اہم حصہ کا ہی مطالعہ کیجئے، باقی کو چھوڑ دیجئے۔

۴۔ مشکل الفاظ کے لئے لغت کا سہارا لیجئے، بغیر معنی ومطلب سمجھے صرف عبارت خوانی بے فائدہ ہے۔

۵۔ ایسی کتاب یا مضمون کا مطالعہ کرنا۔ بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو یا وہ مفید ہو۔ نہ چھوڑ دیجئے جس کا اکثر حصہ سمجھ میں آتا ہو، کچھ نہ سمجھ میں آتا ہو۔

۶۔ ایک نوٹ بک بنائیے، مطالعہ کے دوران اہم باتیں، اہم جملے، اچھے اشعار جو نظر سے گذریں، اس نوٹ بک میں لکھ کر محفوظ کر لیجئے۔

۷۔ ایک کاپی پر حاصل مطالعہ بھی لکھ لیا کیجئے۔

۸۔ اہم مقامات پر قلم سے نشان لگائیں (بشرطیکہ اپنی ذاتی کتاب ہو)۔

۹۔ اخبارات کا ضرورت سے زیادہ مطالعہ نہ کیجئے، نہ ایک ایک خبر کو پڑھنے کی کوشش کیجئے۔

۱۰۔ بعض صورتوں میں باآواز مطالعہ، خاموش مطالعہ کے مقابلے میں، مضمون کو ذہن میں، مضمون کو ذہن میں جمانے کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

مطالعہ کے عام اصول

۱۔ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ مطالعہ کیجئے۔

۲۔ ایک جگہ جم کر مطالعہ کیجئے، نہ کہ ٹہل گھوم کر۔

۳۔ پورے دھیان اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کیجئے۔

۴۔ دیر تک مطالعہ کرنے کی عادت ڈالئے، جلدی سے گھبرا کر کتاب نہ رکھ دیجئے۔(۱)

---

(۱) طلبہ مدارس دینیہ کی رہنمائی، ۶۰، مولانا مفتی جمیل احمد نذیری، مکتبہ صداقت، نوادہ، مبارک پورہ، اعظم گڑھ

اکابر کا ذوق مطالعہ

اسی طرح حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحبؒ نے فرمایا:

’’طالب علم بغیر مطالعہ نہ پڑھے، کیوں کہ سبق بغیر مطالعہ کے پڑھنے سے پڑھتے وقت جب استاذ کچھ تقریر کرتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتی، اگر سمجھ بھی لے تو جلدی یاد نہیں ہوتی، اگر یاد بھی ہوجاتی ہے تو ٹھہرتی نہیں، اگر سبق کو مطالعہ کر کے پڑھے گا تو ان تمام آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

علمی کمالات کا اصل یہی ’’مطالعہ‘‘ ہے اور اسلاف کی سیرت میں یہ چیز نمایاں نظر آتی ہے، یہ ایسا ذوق ہے جس کو ہر کامیاب طالب علم اپنی زندگی کا نصب العین بنائے۔

- حضرت امام محمد رحمہ اللہ کے گھر میں ایک مرغ تھا جو وقت بے وقت بانگ دیا کرتا تھا، ایک روز آپ نے اسے ذبح کروا دیا اور ارشاد فرمایا:

  ’’یہ مرغا میرے لئے ناحق علم ومطالعہ کے شغل میں حارج بنا ہوا ہے‘‘(۱)

- حضرت حکیم ابونصر فارابی رحمہ اللہ زمانہ طالب علمی میں رات کو راستہ میں سپاہیوں کی قندیلوں تلے کھڑے ہوکر کتاب کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

- حضرت امام زہری رحمہ اللہ تعالیٰ کی بیوی نے کہا:

’’واللہ لہذہ الکتب أشد علی من ثلاث ضرائر‘‘ اللہ کی قسم! یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔

- قاضی عیاضؒ کی ’’ترتیب المدارک‘‘ میں امام عبدالملک رحمہ اللہ (ولادت ۱۷۴ھ وفات ۲۳۸ھ) کی سوانح میں آیا ہے۔

ان کے شاگرد ابوعمر یوسف بن یحی فرماتے ہیں کہ میں ایک دن عبدالملک بن حبیب سے کچھ حاصل کرنے کے لئے اندھیرے میں ان کے پاس گیا، میں نے حاضر ہونے

(۱) حدائق الحنفیۃ: ۳۵

کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اجازت دے دی، جب میں داخل ہوا تو وہ اپنی مجلس میں کتابیں دیکھ رہے تھے جو انہوں نے اپنے اردگرد جمع کر رکھی تھیں وہ ان پر نظر کر رہے تھے، شمع سامنے جل رہی تھی اور ان کے سر پر لمبی ٹوپی تھی۔

میں نے سلام کیا، انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: یوسف کیا رات نکل چکی ہے، میں نے کہا: ہاں! اور ہم تو نماز پڑھ چکے ہیں، وہ صبح نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، نماز پڑھ کر پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: یوسف میں نے صبح کی نماز ہمیشہ عشاء کے وضو سے پڑھی ہے۔

- حضرت خطیب بغدادی رحمہ اللہ راہ چلتے ہوئے بھی مطالعہ کرتے تھے، تاکہ آنے جانے کا وقت ضائع نہ ہو۔
- حضرت ابوالوفاء بن عقیل رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

  ’’میں کھانے کے وقت کو مختصر کرنے کی بہت کوشش کرتا ہوں، اکثر روٹی کے بجائے چورہ پانی میں بھگو کر استعمال کرتا ہوں، کیوں کہ روٹی اور چورہ کے استعمال میں کافی تفاوت ہے، روٹی کھانے میں کافی وقت لگتا ہے، جب کہ چورہ کے استعمال سے مطالعہ وغیرہ کے لئے نسبتا کافی وقت بچ جاتا ہے‘‘۔
- حضرت شیخ فتح بن خاقان رحمہ اللہ تعالی مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، جب کسی ضرورت سے خلیفہ متوکل کی مجلس سے اٹھتے تو راستہ چلتے ہوئے مطالعہ شروع کر دیتے، تاکہ آمد و رفت کا یہ وقت ضائع نہ ہو، اسی طرح جب خلیفہ متوکل کی مجلس سے اٹھتے تو فتح بن خاقان فورا کتاب نکال کر مصروف مطالعہ ہو جاتے۔(۱)
- حضرت ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنا حال بیان کرتے ہیں:

  ’’میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے

(۱) فہرست ابن ندیم: ۱۳۰

کسی طرح سیر نہیں ہوتی، جب کوئی نئ کتاب پر نظر پڑ جاتی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا، اگر میں یہ کہوں کہ میں نے طالب علمی میں بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو کچھ بعید نہ ہوگا، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات واخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوت حافظہ، ذوق عبادت، اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا جو ان کتابوں کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنے زمانے کے لوگوں کی سطح پست معلوم ہونے لگی، اور اس وقت کے طلبہ پر علم کی کم ہمتی منکشف ہوگئ'' (۱)

❁ حضرت امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ میں محنت اور جد وجہد کا یہ عالم تھا کہ کہتے ہیں کہ دو سال تک پہلو کے بل زمین پر نہیں سویا، بیٹھے بیٹھے ہی کچھ آرام کر لیتا اور پھر مطالعہ میں مشغول ہوجاتا، آپ زندگی کے مستعار لمحات کو تول تول کر خرچ کرتے، آتے جاتے بھی وقت بچاتے اور راہ چلتے مطالعہ کرتے۔ (۲)

حضرت امام نووی رحمہ اللہ تعالی دن رات میں صرف ایک بار کھانا کھاتے، پھر نہیں کھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''مجھے خوف رہتا ہے کہ پھلوں کے کھانے سے جسم میں رطوبت پیدا ہوجائے گی، اور پھر نیند کا غلبہ علم اور مطالعہ میں مخل ہوگا۔ (۳)

❁ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ بیمار ہوگئے، طبیب نے کہا: ''مطالعہ نہ کریں، اس سے صحت پر برا اثر پڑے گا'' فرمانے لگے: ''صحت پر اثر پڑے گا؟ لیکن اچھا آپ ہی بتادیں کہ جس کام میں طبیب کو راحت محسوس ہو کیا اس میں مشغول رہنے سے مرض میں افاقہ نہیں ہوتا''

---

(۱) صید الخاطر: ۳/۶، ۷

(۲) قیمۃ الزمن: ۴۳

(۳) تذکرۃ الحفاظ: ۴/۱۴۷۴

طبیب نے کہا: ”ضرور ہوتا ہے“ فرمانے لگے: ”بھائی! یہ مرض پھر ہمارے دائرہ علاج سے باہر ہے“۔

- قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ کو مطالعہ کا بہت شوق تھا، اور یہ شوق زمانہ طالب علمی ہی سے تھا، چنانچہ اس دور میں علاوہ کتب درسیہ کے ساڑھے تین سو خارجی کتابوں کا مطالعہ کیا۔

آپ کا علمی مقام اس قدر بلند تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ محدث دہلوی آپ کو بیہقی وقت فرماتے۔

- حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے کتب خانہ میں پندرہ ہزار کتابیں تھیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کا مطالعہ کیا تھا“۔

- حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکیوں میں بھی مطالعہ کرتے رہتے، کئی بار ایسا ہوا کہ دوران مطالعہ سامنے جلتے ہوئے چراغ سے آپ کا عمامہ جل گیا، لیکن آپ کو اس وقت اندازہ ہوا جب آگ عمامہ کو جلاتے جلاتے سر کے بالوں تک پہنچ گئی۔(۱)

- حضرت مفتی شفیعؒ صاحب نے ایک بار دار العلوم کراچی کے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: رات کو میری والدہ میرا انتظار کرتی تھیں کہ کھانا گرم کر کے دیں، ان کے انتظار میں مجھے تکلیف ہوتی تھی، بڑی منت سماجت سے اس پر راضی کیا کہ میرا کھانا ایک جگہ رکھ دیا کریں، سردیوں کی رات میں شوربہ اوپر سے بالکل جم جاتا اور نیچے صرف پانی رہ جاتا، میں وہی کھا کر سو جاتا۔(۲)

---

(۱) نزہۃ الخواطر: ۲۰/۵

(۲) البلاغ مفتی اعظم نمبر، بحوالہ نمونے کے انسان، مولانا اعجاز صاحب اعظمی: ۴۴، مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد، مئو، یوپی

❁ ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ کے مخصوص شاگرد و مرید مدرسہ عبد الرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبد العلی صاحب دار العلوم تشریف لائے، معزز مہمان اور دوسرے اساتذہ کرام کے ساتھ دار العلوم کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کھڑے تھے، قریب ہی سے والد صاحب بغل میں کتابیں دبائے گزرنے لگے تو مہتمم صاحب نے بلایا اور معزز مہمان سے فرمایا:

”یہ دار العلوم کا ایسا طالب علم ہے جسے اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں ہے، نہ اپنے کپڑے کی خبر ہے، نہ جان کی، کتاب کا کوئی سوال پوچھو تو محققانہ جواب دے گا“ (۱)

❁ ایک مرتبہ حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ سخت بیمار تھے، اور علالت طول پکڑ گئی، ایک دن صبح فجر کے وقت یہ افواہ اڑی کہ حضرت کا وصال ہو گیا، خدام پر بجلی گر گئی، اور نماز فجر کے بعد فوراً ہم سب حضرت کے مکان کی طرف لپکے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ بھی ساتھ میں تھے، گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ بحمد اللہ خبر غلط تھی، البتہ تکلیف کی شدت برقرار ہے، ہم سب لوگ عیادت کے لئے کمرے میں پہونچ تو دیکھا کہ حضرت نماز کی چوکی پر بیٹھے ہیں، سامنے تکیہ پر ایک کتاب رکھی ہے اور اندھیرے کی وجہ سے حضرت جھک کر مطالعہ کر رہے ہیں، خدام کو یہ منظر دیکھ کر حیرت کے ساتھ تشویش بھی ہوئی کہ ایسی حالت میں مطالعہ کے لئے اتنی محنت برداشت کرنا مرض میں مزید اضافے کا موجب ہوگا، چنانچہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ہمت کر کے ناز کے ساتھ عرض کیا کہ:

حضرت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کون سی بحث رہ گئی ہے، جو حضرت کے مطالعہ میں نہ آ چکی ہو؟ اور اگر بالفرض کوئی بحث ایسی ہو تو اس کی فوری ضرورت کیا پیش آ گئی کہ اسے چند روز مؤخر نہیں کیا جا سکتا؟ اور اگر بالفرض فوری ضرورت کا مسئلہ ہے تو ہم خدام کہاں مر گئے

(۱) البلاغ مفتی اعظم نمبر بحوالہ نمونے کے انسان: ۱/ ۴۴

ہیں، آپ کسی کو بھی حکم فرمادیتے، وہ مسئلہ دیکھ کر عرض کر دیتا، لیکن اس اندھیرے میں ایسے وقت آپ جو محنت ومشقت اٹھا رہے ہیں، وہ ہم خدام کے لئے نا قابل برداشت ہے''۔

اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ کچھ دیر تو انتہائی معصومیت اور بے چارگی کے انداز میں مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی طرف دیکھتے رہے، پھر فرمایا:

''بھائی ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ کتاب بھی تو ایک روگ ہے، اس روگ کا کیا کروں''؟ (۱)

❁ مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ:

حضرت شاہ صاحبؒ (علامہ انور شاہ کشمیری) کے فیض صحبت کی بنا پر ہم لوگوں کو بھی مطالعہ کتب کی ایک دھن سی لگ گئی تھی، فراغت کے بعد تقریباً ایک سال تو میں نے اس طرح گذارا کہ چند اسباق پڑھانے کے بعد کتب بینی کے سوا کوئی کام نہ تھا، دوپہر کو دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل ہوتا، ناظم کتب خانہ بعض اوقات باہر سے تالا لگا کر چلے جاتے اور میں اندر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ (۲)

فرماتے تھے کہ دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو میری نظر سے نہ گذری ہو، اگر کسی کتاب کو میں نے (مفتی شفیع صاحب) پورا نہیں پڑھا تو کم از کم اس کی ورق گردانی ضرور کی تھی، یہاں تک کہ تمام علوم وفنون کی الماریاں ختم ہو گئیں تو میں نے ان الماریوں کا رخ کیا جنہیں کبھی کوئی شخص ہاتھ نہیں لگاتا تھا، یہ اشتات (متفرقات) کی الماریاں تھیں، اور جن کتابوں کو کسی خاص علم وفن سے وابستہ کرنا ناظم کتب خانہ کو مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ ان الماریوں میں رکھ دی جاتی تھیں، ان کتابوں میں چونکہ موضوع کے لحاظ سے کوئی ترتیب نہ تھی، اس لئے اس جنگل میں داخل ہونا لوگ بے سود سمجھتے تھے کہ یہاں کوئی گوہر مطلوب حاصل کرنا ''تریاق از عراق'' سے کم نہ تھا، لیکن جب ساری الماری ختم ہو گئیں تو میں

---

(۱) نمونے کے انسان: ۱/ ۴۵

(۲) البلاغ مفتی اعظم نمبر، بحوالہ نمونے کے انسان: ۱/ ۴۸

نے اشتات کے اس جنگل کو بھی کھنگالا اور اس نتیجے میں ایسی ایسی کتابوں تک میری رسائی ہوئی جو گوشہ گمنامی میں ہونے کے باعث قابل استفادہ نہ رہی تھیں۔(۱)

- محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

  ’’میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں بیس روز میں ’’فتح الباری‘‘ کی تیرہ جلدیں مکمل دیکھ ڈالی تھی‘‘(۲)

- چنانچہ حضرت شاہ صاحب کے مطالعہ کے بارے میں آپ کے معروف ومشہور شاگرد محدث کبیر حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری ’’نفحۃ العنبر‘‘ میں لکھتے ہیں:

  ’’عام طور پر اکثر علماء اسی وقت کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، جب کسی خاص مسئلہ میں متعلقہ کتابوں کی طرف مراجعت کی ضرورت پڑ جائے، تاہم شیخ رحمہ اللہ تعالی کا طریقہ کار اس سے یکسر مختلف تھا، مطالعہ کے بارے میں ان کا یہ اصول تھا کہ جب کوئی کتاب ان کے ہاتھ لگ جاتی، چاہے وہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں ہو یا مطبوعہ، سقیم ہو، یا سلیم، کسی بھی علمی موضوع سے متعلق ہو، آپ وہ اٹھاتے اور اول تا آخر پوری کی پوری پڑھتے۔

آپ کی زندگی کی نہ جانے کتنی راتیں ایسی گذریں کہ ان میں پہلو بستر سے جدا رہا، راہ علم کا سامانِ سفر اسی وقت بنتا ہے جب منزل مطالعہ کی سختیاں برداشت کی جائیں اور یہ سختیاں اسی وقت سہی جاسکتی ہیں، جب طلب علم کا درد نصیب ہو، یہ زادراہ جب علم کے راہی کو ملتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:

’’سینے سے لگالو دیوانو! یہ درد بمشکل ملتا ہے‘‘

---

(۱) البلاغ مفتی اعظم نمبر: ۱/ ۴۸

(۲) نقش دوام: ۱۱۴

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''میں نے بخاری شریف کا مطالعہ بارہ بار کیا ہے''

مطالعہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ فرماتے، چنانچہ ابن ہمام کی ''شرح فتح القدیر'' جو آٹھ جلدوں اور ہزار ہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کا مطالعہ کل بیس روز میں آپ نے فرمایا:،مطالعہ کے دوران تلخیص بھی جاری رہتی، اسی طرح مسند احمد کے دوسو صفحے روزآنہ کے اوسط سے مطالعہ کیا۔(۱)

❀ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے علمی انہماک اور مطالعہ کی محنت کے متعلق لکھا ہے:

''دن رات کھانے ،سونے کے ساتھ گھنٹوں کے علاوہ تمام وقت ایسی حالت میں گزارتے کہ کتاب آنکھوں کے سامنے ہوتی ، مطالعہ میں آپ اس طرح محو رہتے کہ پاس رکھا ہوا کھانا، اگر کوئی اٹھا کر لے جاتا تو آپ کو خبر بھی نہ ہوتی، بسا اوقات کتاب دیکھتے دیکھتے سوجاتے اور رات کا کھانا یاد نہیں رہتا تھا''(۲)

❀ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کتب بینی اور مطالعہ سے اتنا شغف تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی سرہانے کتاب رکھی رہتی، فرماتے تھے کہ: میری بیماری کا علاج ہی مطالعہ وکتب بینی ہے۔

❀ حضرت مولانا ادریس احمد کاندھلوی رحمہ اللہ کا مطالعہ اور علمی انہماک بڑا مشہور ہے، طالب علمی میں قلب کے دورے کی شکایت ہوگئی، اکثر بے ہوش ہوجاتے، جوں ہی ہوش آتا تو دوبارہ مطالعہ میں مشغول ہوجاتے، آپ کے بارے میں حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''آپ کی صورت میں بھولا پن، سیرت میں معصومیت، اداؤں میں

(۱) نقش دوام (۲) تذکرۃ الرشید

ربودگی، گفتگو میں علم وتحقیق، مطالعہ کے اس قدر شوقین کے ہر وقت دار العلوم کے کتب خانے پر مسلط رہتے تھے''(۱)

❁ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ:

''اس ناکارہ کا معمول ۔۔۔ ۱۳۳۵ھ سے ایک وقت کھانے کا ہو گیا تھا، کہ رات کے کھانے میں مطالعہ کا بھی حرج ہوتا، نیند بھی جلد آتی تھی، پانی بھی زیادہ پیا جاتا تھا، ابتدائا میری ایک چھوٹی بہن کھانا لے کر اوپر میری کوٹھری میں پہنچ جاتی اور لقمہ بنا کر میرے منہ میں دیتی رہتی تھیں اور دیکھتی رہتی تھیں کہ جب منہ بند ہو جاتا تو دوسرا لقمہ دے دیا کرتی تھیں، اس ناکارہ کو التفات بھی نہ ہوتا تھا کہ کیا کھلایا، ایک دو سال بعد اس کو بھی بند کر دیا، اس زمانہ میں بھوک تو خوب لگتی مگر حرج کا اثر بھوک پر غالب تھا''(۲)

❁ حضرت علامہ بنوریؒ معارف السنن کی تصنیف میں اپنی محنت اور تلاش وجستجو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی طاقت وقوت، تخریج اور مآخذ کے مطلع ہونے پر پوری طرح صرف کی، ورق گردانی، متوقع اور غیر متوقع مقامات سے مسئلہ نکالنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، کبھی میں ایک مسئلہ کی تلاش میں گھڑیاں ہی نہیں؛ بلکہ کئی کئی راتیں اور دن گزارتا اور اس کے لئے ایک کتاب کی کئی مجلدات پڑھتا (یعنی مطالعہ کرتا) جب مجھے اپنی متاع گمشدہ مل جاتی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا''۔

بلکہ حضرت شیخ بنوریؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) نقش دوام: ۶۵

(۲) آپ بیتی: ۵/۱۰۸

''معارف السنن کی تصنیف کے سلسلے میں مجھے مختلف کتابوں کے تقریبا دو لاکھ صفحات پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا، ایک مرتبہ فرمایا کہ ڈابھیل کے قیام میں ایسا بھی ہوا کہ ایک ایک بات کی تحقیق کے لئے میں نے پانچ پانچ سو، ہزار ہزار، دودو ہزار صفحات کا مطالعہ کیا''

ایک مقام پر حضرت شیخ رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''کہ میں جب ہدایہ پڑھتا تھا تو ''فتح القدیر، البحر الرائق، اور ''بدائع الصنائع'' ان تینوں کتابوں کا دو سبق کے قریب مطالعہ کیا کرتا تھا، اور میرا مطالعہ ہمیشہ استاذ کے سبق سے آگے رہتا تھا، پھر ''مشکاۃ شریف'' کے سال ''بدایۃ المجتہد'' اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا مطالعہ کرتا تھا، اور ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمت نصیب ہوئی اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس مذاہب اربعہ کی کتابیں تھیں، چنانچہ میں '' کتاب الام'' فقہ شافعی '' المغنی'' فقہ حنبلی، اور ''المجموع شرح مہذب'' وغیرہ کا مطالعہ کیا''۔(۱)

- حضرت مفتی سعید احمد صاحب صدر مفتی مظاہر العلوم نے فرمایا کہ جلالین شریف میں بیس مرتبہ سے زیادہ پڑھا چکا ہوں، لیکن بغیر مطالعہ کے اب بھی نہیں پڑھاتا اور ہر بار مطالعہ میں ایک نیا لطف آتا ہے۔

کتابوں کا ادب واحترام

جن کتابوں سے علم حاصل کیا جاتا ہے، ان کا ادب بھی انتہائی ضروری ہے، بزرگان دین کا ارشاد ہے: ''جب تم علم حاصل کرو تو ان تین چیزوں کا خیال رکھو ورنہ علم کی منزل نہ پاسکوگے۔

جس طرح استاذ کا ادب واحترام ضروری ہے، اسی طرح کتابوں کا بھی ادب

(۱) کامیاب طالب علم: ۱۴۱، مولانا روح اللہ نقشبندی

واحترام ضروری ہے، ہمارے اسلاف کو کتابوں کا کس قدر احترام تھا، یہ واقعات ملاحظہ فرمائیں:

- شیخ الاسلام برہان الدین رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ایک صاحب کتاب کے اوپر دوات رکھنے کے عادی تھے، تو ہمارے شیخ نے فرمایا:
  ”تم اپنے علم سے ہرگز فائدہ نہ اٹھا سکو گے“
- ایک عالم نے اپنے دو طالب علموں کو دو حال میں پایا، ایک تکیہ کا سہارا لئے مطالعہ کر رہا تھا، اور دوسرا دو زانوں مستعد بیٹھا کتاب دیکھنے میں مشغول تھا، اور کچھ لکھا بھی جاتا تھا، جوہر شناس استاذ یہ ماجرا دیکھ کر اول کی نسبت فرمایا:

  ”إنه لا يبلغ درجة الفضل“

  یہ فضیلت کے کسی درجہ کو نہیں پہنچے گا۔

  اور دوسرے کے بابت فرمایا:

  ”سيحصل الفضل ويكون له شأن في العلم“

  یہ عنقریب فضل حاصل کرے گا اور اس کے لئے علم میں ایک بڑی شان ہوگی۔
- حضرت یوسف بن حسین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ادب سے علم سمجھ میں آتا ہے اور علم سے عمل کی تصحیح ہوتی ہے، اور عمل سے حکمت حاصل ہوتی ہے۔
- شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ تعالی کا یہ عالم تھا کہ باوجود ریاحی امراض میں مبتلا ہونے کے بغیر وضو کے کتاب نہ اٹھاتے تھے، ایک بار مطالعہ کے دوران ان کو تقریبا سترہ بار وضو کرنا پڑا۔
- مزید فرماتے ہیں کہ ہم کو جو علم حاصل ہوا، اس میں علم کی عظمت کو بڑا دخل ہے، میرا یہ حال تھا کہ کبھی کسی کتاب کو بلا وضو نہیں چھوتا تھا۔
- مولانا احمد علی سہارنپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ جو بعض طلباء بائیں ہاتھ میں دینی کتابیں اور دائیں ہاتھ میں جوتے لے کر چلتے ہیں بہت مذموم ہے، کیوں کہ یہ

خلاف ادب ہے اور صورۃ جو کتابوں کو فوقیت دینا ہے کتب دینیہ پر۔

❁ ایک مرتبہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے ایک صاحب سے فرمایا:
"کتاب وہاں رکھو"

ان صاحب نے وہ کتاب قرآن حکیم کے اوپر رکھ دی، حضرت نے فرمایا: "نہیں نہیں! ایسا نہ کرو قرآن سب سے اوپر رکھو، اس کے نیچے وہ حدیث کی کتاب رکھو اور پھر یہ کتاب رکھو۔(۱)

❁ حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: جب مدینہ منورہ میں حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دوران گفتگو فرمایا:

"دیوبند میں ایک مرتبہ میں لیٹے ہوئے کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحب قدس سرہ میرے (مولانا بدر عالم صاحب کے) کمرہ کے سامنے سے گذرے مجھے دیکھ کر نہایت غصہ کا اظہار کیا اور ناراض ہوئے بس صرف اتنا فرمایا: "میں نے عمر بھر بغیر تپائی کے کتاب نہیں رکھی"۔

آخری ایام مرض میں حضرت شاہ صاحبؒ سامنے رومال بچھا کر کتاب رکھتے تھے۔

کتابوں کا ادب واحترام پر اور چند ضروری ہدایات

۱۔ کتابوں پر کچھ تحریر نہ کریں، ہاں ضرورۃ نام لکھ سکتے ہیں۔
۲۔ دورانِ سبق کتابوں پر ٹیک نہ لگائیں۔
۳۔ کتابوں پر اسٹیکر وغیرہ لگانے سے گریز کریں
۴۔ کتابوں کی طرف ہرگز ہرگز پاؤں نہ پھیلائیں۔
۵۔ دائیں ہاتھ سے کتاب بائیں ہاتھ سے چپل اٹھائیں۔

---

(۱) خدام الدین: ۱۷

۶۔ کتابوں کی ترتیب کا خاص خیال رکھیں، مثلاً منطق ونحو اور دیگر کتابوں کو حدیث اصول فقہ، فقہ کے اوپر ان تمام کتابوں کو ترجمہ والے قرآن اور یہ تمام کتابیں اور ترجمہ والا قرآن، قرآن پر مت رکھیں۔

۷۔ کتاب ادب کے ساتھ اٹھائیں۔

۸۔ کتاب کسی کو دیں تو پھینک کر نہ دیں، یہ کتاب کی بے ادبی ہے۔

۹۔ طالب علم کسی کتاب کو بغیر طہارت کے نہ چھوئے۔

۱۰۔ کتابوں کے اوپر سے پھلانگنا سخت بے ادبی ہے۔

۱۱۔ اس طرح نہ بیٹھیں کہ آپ اونچی جگہ ہوں اور کتابیں نیچے ہوں۔

۱۲۔ تفسیر وحدیث یا کوئی دینی کتاب کھول کر فضول باتیں کرنے سے گریز کریں۔

۱۳۔ کتابوں کو فرش پر رکھنا جب کہ نیچے کوئی چیز نہ ہو بے ادبی ہے۔(۱)

حضرت افتخار الحسن کاندھلوی مدظلہ فرماتے ہیں:

فرمایا کہ آج جو علم سے محروی ہے ا، اس کا سبب کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ علم کا احترام نہیں رہا، جتنا علم اور اہل علم کا احترام ہوگا، اتنا ہی علم حاصل ہوگا، ہمارے استاذ محترم شاہ اسعد اللہ صاحب اگر کوئی چٹائی پر یا مصلی پر کتاب رکھ دیتا تو سخت ناراض ہوتے اور ڈانٹ دیتے تھے کہ یہ بے ادبی ہے، کتاب کی بے ادبی علم سے محرومی کا سبب ہے۔(۲)

---

(۱) کامیاب طالب علم: ۱۲۲، ۱۲۳

(۲) ارشادات افتخار الاولیاء، ابوعثمان محمد شعبان بستوی، ۱۲۸، مدرسہ اسلامیہ سلیمانیہ، عیدگاہ، کاندھلہ، ضلع شاملی

کتب کی اہمیت

کتاب کے ساتھ ہم مسلمانوں کو ایک خاص تعلق ہے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ پر جو پہلا اِرشادِ خداوندی اترا وہ یہی تھا کہ ’’پڑھ اور یہ اللہ تعالی کی نوازشات کی انتہا تھی کہ غارِ حرا کے اس نورانی لمحے نے حضور ﷺ کو علم کا شہر بنا دیا اور انہیں ایک عظیم کتاب کا حامل اور مبلغ قرار دیا۔ وہ کتاب جو سعادتوں اور برکتوں کا خزانہ ہے۔ گویا مسلمان دینی نقطۂ نظر سے اور وراثت کے اعتبار سے صاحبِ کتاب بھی ہے اور کتاب دوست بھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ماضی میں ہم مسلمان انفرادی طور پر مجموعی لحاظ سے عظیم کتب خانوں کے مالک رہے ہیں۔ کتب خانے کسی قوم کی علمی عظمت اور فکری بصیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اِس سلسلے میں ہم ایک شاندار تاریخ کے مالک ہیں۔ مخالف قوموں نے جب بھی مسلمانوں پر یلغار کی تو اس یلغار کی زد میں ہمارے جسم ہی نہیں آئے، ہمارے کتب خانے بھی آئے ہیں۔ تاتاریوں نے مسلمانوں کے سروں کے مینار بھی تعمیر کیے مگر اس کے ساتھ ہمارے قیمتی کتب خانوں کو دریاؤں میں غرق بھی کر دیا تا کہ مسلمان فکری، علمی اور ادبی لحاظ سے مفلس ہو کر رہ جائیں۔ اِس سلسلے میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کہتے ہیں؛

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

علامہ محمد اقبال بھی یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا علم آج مغرب میں پڑا ہوا ہے اور انہوں نے ان تحقیقات کو علم کے موتی کہا ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب اہلِ مغرب

اور ساری دنیا سے علم کی تلاش میں اشخاص عرب ممالک تشریف لاتے تھے، عربی زبان سیکھتے تھے، علم حاصل کرتے تھے اور پھر اپنے ملک جا کر اپنے لوگوں کو وہ علم سکھاتے ہیں اور آج ہمارا حال بھی انہیں جیسا ہے کیونکہ ہم پہلے ان کی زبان سیکھتے ہیں پھر ہم اپنے علم کو سمیٹتے ہیں۔

ہمارے مخالفین نے ہمیں یوں بھی لوٹا کہ وہ ہماری کتابوں کو یورپ کی لائبریریوں میں لے گئے اور وہ کتابیں جو ہمارے اسلاف کی تحقیقات کا نچوڑ تھیں اور ان سائنسی تحقیقات کی بنیادوں پر انہوں نے اپنی زمین کو آسمان بنا دیا اور ہم ان کی ترقی کو حیران کن نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ اہلِ مغرب کی سائنسی ترقی میں ہمارے اجداد کے خونِ جگر کی سرخی جھلکتی ہے۔ یہی بات علامہ اقبال بھی کہہ رہے ہیں۔

ایک اِنسان جب مصروفیاتِ زندگی سے اکتا جاتا ہے، زمانے کے غم جب اس پر چھا جاتے ہیں تو انسان زندگی کی ان تلخیوں سے بچنے کے لئے مختلف پناہیں ڈھونڈتا ہے، وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو کسی دوسری طرف مصروف کرتا ہے۔ کھیل تماشے میں لگ جاتا ہے، فلمیں دیکھ کر زندگی کے غم دور کرتا ہے اور بعض لوگ نشہ آور اشیا میں عافیت تلاش کرتے ہیں اور اپنا وقت اور اپنی جان گنوا دیتے ہیں جبکہ اللہ کے بندے ذکرِ حق میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا کہ ہم کھیل نہ کھیلیں۔ متوازن زندگی کے لئے کھیل ضروری ہے۔ لیکن فحش فلمیں، موسیقی وغیرہ اور نشہ آور اشیا کو استعمال کرنے والا وقتی سکون کے لئے ایک دائمی زہر اپنی رگوں میں اتار لیتا ہے، یہ تفریحات وقت کاٹنے کا ایک ذریعہ تو ہیں مگر اصلاح و تعمیر کا کوئی نقش نہیں۔ یوں وقت بھی ضائع ہوتا ہے، صحت بھی تباہ ہوتی ہے اور ایک ایسی لت پڑ جاتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے اور جس کا نتیجہ جسمانی اور فکری تباہی ہے۔

کتب خانے ذہنی تفریح کا ایک تعمیری ذریعہ ہوتے ہیں۔ انسان کتابوں کی دنیا میں صرف اپنی کلفتوں کو بھول جاتا ہے بلکہ اس کی سوچ میں وسعت بھی آ جاتی ہے، اس کا دامن علم کے ساتھ ساتھ فضیلت کے موتیوں سے بھر جاتا ہے کیونکہ اس کے اندر ایک شعور پیدا ہوتا ہے، تقویٰ کا۔ جس قوم کے افراد علم و فضل کی دولت سے بہرہ ور ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے اپنے باپ

دادا کی ان تصنیفات کو کتب خانوں میں محفوظ کر لیتے ہیں جن کو زمانے کی گردش سے خطرہ ہوتا ہے، ویسے بھی تاریخ انہی قوموں کا احترام کرتی ہے جو اپنے علمی سرمائے کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔

مہنگائی کے اِس دور میں نئی کتابیں خریدنا، اکثریت کے لئے مشکِل ہو گیا ہے، انسان کے لئے ذاتی لائبریری بنانا بھی روز بروز ناممکِن ہوتا جا رہا ہے، اِس اعتبار سے کتب خانوں کی اہمیت کہیں بڑھ جاتی ہے، انسان آسانی کے ساتھ جدید تصانیف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور پھر ایک انسان نہیں بلکہ سینکڑوں انسان، سالہا سال ان علمی سرچشموں سے اپنی فکری پیاس بجھا سکتے ہیں۔ گویا کتابوں کو سنبھالنا، ان کی حفاظت کرنا اور ان کو کتب خانوں میں محفوظ کرنا ایک بہترین صدقۂ جاریہ ہے۔ اِس لئے لوگ اپنے ذاتی کتب خانوں کو قومی سطح کے کتب خانوں میں بطور عطیہ منتقِل کرتے ہیں تاکہ ان کی موت کے بعد یہ کتابیں اپنا نور بِکھیرتی اور فِکر و خیال کی راہوں کو اجاگر رہیں۔ جب ہم کسی لائبریری سے کوئی کتاب لاتے ہیں تو ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ کتاب خراب نہ ہو اور محفوظ رہے کیونکہ وہ ذاتی ملکیت نہیں لیکن ایسا نہیں کہ ذاتی کتب کی حفاظت بھی نہ کی جائے بلکہ ان کو بھی سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کتاب کی مستقبل میں ضرورت پڑے یا کسی دوست احباب کو ضرورت ہو۔ لائبریری سے لائی گئی کتاب ایک امانت کی مانند ہے، یہ ایک قومی دولت ہے اور اِس پر ہر ایک کا حق ہے۔ بعض لوگ لائبریری سے نادر کتابیں لے کر ان کی قیمت جمع کرا دیتے ہیں، یہ قومی نوعیت کا ایک سنگین جرم ہے۔ روپے تو مل جاتے ہیں مگر وہ نایاب کتابیں نہیں ملتیں۔ نتیجہ معلوم کہ ایک دنیا ان کے فیض سے محروم ہو جاتی ہے، جس طرح کتب خانوں کا قیام ایک کارِ ثواب ہے اِسی طرح وہاں سے کتابوں کو اڑانا، ایک جرم ہے۔

ہر انسان کی اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا ذوق ہوتا ہے۔ بعض تاریخی کتابیں پسند کرتے ہیں۔ بعض ادبی، بعض سیاسی ادب کا شوق رکھتے ہیں۔ بعض دینی کتابوں کا شوق رکھتے ہیں۔ ایک کتب خانے میں مختلف موضوعات سے متعلق کتابیں ہوتی ہیں اور اس علمی ذخیرے میں رنگا رنگی ہوتی ہے۔ ایک موضوع پر بہت سی کتابیں مل جاتی ہیں اور انسان بیک

وقت ایک موضوع پر ہر قسم کے خیالات سے استفادہ کرسکتا ہے۔

کتابیں بہترین رفیق ہیں۔ انسان انسان کو فریب دیتا ہے مگر کتاب کبھی دھوکا نہیں دیتی۔ کتاب کا ایک ایک ورق واضح، کھلا اور سچا ہوتا ہے۔ کتاب زندگی کی تلخیوں میں حلاوت پیدا کرتی ہے اِس سے وقت بہلتا، احساس سنورتا، فکر نکھرتا، اور ذوق شگفتہ ہوتا ہے۔ مگر یہ انہیں مہذب کتابوں سے ہی حاصل ہوسکتا ہے نہ کہ وہ کتابیں جو فحاشی کو فروغ دیں جن میں غزلیات زیرِ فہرست ہیں۔ کتاب ایک بہترین ناصح، ایک شفیق دوست اور ایک معتبر رہنما ہے۔ کتاب علم کے نور اور قلم کی عظمت کا ایک خوبصورت اظہار ہے اور جو لوگ علم اور قلم کے اِس سرچشمے سے خود کو وابستہ کر لیتے ہیں وہ کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔ الغرض کتب خانے ایک قومی ضرورت ہیں، تنہائی کی نعمت ہیں، ادب اور فن کے خزانے ہیں، علم کا ایک سمندر ہیں کہ موجیں مار رہا ہوتا ہے اور ہر ایک کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور اپنے ظرف کے مطابق اپنی پیاس بجھاتا چلا جائے۔

کتب خانوں کی تاریخ

اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسان کی تہذیب ہے۔ تہذیب کے آغاز سے ہی انسان نے ہر دور میں حاصل ہونے والے علم کا ریکارڈ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کتب خانوں کی تاریخ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انسان کے پاس لکھنے کے لئے کاغذ قلم نہ تھا اور وہ مٹی کی تختیوں، چمڑے اور ہڈیوں پر تحریر کو محفوظ کرتا تھا۔ آج ہم لائبریری کی تاریخ کے اس عہد میں سانس لے رہے ہیں جہاں بات مائیکروفلم سے بھی آگے جا چکی ہے۔ آج کمپیوٹر کا دور ہے اور ڈیجیٹل لائبریریوں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ آشور بنی پال، سکندریہ کا کتب خانہ، عیسائیوں، ایرانی، ساسانی، یونانی، رومی کتب خانے، عربوں کے کتب خانے یورپ اور برصغیر کے حکمرانوں کے کتب خانے بہت مشہور ہیں۔

قدیم دور کے کتب خانوں میں آشور بنی پال، کتب خانہ سکندریہ اور کتب خانہ پرگامم قابل ذکر ہیں۔ سرزمین عراق کی تہذیب میسوپوٹیمائی کہلاتی ہے۔ وادی میسوپوٹیما کے مختلف شہروں کے کھنڈرات سے اس امر کی کافی شہادتیں ملی ہیں کہ وہاں پر سرکاری، مذہبی

اورنجی کتب خانے موجود تھے۔کلدانی میں سارگن بادشاہ نے ایک کتب خانہ قائم کیا جسے دنیا کا قدیم ترین کتب خانہ قرار دیا جاتا ہے۔آشوریوں نے 200ق،م سے 500ق،م تک شاندار کتب خانے قائم کئے،آشوری عہد کا سب سے اہم کتب خانہ شاہی کتب خانہ تھا جسے سارگن دوم نے 705 میں قائم کیا۔آشور بانی پال نے اپنے دادا سارگن دوم کے قائم کردہ کتب خانے کو اپنے دارالخلافہ منتقل کر کے اسے اپنے نام سے موسوم کر دیا۔آشور بنی پال کے کتب خانے میں 2لاکھ 30ہزار مٹی کی تختیاں تھیں اور اس کتب خانے کو پہلا عوامی کتب خانہ بھی کہا جاتا ہے۔دنیا کا پہلا منظم کتب خانہ سکندریہ تھا اور اس میں منہ مانگی قیمت پر کتب خرید کر رکھی جاتی تھیں اس میں رکھے گئے مواد کو مضامین کے اعتبار سے رکھا جاتا تھا۔اس کا قیام 323ق۔م میں مصر میں عمل میں آیا اور اس میں ذخیرہ کتب 9لاکھ تھا۔اس کی تعمیر و قیام میں بطیموس دوم نے اہم کردار سرانجام دیا تھا۔یونانی کتب خانوں میں کتب خانہ ارسطو، کتب خانہ افلاطون اور پرگامم کا کتب خانہ قدیم ترین ہیں۔افلاطون کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی ایک شاندار کتب خانہ موجود تھا جو اس کی وفات کے بعد کہاں گیا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے البتہ ارسطو کے کتب خانے کے حوالے سے تاریخی شواہد موجود ہیں۔یہ کتب خانہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا جو کہ ایک اندازے کے مطابق 4سو رولز پر مشتمل تھا۔نجی کتب خانوں کا بانی ارسطو کو کہا جاتا ہے۔ارسطو نے کتب خانوں کی تنظیم و ترتیب سائنسی بنیادوں پر رکھنا شروع کی تھی۔قدیم یونان کا دوسرا اہم ترین کتب خانہ پرگامم ہے جسے اتالوسی دوم نے 137 سے 159 تک قائم کیا۔پرگامم کا مواد پیپرس رولز اور پارجمنٹ پر مشتمل تھا اور یہ ذخیرہ دولاکھ کے لگ بھگ تھا۔یونانی کتب خانوں میں ادب، تاریخ، سائنس، ریاضی، فلسفہ، مذہبیات، سیاسیات اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر ذخیرہ کتب زیادہ تھا۔سرزمین روم میں عوامی کتب خانے، نجی کتب خانے اور مخصوص کتب خانے موجود تھے۔ 360 سے 370 تک روم میں 28 عوامی کتب خانے موجود تھے۔کتب خانہ پلینی، سسرو، اٹیکس، سانونیکس اور سیلوسی کالیکس روم کے مشہور کتب خانے ہیں، وم کے یہ

تمام کتب خانے 16 ویں صدی تک نیست و نابود ہو گئے۔ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند میں کتب خانے موجود تھے۔ جنہیں زیادہ تر مذہبی عمارتوں میں قائم کیا جاتا تھا۔ کتب خانہ نالندہ یونیورسٹی، وکرم سلا، جین لائبریری اور سرسوتی بھنڈار برصغیر کے قدیم کتب خانے ہیں۔ پرانے وقتوں کے عظیم کتب خانوں کی دو اہم خصوصیات علم دوستی اور حکمرانوں کی ذاتی دلچسپی اور ان کی ہیئت و تنظیم میں ہم آہنگی تھی۔

دینی مدارس اور کتب خانے

- طلبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے محور و مرکز کے طور پر سب سے اہم چیز لائبریری یا کتب خانہ ہے۔ اکثر دینی مدارس کی لائبریریاں تو صرف اساتذہ کی تدریسی ضروریات پورا کرتی ہیں اور انہیں اساتذہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان لائبریریوں کو وسعت دی جائے، ان میں وہ تمام کتب مہیا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جنھیں طلبہ اپنے مطالعے میں گہرائی پیدا کرنے کے لئے پڑھیں، اور ان میں ہم عصر زندگی کا فہم و ادراک پیدا ہو۔ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور جدید سماجی مسائل سے واقف ہوسکیں۔ وہ اعلی درجے کی علمی اور دینی کتب کے مطالعے کے ساتھ ہی ساتھ عمدہ اخلاقی ناول، سوانح، تاریخ، تذکرے، شاعری سفرنامے بھی پڑھ سکیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک جانب مدرسہ کی لائبریری مضبوط ہو تو دوسری جانب پبلک لائبریریوں میں دینی طلبہ کے لیے اجرائے کتب کو یقینی بنایا جائے۔ پبلک لائبریریوں کا منظم نظام انھیں مراجع کی تلاش، اور مختلف کتب سے استفادے کے طریق کار سے روشناس کرا سکتا ہے۔
- کتب خانہ میں درسیات اور ان سے متعلق شروحات اور درسی مضامین کے لئے معین کتابیں جمع کی جائیں۔
- وہ شروحات یا کتابیں جن کی ہر مدرس کو ضرورت پڑتی ہے ان کے کئی کئی نسخے ہونے چاہئے۔
- غیر درسی کتب میں جن کی مزاولت اور ضرورت زیادہ ہوتی ہے وہ پہلے خریدی جائیں، جن کی برسوں ضرورت نہیں ہوتی ان کی خریداری مؤخر کی جاسکتی ہے۔

- سالانہ بجٹ میں کتب خانہ کے لئے ایک رقم مخصوص کرلی جائے، جس سے ہر سال نئی کتابیں خریدی جاسکیں۔
- کتب خانہ کا ایک ناظم ہو اور ایک خادم ہو ہر کتاب اندراج کر کے ہی دی جایا کرے۔
- طلبہ و مدرسین خود سے کتابیں نہ نکالیں؛ بلکہ ناظم سے کتاب طلب کریں۔
- کتابیں فن وار رجسٹر میں درج کی جائیں اور ان کو فن نمبر دیا جائے، ان پر ''چٹ'' لگی ہو۔
- ایک جنرل رجسٹر ہو جس میں آنے والی کتاب درج کی جائے۔(۱)

ایک استاذ کے ساتھ کتب خانہ میں دو طلبہ معاون کی حیثیت سے ہونے چاہئے اور کتابیں سلیقے سے رکھنا، دینا واپس لینا، بائنڈنگ کرنا، نئی کتابیں منگانا وغیرہ تمام کام بحسن وخوبی انجام دیں۔

کتب خانہ کے امور

۱- کتب خانہ کی صفائی کی فکر کرنا۔
۲- تمام کتابوں پر سکہ مارنا خاص طور پر آنے والی کتابوں پر۔
۳- تمام کتابوں پر فنون وسیریل نمبر خاص طور پر دینا اور رجسٹر میں اندراج کرنا۔
۴- فن کے اعتبار سے کتابیں الماری میں رکھنا۔
۵- زائد جلدوں والی شروحات کو کتب خانوں سے منگانے کی فکر کرنا۔
۶- بوسیدہ کتابوں کی فکر کرنا۔
۷- کتابوں میں برابر دوا مارتے رہنا۔
۸- کتابوں کی جلد سازی کی فکر کرنا۔
۹- لمبے عرصے اور چھوٹے وقفہ کے لئے دی جانے والی کتابوں کا رجسٹر تیار رکھنا۔
۱۰- انجمن کے طلبہ کو کتابیں دینا اور وقت مقررہ پر کتابیں لینے کی فکر کرنا۔

(۱) مدارس دینیہ کے لئے رہنمایانہ اصول، ص:۲۰، مولانا سید ذوالفقار صاحب نقشبندی، شیخ الحدیث مدرسہ فلاح دارین، ترکیسر، صورت، گجرات۔

۱۱- طلبہ کو دی گئی کتابوں کی وقتاً فوقتاً جانچ کرتے رہنا۔

۱۲- استاذ یا طالب علم کو براہِ راست خود کتابیں دینا، درمیان میں واسطہ نہ بنانا۔

۱۳- کتب خانہ میں ضرورت سے زائد چیزیں نہ رکھنا۔

۱۴- تمام الماریوں کی چابیاں ایک جگہ باکس بنا کر رکھنا، خراب ہونے پر درست کرنے کی فکر کرنا۔

۱۵- کتابوں کا بِل جو آیا ہے کلرک کے پاس دینا اور بل کی ادائیگی کی فکر کرنا۔

۱۶- ضرورت کی کتابوں کو ذمہ داروں کے مشورہ سے منگوانا۔

۱۷- درسی وغیر درسی کتابیں وقت مقررہ پر وصول کرنا اور خراب ہونے پر مناسب قیمت وصول کرنا۔

۱۸- آئندہ سال ضرورت کی کتابوں کی فہرست تیار کر کے آغاز مدرسہ سے پہلے منگوانا۔

۱۹- صبح ۷:۳۰ سے ۸:۳۰ اور دوپہر میں ۳ سے ۵ تک اور عشاء کے بعد متصل آدھا گھنٹہ اور مغرب بعد ایک گھنٹہ کتب خانہ کو کھلا رکھنا۔

۲۰- کتابوں کی قیمت نہ وصول ہونے پر گھروں کو خطوط کے ذریعہ اطلاع دینا۔

۲۱- کتب خانہ سے متعلق اعلانات ذمہ دار کے ذریعہ طلبہ میں کروانا۔(۱)

❁ طلباء اور اساتذہ کو مطالعہ کے مواقع فراہم کرنے کے لئے معتد بہ کتابوں پر مشتمل وسیع کتب خانہ کا نظم ضرور کریں۔(۲)

نظام رسائل واخبار

طلبہ کا ایک دار المطالعہ ہو، جس میں ملک میں نکلنے والے دینی اصلاحی رسائل منگائے جائیں اور ہفت روزے اور روز ناموں سے معیاری اخبارات ورسائل جاری کرائے جائیں۔(۳)

---

(۱) معین المدارس: ۲۱۵ تا ۲۱۸، مفتی شاکر صاحب، بیت العلوم

(۲) تیرہ سالہ خدمات، صدیق اللہ چودھری: ۲۲

(۳) مدارس دینیہ کے لئے رہنما اصول: ۱۹، ۲۰، مولانا سید ذوالفقار احمد

دینی مدارس میں عربی رسائل واخبارات کے مطالعہ کا رجحان بالکل نہیں ہے، عربی کے جدید اسلوب، نئی تعبیرات اور عصری اصطلاحات سے واقفیت کے لئے اسلامی ذوق کے حامل معیاری اخبارات ومجلّات کا مطالعہ مناسب ہی نہیں ضروری ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اخبارات ورسائل سے کسی زبان کی تعبیر واظہارِ خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوتی ہے، وہ کسی اور چیز سے نہیں، عربی کے مشہور ادیب مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ اپنی تعلیم کے تذکرہ میں اخبارات ورسائل کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانۂ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سر بمہر تھے، عربی ادیب اپنے رسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں اور امیر شکیب ارسلان کے بقول ''عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا وہ اس عصر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے'' بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر واظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔(۱)

ارباب مدارس طلبہ کو بہت سے سہولتیں بہم پہنچاتے اور مختلف درسی امور کا انتظام تو کرتے ہی ہیں، مدرسہ کی لائبریری میں طلبہ کے لئے عربی رسائل ومجلّات کا بھی انتظام کریں تو کوئی مشکل نہیں، البتہ اس میں اتنی بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ طلبہ کے لئے مہیا کئے جانے والے رسائل واخبارات سنجیدہ، گہرے اور طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول کے حامل ہوں؛ تاکہ معنوی وذہنی حیثیت سے بھی ذوق ودماغ پر اچھا اثر پڑے، اس سلسلہ میں ''البعث الاسلامی''، ''الرائد''، ''الداعی''، ''الرابطة''، ''الدعوة''، ''المجتمع''، ''البلاغ'' اور ''المسلمون'' وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔(۲)

(۱) میری مطالعاتی زندگی: ۶۰، بحوالہ دینی مدارس کی ضرورت واہمیت: ۹۷، ابن الحسن العباسی

(۲) دینی مدارس کی ضرورت واہمیت: ۹۷، ۹۸ ابن الحسن العباسی

نظام امتحان

یہ کہنا تو آسان نہیں ہے کہ مدارس عربیہ میں امتحانات کا طریقہ عموماً مروج تھا، تاہم بعض مدارس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں طلباء کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا، چنانچہ بیجاپور کی تاریخ بستان السلاطین میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے کہ:

''امتحان بتاریخ سلخ ذی الحجہ می شد'' یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلباء کا امتحان ہوتا تھا۔

ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں امتحان سالانہ ہونے کی بھی تصریح ہے:

''ہر سال امتحان می شد''۔

مگر قیام دار العلوم کے قریبی زمانہ میں یہ رواج متروک ہو چکا تھا، اور مدارس عربیہ سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد اور محنت و جانفشانی کے اندازہ کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے، مروج نہیں تھا، طالب علم جب استاذ سے ایک کتاب پڑھ چکا تو اس سے مافوق دوسری کتاب بغیر امتحان لئے شروع کرادی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد کے جانچنے اور پرکھنے کا کوئی موقع نہ تھا، اور بسا اوقات نا قابل طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طئے کرتا چلا جاتا تھا، دار العلوم نے اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقے کو ختم کر کے سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ امتحان کو لازمی قرار دیا۔

دار العلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں وہ بھی کافی سخت ہیں، یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ نہیں ہے۔

ہندوستان کے مدارس میں غالباً بیجاپور ہی کی یہ خصوصیت تھی کہ وہاں سالانہ امتحان

ہوتا تھا ورنہ دوسرے مدارس کے متعلق تاریخ میں سالانہ امتحان کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے متصل زمانے میں ہندوستان میں سالانہ امتحان کا قطعا رواج نہ تھا۔

❁ امتحان یہ طلبہ کی تعلیمی استعداد اور اساتذہ کی محنت وجان فشانی کے اندازے کا معیار ہے، جس پر ترقی درجات کا انحصار ہے۔

❁ دارالعلوم دیوبند میں امتحان دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک امتحان داخلہ، یہ ان طلباء کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے مدرسہ سے آکر دارالعلوم میں داخل ہونا چاہیں، یہ امتحان عموما شوال میں ہوتا ہے، اس امتحان میں خاص سختی برتی جاتی ہے، اور بسا اوقات نصف سے زائد طلباء ایسے ہوتے ہیں جن کو امتحان داخلہ میں ناکام ہونے کے باعث واپس ہونا پڑتا ہے، دوسرا امتحان خواندگی ہوتا ہے، یہ سال میں تین مرتبہ لیا جاتا ہے، سہ ماہی ماہ صفر المظفر میں، ششماہی ماہ جمادی الاولی میں اور سالانہ رجب کے آخری ہفتہ سے شروع ہوکر شعبان کے عشرہ دوم میں ختم ہوتا ہے۔(ابھی فی الحال دارالعلوم میں درجات عالیہ میں صرف دو امتحان ششماہی اور سالانہ ہوتے ہیں)۔

❁ امتحانات میں انتہائی احتیاط اور سخت ترین نگرانی کی جاتی ہے، پہلے اور دوسرے سال کے تمام اور تیسرے سال کی چند کتابوں تک امتحان زبانی سوال وجواب کے ذریعے لیا جاتا ہے، اوپر کی جماعتوں کا امتحان تحریری ہوتا ہے، سوالات کے پرچے نہایت احتیاط اور رازداری کے ساتھ چھپوائے جاتے ہیں۔

❁ امتحان کے مفروضہ نمبر ۵۰ (اس وقت ۱۰۰ ہیں) درجات کی تفصیل یہ ہے کہ ۳۰ سے ۳۶ تک درجہ ادنی، ۳۷ سے ۴۳ تک درجہ متوسط، ۴۴، ۵۰ تک درجہ اعلی ہے۔(۱)

(۱) تاریخ دارالعلوم: ۲/ ۲۹۸

امتحانات کا نظام بہتر بنایا جائے

بہت سے مدارس میں امتحانات کو مطلوبہ اہمیت حاصل نہیں ہے، یہ نظام کی بڑی کمزوری ہے، ضرورت ہے کہ امتحانات، سنجیدگی اور باقاعدگی کے ساتھ ہوں اور سالانہ امتحان کے نتائج پر طلبہ کی ترقی وتنزل کا مدار بھی ہو، اچھے نمبرات والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

امتحانات کے ضمن میں یہ بھی عرض ہے کہ ابتدائی درجات میں ماہانہ جانچ کا نظام بھی بنایا جائے، اس سے بنیادی تعلیم کا معیار بہتر بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

طلبہ کو اسباق میں حاضری کا پابند بنایا جائے، غیر حاضری پر کاروائی ہو، سالانہ امتحان میں شرکت کو حاضری کی ایک مخصوص مقدار مثلاً پچھتر فیصد یا ستر فیصد کے ساتھ مشروط کیا جائے۔(۱)

امتحان کی تیاری کیسے کریں؟

بہت سے طلبہ امتحان کے صحیح طریق کار سے متعلق جستجو میں لگے رہتے ہیں کہ امتحان کیسے دیں؟ تاکہ ان بہت سی، امتحانی پریشانیوں سے بچا جاسکے، جن سے طلبہ کا سامنا ہوتا ہے۔ جیسے امتحانی ایام میں خوف کا طاری ہونا، بے چینی کا چھا جانا، عدم اعتمادی کا شکار ہونا، یہ ایسی چیزیں ہیں جو انسانی معلومات اور اس کے ذہن ودماغ کو متاثر کر دیتی ہیں، جب کہ امتحانی دنوں میں معلومات کا فقدان (جن کی طالب علم کو شدید ترین ضرورت ہوتی ہے) بہت بڑی محرومی ہے۔ اور یہی محرومی طالب علم کی ناکامی اور رسوائی کا سبب بن جاتی ہے۔

ایسے پریشان کن مراحل میں ایک طالب علم کو چاہیے (چاہے اس کی ذہنی سطح کتنی ہی بلند ہو) کہ تجربہ کار ماہرین تعلیم کی قیمتی نصائح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو نصب العین بنائے، خاص کر جب کہ وہ نصیحتیں امتحان سے متعلق بھی ہوں۔ تو یہ لیجیے چند نصیحتیں پیش خدمت ہیں۔

---

(۱) خطبہ صدارت کل ہند اجلاس عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند: ۶، حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب

امتحان کی رات

- طالب علم کو چاہیے کہ وہ امتحانی رات میں ذہنی وبدنی راحت حاصل کرے۔ تا کہ آئندہ کل کے جوابات پرسکون طریقے پر لکھ سکے، ماہرین تعلیم اور تجربہ کار مربی امتحانی دنوں میں طلبہ کو کچھ اس طرح تربیتی نصیحتیں کرتے ہیں، تا کہ طلبہ ان کا پورا لحاظ رکھیں اور امتحان کے ہر مضمون میں اعلی نمبرات سے کامیاب ہوں۔
- امتحانی رات میں مفید ومقوی غذا استعمال کرے اور ایسا کھانا کھانے سے پرہیز کرے، جو بدہضمی کا باعث بنے اور پھر وہ مشکلات پیدا کرے کہ طالب علم کی امتحانی رات پوری بے چینی اور بے قراری میں گذر جائے کہ جس سے امتحان بھی متاثر ہوجائے۔
- جلد سونے کی کوشش کرے، طویل مذاکرہ نہ کرے، اس لیے کہ امتحانی رات میں طویل مذاکرہ ذہن کو تھکا دیتا ہے۔
- بے چینی سے پورے طور پر بچے، اس لیے کہ بے چینی طالب علم کے اعضاء پر اثر انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ شک میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اور خوداعتمادی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور بسا اوقات یہی بے چینی اعصابی خوف کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ جس سے طالب علم کی قوتِ یادداشت متاثر ہوجاتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا علاج بس یہی ہے کہ اللہ تعالی کی ذات پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے خوداعتمادی کے ساتھ امتحان کی پوری تیاری کرے کہ یہی امتحان کی کنجی ہے۔
- نیندآور گولیوں سے احتیاط کرے کہ ان کی تاثیر نقصان دہ ہوتی ہے۔
- امتحان کے لائحہ عمل کی پوری پابندی کرے (کہ امتحان کس جگہ ہو رہا ہے اور کب؟)
- ادوات کتابت کی پوری تیاری رکھے جیسے قلم، فل اسکیپ، وغیرہ۔
- نیند سے بروقت بیداری کے لیے کوئی مناسب گھڑی استعمال کرے۔

❁ اس بات کی پوری کوشش ہو کہ طالب علم کم سے کم چھ گھنٹے آرام کر سکے۔

امتحان کا دن

❁ نیند سے جلد بیدار ہو جایا کرے، تاکہ غسل اور تبدیلی لباس سے اطمینان سے فارغ ہو سکے۔

❁ فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کی پوری فکر ہو۔

❁ ناشتہ اطمینان بخش کریں، تاکہ امتحانی اوقات میں کسی بھی طرح کی کمزوری کا احساس نہ ہو۔

❁ جس فن کا امتحان دینا ہے اس کے اشارات وحواشی کو اچھی طرح دیکھ لے۔

❁ امتحان گاہ وقت سے پہلے جانے کی عادت ہو، تاکہ راستہ کی کسی بھی وقتی پریشانی سے محفوظ رہ سکے۔

❁ جب گھر سے نکلیں تو دعا کا اہتمام کریں، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی گھر سے نکلے تو بِسْمِ اللهِ، تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ پڑھے، تو اللہ کی طرف سے اسے کہا جاتا ہے۔ کافی ہے تیرے لیے۔ تو صحیح راستہ دکھایا گیا اور تیرے لیے اللہ کی طرف سے کفایت ہوئی اور تو شیطان سے بچایا گیا اور شیطان تجھ سے دور کیا گیا۔(۱)

❁ امتحان گاہ جاتے وقت یہ دعا مانگے

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَيْكَ، وَسَلَّمْتُ أَمْرِیْ إِلَيْكَ، لَا مَنْجَأَ وَلَا مَلْجَأَ إِلَّا إِلَيْكَ"

❁ امتحان گاہ میں داخل ہوتے وقت یہ دعا مانگے

"رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَاخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيْرًا"

---

(۱) ترمذی

- سوالیہ پرچہ وصول کرتے وقت یہ دعا مانگے

"بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ لَا سَهْلَ إِلَّا مَا جَعَلْتَهُ سَهْلًا، وَأَنْتَ تَجْعَلُ الْحُزْنَ إِذَا شِئْتَ سَهْلًا"

- سوالات کو حل کرتے وقت یہ دعا مانگے

"رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ"

- اگر کوئی مشکل سوال درپیش ہو تو یہ دعا مانگے

(1) يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ ، بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ، (2) لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ، رَبِّ أَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ"

- اگر جواب تحریر کرنے کے دوران نسیان غالب آ جائے تو یہ دعا پڑھے

(1) "اَللّٰهُمَّ يَا جَامِعَ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ اجْمَعْ عَلَيَّ ضَالَّتِيْ"۔) (2 "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ عَلَيَّ فُتُوْحَ الْعَارِفِيْنَ بِحِكْمَتِكَ، وَانْشُرْ عَلَيَّ رَحْمَتَكَ، وَذَكِّرْنِيْ مَا نَسِيْتُ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ"

- جب پرچہ سے فارغ ہو جائے یہ دعا مانگے

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ"

- اپنی گھڑی اور ضروری امتحانی اشیاء اپنے ساتھ رکھے، جیسے قلم وغیرہ۔
- امتحانی سوالات کی کیفیت سے متعلق اپنے کسی بھی ساتھی سے نہ پوچھے، ہوسکتا ہے وہ تمہارے ذہن کو منتشر کردے اور ایسی جگہ کی نشاندہی کرے جس کو تم نہیں جانتے، جس سے تم خوداعتمادی کھوبیٹھو۔

امتحان میں کامیابی کا عمل

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ذہن کی درستگی کے لئے ہر نماز کے بعد ''یا علیم'' اکیس مرتبہ پڑھ لیا کریں (اور نیز امتحان میں کامیابی کے لئے) امتحان کے روز (یا علیم) کثرت سے پڑھو'' (۱)

درمیان امتحان

- امتحان گاہ میں اپنی نشست پر بالکل پرسکون اور مطمئن بیٹھیں۔
- جب جوابی پرچہ دیا جائے تو آغاز بسم اللہ سے کیجیے، پھر مطلوبہ جوابات کو تحریر کیجیے، پہلے ترتیب اور فن کی تعیین کیجیے۔
- سوالیہ پرچہ پر جو ہدایات لکھی ہوں ان کو اچھی طرح پڑھ لیں، پھر پورے سوالات پڑھ کر اچھی طرح سمجھ لیں۔
- آغاز آسان سوال سے کیجیے، اور پھر مشکل سوال پر نظر مرکوز کیجیے۔
- تمام سوالات کے لیے وقت کی مناسب تقسیم کیجیے، جب کہ تمام سوالات نمبرات کے اعتبار سے برابر ہوں۔ اور اگر کچھ سوالات مختلف نمبرات کے ہوں تو پہلے زیادہ نمبرات والے سوال کو زیادہ وقت دیجیے۔
- جب کسی سوال کے کئی عناصر ہوں اور درمیان تحریر ان میں سے کوئی ایک یا اس سے زیادہ بھول رہے ہوں تو اتنی جگہ چھوڑ دیجیے تا کہ یاد آنے پر ان عناصر کو لکھا جا سکے۔

موضوع سے متعلق اپنے جوابات صاف تحریر میں لکھیں، تا کہ جوابی پرچہ ہر طرح کی بے ترتیبی سے محفوظ رہے۔

- کوشش کیجیے کہ آپ جوابات امتحانی وقت ہی میں پورے کریں۔

---

(۱) مجالس مفتی اعظم: ۵۹۷، مفتی عبدالروف سکھروی، ادارۃ المعارف کراچی

❁ جوابی کاپی جمع کرنے سے پہلے خود جوابات کی مراجعت اوران پر نظر ثانی کرلیں، تاکہ آپ جلد بازی سے بچ جائیں۔

❁ اپنے اردگرد طلبہ سے مصروف نہ ہوں اور نہ ہی کسی کے اپنے سے زیادہ لکھنے پر کبیدہ خاطر ہوں۔(۱)

پرچہ لکھنے کے اصول وضوابط

پرچہ عربی میں حل کریں یا اردو میں اس کے لئے چند چیزیں ضروری ہیں:

۱) سوال کی عبارت کو ایک یا دو بار پوری توجہ سے پڑھیں، پھر اگر مطلوب ہو تو اس کو بااعراب کریں اور ترجمہ کریں۔

۲) اس کے بعد دیکھیں کہ سوال عبارت کا ماقبل سے تعلق ہے یا نہیں، اگر تعلق ہے تو ماقبل کے مضمون کو قدرے اختصار کے ساتھ بیان کر کے سوال کی عبارت کو حل کرنا شروع کریں، اور اگر سوال کی عبارت کا ماقبل کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تو اجتہادا سوال کی عبارت کو حل کریں۔

۳) سوال کی عبارت کبھی تو کسی سوال مقدر کا جواب ہوتی ہے اور کبھی کسی مضمون کو محیط ہوتی ہے، اگر سوال کی عبارت کسی سوالِ مقدر کا جواب ہے تو آپ پہلے سوال کی وضاحت کریں، پھر حسبِ بیان مصنف اس کا جواب تحریر کریں۔ مصنف کے بیان کردہ جواب کے علاوہ بھی اگر کوئی جواب آپ کے ذہن میں ہو تو یہ کہہ کر (اس کا ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے) اس کو بھی تحریر کریں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مصنف صرف سوال اور اعتراض کی عبارت کو ذکر کرتا ہے اور اس کا جواب ذکر نہیں کرتا تو ایسی صورت میں آپ حسبِ بیان مصنف سوال اور اعتراض کو لکھیں، پھر اپنی معلومات کے مطابق اس کے جوابات تحریر کریں۔

۴) بعض مرتبہ ممتحن کچھ زائد باتیں دریافت کرتا ہے تو ایسی صورت میں آپ کو یہ دیکھنا

(۱) امتحان کی تیاری کیسے کریں؟ محترم عبدالرحمن ملی، ماہنامہ الفاروق، جمادی الاولی: ۱۴۳۱ھ

ہوگا کہ ان میں سے کسی بات کا جواب حل سوال کے ذیل میں آچکا ہے، یا نہیں، اگر آچکا ہے تو آپ اس کی ابتداء میں لائن پر ایک خط کشید کردیں، دوبارہ اس کو لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر کسی بات کا جواب حل سوال کے ذیل میں نہ آیا ہو تو اس کو ضرور تحریر کریں۔

۵) بعض مرتبہ سوال میں مذکورہ عبارت سے بات پوری نہیں ہوتی؛ بلکہ عبارت کے اگلے حصہ میں جاکر پوری ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں طالب علم کو بات پوری ہی تحریر کرنی چاہیے، ادھوری نہیں رکھنی چاہیئے۔

۶) پرچہ اگر حدیث کا ہو تو اس کا حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ سوال میں مذکورہ حدیث یا احادیث کی ایسی تشریح فرمادیں جس سے پیغمبر رسول ﷺ کا منشا ظاہر ہوجائے اس کے بعد آپ حدیث سے عقائد یا احکام سے متعلق جو مسئلہ مستفاد ہو اس مسئلہ کی وضاحت کریں، اس مسئلہ میں اگر مجتہدین کا اختلاف ہو تو اس کو لکھیں، ہر ایک کے مذہب کی وضاحت کریں، ممکن ہو تو ہر ایک کے دلائل لکھیں، سوال میں مذکور حدیث اگر آپ کے مذہب کے خلاف ہو تو آپ اس حدیث کی توجیہ کریں، توجیہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ اس حدیث کی ایسی تشریح کریں جس سے وہ آپ کے مذہب کے خلاف نہ رہے، دوسری صورت یہ ہے کہ یہ حدیث اگر منسوخ ہو تو اس کا منسوخ ہونا ثابت کریں، تیسری صورت یہ ہے کہ اس حدیث کے علاوہ جو حدیث آپ کے مذہب کے موافق ہو اس کا راجح ہونا ثابت کریں۔

۷) عربی میں پرچہ کرتے وقت صلات، مراجع اور ضمائر کا خاص خیال رکھیں۔

۸) عربی کے الفاظ کا زیادہ استعمال کریں جو حواشی میں موجود ہوں۔(۱)

امتحانات میں دھوکہ دہی

آج کل امتحانات کے تعلق سے یہ عام ہوتا جارہا ہے کہ بچے بجائے اس کے کہ وہ

(۱) احقر جمیل احمد، مدرس دار العلوم دیوبند، رہنمائے عربی ۱۰۵، نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند

محنت اور کوشش کریں، نقل بازی کے ذریعے پاس ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اگرچہ وہ نقل بازی اور چیٹنگ کے ذریعے پاس ضرور ہوجاتے ہیں، لیکن یہ خود اپنے حق میں اور امت اور لوگوں کے حق میں دھوکہ دہی کے مماثل ہے۔

اور اس سلسلے میں نقل بازی کرنے والا اور اس سلسلے میں مدد کرنے والا دونوں گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اس نقل بازی کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ طلباء سال بھر محنت اور جدوجہد سے جی چراتے ہیں، بلکہ جو نقل بازی اور امتحان میں چیٹنگ سے کام نہیں لیتا اسکو سخت سست کہا جاتا ہے، اور اس طرح نا اہل لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے حدیث مبارکہ میں فرمایا: «من غش فلیس منا» (۱) (جو دھوکہ دہی سے کام لے وہ ہم میں سے نہیں) بلکہ اس نقل بازی کا سلسلہ اس قدر طویل اور لمبا ہوگیا ہے کہ خود اساتذہ اور نگران بھی اس سلسلے میں طلباء کی مدد کرتے ہیں، اور ان کو سوالات کے جوابات کی نشاندہی کرتے ہیں:

۱۔ اس دھوکہ دہی کی کئی ایک وجوہات ہیں، جن میں سے ضعف ایمان ہے، جو شخص نقل بازی سے کام لیتا ہے وہ دھوکہ دہی کے سلسلے میں اللہ عز وجل سے خوف نہیں کرتا، اسے اللہ کا استحضار نہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں خود والدین، اساتذہ اور نگران کاروں کی طرف سے صحیح تربیت کی عدم فراہمی کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے۔ والدین، اساتذہ اور نگران کار حضرات اگر بچوں کو دھوکہ دہی کے نقصانات اور اس کے عواقب وانجام سے آگاہ کرتے تو وہ اس قسم کی دھوکہ دہی میں مبتلا نہیں ہوتے، چونکہ جب یہ عالمیت فضیلت اور کسی بھی قسم کی ڈگریاں لے کر نکلیں گے تو صحیح محنت اور کوشش اس کے پیچھے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ڈگریاں تو ہوں گی؛ لیکن قوم وملت کو جس قسم کی صلاحیت درکار ہے وہ نہیں مل پائے گی۔

---

(۱) ترمذی: باب ماجاء فی کراہیۃ الغش فی البیوع، حدیث: ۱۳۱۵

۳۔ شیطان بھی طلباء کو یہ باور کراتا ہے، امتحان کے سوالات نہایت سخت ہوں گے؛ اس لئے لامحالہ نقل بازی سے کام لیں۔ جس وقت کو یہ امتحان میں نقل بازی کی منصوبہ بندی پر صرف کر رہے ہیں اگر اسے یہ اسباق کی نگرانی اور یاد کرنے میں صرف کرتے تو بذات خود امتحان لکھ کر کامیاب ہوتے۔

۴۔ ناکامی کا احساس بھی اس نقل بازی کے لئے مجبور کرتا ہے۔

نقل بازی کے نقصانات

۱۔ نقل بازی امت کی پسماندگی کی وجہ: اسی نقل بازی اور امتحان میں دھوکہ دہی کے ذریعہ کامیابی کی وجہ سے قوم ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہو پا رہی ہے، بڑی بڑی ڈگریاں دھوکہ دہی کے ذریعے حاصل کی جا رہی ہیں۔

۲۔ یہ نقل باز اور امتحان میں چوری کرنے والے معلم اور مدرس اور دیگر مناصب پر فائز ہوں گے، یہ خود بھی طلبہ کو یہی سبق سکھائیں گے، اس میں امت کا بے انتہا نقصان ہوگا۔

۳۔ اس نقل بازی میں دھوکہ دہی کے علاوہ دیگر گناہ اور بھی شامل ہیں، چوری، جھوٹ، اللہ کا عدم خوف، اخلاص اور توکل علی اللہ کی کیفیت سے عاری ہونا وغیرہ۔

۴۔ اس دھوکہ دہی کی بنیاد پر جو ڈگری حاصل ہوگی تو اس سے حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حرام ہوگی، اور جو جسم حرام سے پرورش پاتا ہے وہ جہنم کا زیادہ مستحق ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ والدین، اساتذہ اور نگران کار شروع ہی سے بچوں کو محنت اور جدوجہد کا عادی بنائیں اور اس نقل بازی کے نقصانات اور اس کے گناہوں سے بچوں کو آگاہ کریں۔

علوم شرعیہ میں نقل بازی

اگر علوم شرعیہ کے امتحانات میں نقل بازی سے کام لیں تو فقہ، حدیث وغیرہ جس کا مقصود تو صرف اللہ کی رضا ہے، اگر اس کو غیر اللہ کی رضا کے لئے حاصل کرے تو اس کا شمار اس حدیث کے موجب میں شامل ہوگا۔

"من تعلم علما مما يبتغى به وجه الله، ولا يتعلمه إلا لغرض من الدنيا زائل لم يرح رائحة الجنة" (۱)

اس کے علاوہ اللہ عزوجل کی نگاہ سے یہ شخص پوشیدہ اور محفوظ تو نہیں رہ سکتا جس کے بارے میں اللہ عزوجل نے فرمایا:

"يعلم خائنة الأعين وما تخفى الصدور"

آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے مخفی امور کو جانتا ہے۔

بہر حال امتحانات میں دھوکہ اور نقل بازی کی اجازت شرعاً نہیں دی جاسکتی ہے، چونکہ امتحان کا مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کی صلاحیت اور لیاقت کا اندازہ کیا جاسکے، پھر اس نقل بازی کی وجہ سے یا اس کی پشت پناہی کی وجہ سے سستی، کاہلی وغیرہ اور بچوں میں محنت سے جی چرانے کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۱) ابوداؤد: باب فی طلب العلم لغیر اللہ تعالی، حدیث: ۳۶۶۴

مصادر و مراجع

☆ دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل، امکانات، سلیم منصور خالد، انسٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، عالمی ادارہ فکر اسلامی، اسلام آباد

☆ مدارس اسلامیہ، اہمیت وضرورت اور مقاصد، حضرت سید مولانا ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی۔

☆ دینی مدارس کا نصاب ونظام، نقد ونظر کے آئینے میں، ابوعمار زاہد الراشدی، الشریعہ اکیڈمی (۱)

☆ تربیت الطالبین، فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی، جامعہ محمودیہ ہاپوڑ، میرٹھ

---

(۱) یہ کتاب ابوعمار زاہد الراشدی فرزند مولانا سرفراز خان صفدر صاحب شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ، پاکستان، کے مدارس کے نظام ونصاب، طریقہ کار کے تعلق لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں وہ خود فرماتے ہیں: ''دینی مدارس کا معاشرتی اور تعلیمی کردار آج دنیا میں زیر بحث آنے والا ایک اہم موضوع ہے اور مشرق ومغرب میں اس پر بحث ومباحثہ جاری ہے، دینی مدارس کو اس سلسلے میں دوطرفہ دباؤ کا سامنا ہے، ایک طرف یہ کہا جارہا ہے کہ دینی مدارس کے جداگانہ نظام کے سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہے، اور انہیں اپنا امتیاز وتشخص ختم کر کے عالمی اور قومی نظام تعلیم کے اجتماعی دھارے میں ضم ہوجانا چاہئے، جب کہ دوسرے طرف سے یہ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ عالمی اور قومی سیکولر نظام تعلیم کے مقابلے میں دینی مداس کا جداگانہ دینی تشخص اپنے طریق کار اور دائرہ عمل کے بہت سے پہلوؤں میں کچھ ایسی علمی کمزوریوں اور خامیوں کا شکار ہے، جنہیں اگر دور کرلیا جائے تو ان مدارس کے اسلامی تشخص میں مزید نکھار پیدا ہوسکتاہ، اور وہ آج کے عالمی سیکولر ماحول میں اسلامی تعلیمات کا پرچم زیادہ حوصلے اور اعتماد کے ساتھ بلند رکھ سکتے ہیں'' (دینی مدارس کا نصاب ونظام: ۸، شریعہ اکادیمی)

☆ دینی اداروں اور جماعتوں کی ذمہ داریاں، حضرت مولانا محمد قمر الزمان الہ آبادی، مکتبۃ دار المعارف، مکتبہ بزم قمر، نندوبار مہاراشٹر۔

☆ میرے والد میرے شیخ اوران کا مزاج و مذاق، مفتی تقی عثمانی، فرید بک ڈپو، دہلی۔

☆ مآثر حضرت باندوی، محمد عبید اللہ الاسعدی، فرید بک ڈپو، دہلی۔

☆ حیات اسعد، حضرت مولانا نسیم احمد غازی صاحب، فرید بک ڈپو۔

☆ مجالس مفتی اعظم، مفتی عبد الرؤف سکھروی، ادارۃ المعارف کراچی

☆ حیات خلیل، محمد ثانی حسنی، مظاہری، کتب خانہ یحیوی، مظاہر علوم سہارنپور

☆ نمونے کے انسان، مولانا اعجاز صاحب اعظمی، مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، مئو، یوپی

☆ ارشادات افتخار الاولیاء، ابو عثمان محمد شعبان بستوی، کتب خانہ یحیوی، متصل مظاہر العلوم سہارنپور، یوپی۔

☆ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ۲/۴۰=۴۱، مولانا مناظر احسن گیلانی، ندوۃ المصنفین دہلی۔، مکتبۃ الحق، ماڈرن ڈیری جوگیشوری، ممبیء۔

☆ دینی مدارس اور عصر حاضر، محمد رضوان القاسمی، مرکز دعوت و تحقیق، حیدرآباد، الہند۔

☆ تذکرے، مولانا محمد تقی عثمانی، فیصل دیوبند، دہلی۔

☆ تبصرے، حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ، دار السعادۃ سہارنپور

☆ مطالعہ کی اہمیت، مولانا روح اللہ نقشبندی صاحب، مکتبہ انیس دیوبند

☆ سوانح قاسمی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مکتبہ دار العلوم دیوبند

☆ انعام الباری، دروس بخاری شریف حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب، مکتبہ الحراء، کراچی۔

☆ تمرین النحو، مقدمۃ ابوالحسن علی الندویؒ، مجلس نشریات اسلام، کراچی

☆ مقدمہ معلم الانشاء، مولانا ابوالحسن علی الندویؒ مجلس نشریات اسلام، کراچی

☆ مجاہد ملت، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ، ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، فرید بک ڈپو، دہلی

☆ سحبان الہند، مولانا احمد سعید دہلویؒ، ایک سیاسی مطالعہ، ۱۰۲ تا ۲۰۵، فرید بک ڈپو، دہلی۔

☆ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل: ۱۱۴۔۱۳۸، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند۔

☆ مطالعہ حدیث کے اصول ومبادی: ۸۰ تا ۸۴، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، سید احمد شہید اکیڈمی، دارعرفات، رائے بریلی

☆ ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ کی تدریس مناہج اور طریقے: ۲۲۶، ایفا پبلیکیشنز

☆ خطبہ صدارت کل ہند اجلاس مجلس عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم۔

☆ طالب علم کیا نیت رکھے، حدیث پاک کی روشنی میں ، مولانا محمود اشرف عثمانی، ادارہ اسلامیات کراچی لاہور۔

☆ البلاغ کراچی، صفرالمظفر ،۱۴۳۹ھ۔

☆ شائقین عربی کے لئے تحفہ، عربی مضمون نگاری کیسے سیکھیں: ۱۲۔۲۱

☆ تحفۃ المدرسین یعنی مثالی استاذ بن کر آپ تدریس ایسے کریں، ادارۃ الرشید، کراچی

☆ اسلامی مدارس کا نصاب نظام ونصاب، حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب، مکتبۃ مسیح الامت، دیوبند، بنگلور۔

☆ دینی مدارس: مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، فضل بک سوپر مارکیٹ، کراچی (۱)

☆ الانتباہات المفیدہ عن الاشتبہات الجدیدۃ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مکتبہ امدادیہ اشرفیہ، نزد احمد غریب یونانی میڈیکل کالج، اکل کواں۔

---

(۱) دینی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے: اس کتاب کو فاضل مرتب پروفیسر ڈاکٹر حقانی میاں قادری نے مرتب کیا ہے، اس ضخیم کتاب میں مدارس کے ذوق کے مطابق جدید انداز سے دینی مدارس کے نصاب ونظام پر ہونے والے سمینار کی رپوٹیں، بحثیں اور مقالات شامل ہیں، اس کے مطالعہ سے دینی مدارس کے کار پردازان، علماء کرام، مہتمم حضرات اور تمام مسالک کے دینی مدارس کے بورڈ کے ذمہ داروں کے سامنے مختلف نقطہائے نظر سامنے آئیں گے، تو ان کو اپنے نصاب کی تشکیل وتدوین اور نظام تعلیم میں تبدیلی (اگر وہ چاہیں) تو مدد ومعاون ہوں گے۔

☆ مقالات فراہی نمبر: علامہ حمید الدین فراہی حیات وافکار، مرتبہ عبد اللہ فراہی، ناشر، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی:۲۰۱۶۔

☆ فکر نانوتوی اور دور حاضر میں اس کی معنویت: ۸، محمد ابوبکر قاسمی پورنوی معہد الامام ولی اللہ الدہلوی، للدراسات ال إسلامیۃ

☆ محفوظات حصہ دوم، مفتی سعید احمد پالن پوری

☆ طالب علم کیا نیت رکھے، حدیث پاک کی روشنی میں ، مولانا محمود اشرف عثمانی، ادارہ اسلامیات کراچی لاہور

☆ جمال یوسف، تدریس وتحقیق وعلوم ومعارف، علامہ محمد یوسف بنوری کا تذکرہ سوانح، مولانا عبد القیوم حقانی، القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرۃ۔

☆ عقائد اسلام، ادارہ اسلامیات، لاہور، کراچی، لاہور

☆ دار العلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ، محمد محمد اللہ صاحب، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند۔

☆ طلبہ مدارس دینیہ کی رہنمائی، ۰، مولانا مفتی جمیل احمد نذیری، مکتبہ صداقت، نوادہ، مبارک پورہ، اعظم گڑھ، یوپی۔

☆ دینی مدارس اہمیت وضرورت، ابن الحسن عباسی، مکتبہ طیبہ دیوبند

☆ محاضرات فقہ، ڈاکٹر محمود احمد غازی مکتبہ الحق، ماڈرن جوگیشوری، ممبئ

☆ محاضرات تعلیم، ڈاکٹر محمود صاحب غازی، ماڈرن جوگیشوری ممبئ (۱)

---

(۱) ڈاکٹر محمود احمد غازی کی محاضرات پر مشتمل اس سریز کی دوسری کتابیں محاضرات حدیث، محاضرات سیرت، محاضرات فقہ وغیرہ ہیں، یہ نہایت وقیع اور قیمتی کتب ہیں جو شریعت کے اہم گوشوں پر گفتگو کرتی ہیں، یہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے پروفیسر رہے ہیں، اسی طرح شریعۃ کورٹ کے پاکستان کے جج بھی رہے ہیں، یہ نہایت ذی علم اور پر حکم عالم دین ہیں، ان کا نسبی تعلق کاندھلہ کے ممتاز خاندان سے تھا، آپ کے والد محترم بزرگوں کے صحبت یافتہ، متدین ومتبع شریعت وسنت بزرگ تھے، انہوں نے درسش نظامی کی ابتدائی تعلیم جامعۃ الاسلام بنوری ٹاؤن کراچی سے حاصل کی، پھر آپ کے والد محترم اسلام آباد منتقل ہو گئے تو آپ نے لاہور جا کر جامع رشیدیہ اشرفیہ میں تعلیم حاصل کی، =

☆ مجالس مفتی اعظم، مولانا عبدالرؤوف سکھروی،، دارالمعارف کراچی

☆ امتحان کی تیاری کیسے کریں؟ محترم عبدالرحمن ملی، ماہنامہ الفاروق، جمادی الاولی:۱۴۳۱ھ

☆ رہنمائے خطابت: مفتی ابولبابہ شاہ منصور، السعید، پاکستان، کراچی

☆ خطبہ صدارت کل ہنداجلاس عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب

= جامعۃ دارالقرآن راجہ بازارراولپنڈی میں درس نظامی کی تکمیل کی اور شیخ القرآن حضرت اقدس مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ سے خصوصی طور پر شرف تلمذرہا، ڈاکٹر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مراحل طئے کئے، اعلی سندات حاصل کئے، لیکن جدید عصری فنون وافکار سے وافرآگاہی کے باوجود آپ میں تجدد یا کسی فکری زیغ کا کوئی شائبہ نہ تھا، ڈاکٹر صاحب نے قرآن وحدیث، سیرت، فقہ وقانون سازی، معیشت وتجارت اور دیگر علوم وفنون پر ۳۵ سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ (ڈاکٹر محمود احمد غازی، حیات وافکار، افادات:۲۷۶، مکتبۃ الحیات، کشمیر)